ملحدین کی اصلاح

وهو على كل شيء قدير

مؤلف

قاری ندیم ایاز حفظہ اللہ

مکتبہ دار الرحیل

فہارس

مقدمہ 4

ملحدین کیساتھ مکالمے کا طریقہ کار 8

سلسلہ تعلیمات غزالی۔۔۔۔۔مناظرے کا اصول 18

ملحدین کا علمی لیول-ملحدین کے ایک گروپ کیساتھ مکالمہ 19

خدا، قرآن اور سیرت کے موضوع پر ایک ملحد کیساتھ مکالمہ 33

کیا عقل کا بھی کوئی دائرہ ہوتا ہے؟ 52

ایمان، عقل اور سائنس 63

ایمان، عقل اور سائنس[2] 99

شرعی دلیل بیک وقت عقلی کیوں نہیں ہو سکتی؟ 124

عقل و نقل کے درمیان ٹکراؤ کا آغاز کیسے ہوا؟ 130

عقلی توجیہہ کو پیش آنے والے فریب 140

دینی احکامات کی عقلی حکمتوں کی بنیاد پر ردو قبول 153

دین، عقل اور جدیدیت 161

مذہب اور سائنس کے اختلاف کی بحث 166

مذہب اور سائنس کے اختلافات کا پس منظر 173

یہ حقیقت سے فرار نہیں ہو سکتا۔۔! 188

ٹیکنالوجی اور قیامت کی نشانیاں 191

خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق 195

خدااور کوئی کیوں نہیں ہو سکتا؟ 198

خداایک سے زائد کیوں نہیں ہو سکتے 204

کس مذہب کا خدامانیں؟ 211

الحاد تعریف، تاریخ اور ترویج 218

الحاد کیسے غیر فطری[[Unnatural ہے؟ 254

الہامی توازن: ڈیزائن شدہ کائنات 276

خدائی تعلق—دلیلِ انحصاری[[The Divine Link-The Argument from Dependency 315

اِخلاقیات کی غیر الہامی [سائنسی، تاریخی، فطرتی] بنیادوں کا داخلی محاکمہ 336

مسئلہ شر والم اور اسلام 350

پیغمبرانہ سچائی[[THE PROPHETIC TRUTH 372

نظریہ ارتقاء کو الحاد کی معقولیت کیلئے استعمال کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ 390

الحاد کو کس طرح ایک خاص قسم کا استثناء درکار ہے۔! 398

جدید فزکس الحاد کو کیوں رد کرتی ہے؟ 412

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم ہے کہ آج اس اہم موضوع پر یہ تالیف مکمل ہوگئی ہے۔ میرے ایک بڑے ہی دلعزیز دوست ایاز کی یہ خواہش تھی کہ میں الحاد کے متعلق کچھ لکھوں۔ چونکہ میری طبیعت ہے کہ خود کچھ لکھنے سے پہلے میں تلاش کرتا ہوں کہ کیا اس موضوع پر پہلے سے ہی اچھا مواد موجود ہے کہ نہیں اور اللہ کا شکر ہے اکثر بہترین تحریریں مل جاتی ہیں اس تالیف کے سلسلے میں بھی یہی ہوا اور میں نے مناسب سمجھا کہ ان تحریروں کو جمع کرکے ایک کتابی شکل دوں۔ اس سے پہلے بھی میں مختلف موضوعات پر تالیفات کرچکا ہوں الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو لوگوں کے لئے مفید بنادے اور ہم سب کے لئے صدقہ جاریہ بنادے۔ آمین۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے "ملحدین کی اصلاح" کے عنوان سے اہل علم کے کچھ موضوعات تلاش کرکے مرتب کردیئے یقیناپڑھنے والوں کواس سے بڑافائدہ ہوگا۔ ان شاءاللہ

یہ اس سلسلے میں چوتھی تالیف ہے بعد میں اور تالیفات کا اضافہ کیا جائیگا۔ آپ حضرات وخواتین ہم سے فیس بک پیج peaceofmind.na کے ذریعے رابطے میں رہیئے تاکہ نئی تالیف کے آنے پر بروقت مطلع ہوسکیں۔

مضامین نگار چونکہ بہت سے ہیں ضروری نہیں کہ ہم یا آپ ان سب سے یا انکی سب باتوں سے متفق ہوں جو بات دلیل کے مطابق ہوں وہ ہم قبول کریں گے مجموعی طور پہ اہل علم کی تحریروں میں خیر ہی غالب ہوتا ہے الحمدللہ۔

کتاب سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ فہرست پڑھیئے اور جو عنوان آپکو پسند آئے وہ مطالعہ کیجئے اور یقینا اس فہرست میں کافی دلچسپ عنوانات ہیں۔

آپ حضرات اپنا مشورہ دینا چاہیں تو بلا جھجک رابطہ کریں لیکن خیال رہے کہ صرف میسیج پر ہی غور کیا جائیگا فون پہ بات کرنا ممکن نہیں کیونکہ وقت کی شدید قلت کا سامنا ہے۔

نوٹ: اس تالیف سے مقصد کسی قسم کی دنیوی نفع بالکل نہیں ہے اور نہ ہی یہ برائے فروخت ہے بلکہ بالکل مفت فراہم کی جارہی ہے۔

میں آپ سب سے گزارش کرتا ہوں کہ اس کتاب کو پوری توجہ سے پڑھیں اور اسے مزید بہتر بنانے کے لئے ہمیں اپنی قیمتی رائے سے ضرور آگاہ کیجیئے۔شکریہ

قاری ندیم ایاز

25اگست 2021ء

مکتبہ دارالرحیل

www.peaceofmindna.com

peaceofmina.na facebook

00923172134743

whatsapp

ملحدین کیساتھ مکالمے کا طریقہ کار

ملحدین کے مذہبی رویے:

ملحدین سے مکالمہ کرتے وقت ان کے رویوں کے محرکات (motives of attitudes) کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اچھا دہریہ (good atheist) کے الفاظ فی زمانہ ایک اصطلاح کے طور معروف ہو رہے ہیں اور اس کے کئی ایک مفاہیم مراد لیے جاتے ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ اچھا دہریہ وہ ہے کہ جو خدا کو نہ ماننے کے باوجود کسی سماجی اخلاقی نظام کی پابندی کرتا ہو، وغیرہ۔

میں پہلے ان دہریوں کو بے وقوف سمجھتا تھا کہ جو خدا کہ بارے میں اپنے شکوک وشبہات کا اظہار بھی کرتے ہیں، مذہب بیزار بھی ہیں، لیکن ساتھ میں بات بات پر اللہ کا شکر (thanks God) جیسے الفاظ بھی کہہ دیتے ہیں، نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، انسانی رشتوں میں بھی اس حلت وحرمت کا دھیان کرنے والے ہیں کہ جو مذہب کی تعلیم ہے، شادی بیاہ اور نکاح وطلاق کے مسائل میں بھی معاشرتی مذہب پر عمل پیرا ہیں۔ ایک دفعہ میں ایک دہریے سے الجھ پڑا کہ مجھے بتلاؤ کہ پاکستان میں کوئی ایسا دہریہ ہے کہ جس نے مرنے سے

پہلے وصیت کی ہو کہ میری نماز جنازہ نہ پڑھانا؟ اس نے کہا نہیں، ایسا دہریہ میرے علم میں بھی کوئی نہیں ہے۔ (لیکن بعد میں ایک اور ملحد سے معلوم ہوا کہ نہیں، دو ایسے بھی ہو گزرے ہیں کہ جنھوں نے اپنی اولاد کو یہ تک وصیت کی تھی کہ ہماری لاش کو جلا دینا۔) لیکن اس کو آپ یہ نہ سمجھیں کہ ایک دہریے کو آخرت یا جنت اور جہنم کا یقین ہے یا یہ عمل اس کے خدا پر ایمان کی علامت ہے، بلکہ اس کو یوں سمجھیں کہ یہ سماجی اقدار (social values) ہیں کہ جن کا ہم خیال رکھتے ہیں۔

اس دہریے کا کہنا یہ تھا کہ اگر ہم یہ وصیت کر جائیں کہ ہماری نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے تو اس سے ہمارے رشتہ داروں کی دل آزاری ہو گی، لہٰذا ہم اس سے منع نہیں کرتے۔ اسی طرح "جزاک اللہ" یا "السلام علیکم" کے الفاظ ہم سماج اور رواج کی وجہ سے ادا کرتے ہیں اور رشتوں کی حرمت اور حلت کا مسئلہ بھی معاشرتی ہے۔ مذہبی حلال و حرام کی پرواہ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ معاشرے سے ہم آہنگ رہنا چاہتے ہیں اور معاشرہ چونکہ مذہبی ہے لہٰذا انہیں معاشرے کی مذہبی اخلاقیات کا دھیان کرنا پڑتا ہے۔ (ہماری نظر میں ملحدین کا یہ تجزیہ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملحدین انتہائی کوشش کے باوجود خدا کو اپنے اندر سے نکال نہیں پائے۔ مذہب اور خدا ہمارے لوگوں کے جینیات genes میں ہے۔ یہ اسے اپنے سے نکال باہر کرنے کی ہر کوشش میں بری طرح ناکام ہو گئے ہیں)

اس دن سے مجھے یہ بات سمجھ آئی کہ دہریت اور الحاد کچھ مذہبی شعائر یا مظاہر کا انکار کرنے کا ہی نام نہیں ہے بلکہ دہریت اور الحاد ایک سوچ اور ایک فکر ہے۔ اور اس فکر کے حاملین بہت سمجھداری سے کام کر رہے ہیں۔ کہ وہ ایک مسلمان کو نماز، روزے سے منع نہیں کرتے، مذہب پر عمل کرنے سے منع نہیں کرتے، بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ مذہب پر عمل کرو تا کہ معاشرے میں اجنبی نہ بن جاؤ، اچھے انسان کہلاؤ اور پھر ایک

دہریے کی سوچ کے ساتھ زندگی گزارو اور دہریت اور الحاد کی تبلیغ کرو۔(ڈاکٹر پرویز ھود بھائی ''ملا'' کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''ملا'' وہ نہیں ہے کہ جس کی لمبی داڑھی ہو، یا سر پر پگڑی ہو بلکہ '' ملائیت'' ایک فکر کا نام ہے۔یعنی انہیں ہمارے داڑھی کی لمبائی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے بلکہ ہماری سوچ سے ہے۔وہ ہمارا حلیہ تبدیل نہیں کرنا چاہتے، بلکہ ہماری سوچ کی تبدیلی ان کا ہدف ہے۔)

پاکستانی ملحدین سے بات چیت کے بعد ایک سنجیدہ شخص کا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مذاق((JOKE سے کم نہیں ہیں۔ان میں کچھ تو نوجوان ہیں جو اپنے دہریے((ATHEIST ہونے پر بڑا فخر کرتے ہیں اور ان کی زندگی کا کل مقصود یہ ہے کہ انہیں اپنے خیالات جیسی کوئی (FEMALE (ATHEIST مل جائے اور اس کے بعد کی کہانی واضح ہے۔ان میں بعض وہ ہیں جو اپنے آپ کو مفکر intellectual ثابت کرنے لیے ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ انہیں معاشرے میں اتنی توجہ نہیں مل سکتی جتنی کہ ان کی خواہش تھی۔اور بعض وہ ہیں جو نیوٹن کے حرکت کے تیسرے قانون کے عین مطابق مولوی کا ردِ عمل reaction ہیں۔اور بعض وہ ہیں کہ جنہیں بچپن میں گھر سے کم توجہ ملی اور اب انہیں خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ان میں سے اکثر وبیشتر مذہب اور مذہبی تعلیمات پر لعن طعن کر کے اپنے اندر کی گھٹن باہر نکالتے رہتے ہیں اور اگر زیادہ کسی نے علمی میدان میں کوئی بہت تیر مار لیا تو کسی انگریز ملحد کی کتاب کا اردو ترجمہ کر دیا اور اس فخر کے ساتھ جیسے اندھیروں میں علم کی مشعل روشن کر دی ہو، بھلے اردو میں لفظ مشعل کا صحیح تلفظ بھی معلوم نہ ہو۔

☆ملحدین کیساتھ مکالمے کا طریقہ کار

ملحدوں((ATHEISTS سے مکالمہ((DIALOGUE کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان کی حکمت عملی((STRATEGY سے واقف ہوا جائے۔اہم تر بات یہ ہے کہ سطحی ذہن کا ملحد ہمیشہ فروعات پر بحث کرنے کی کوشش کرے گا، اصولوں((principles پر نہیں۔ وہ اہلِ ایمان کو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شادیوں، تعدد ازدواج، نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر، لونڈی، غلام، حجاب، نقاب، جہاد، طالبان، داعش وغیرہ جیسے تصورات میں الجھانے کی کوشش کرے گا، اور اسے خدا اور مذہب کے انکار کی دلیل بنائے گا۔

ایسے ملحدوں کو فروعات کی بجائے پہلے اصولوں پر لانا چاہیے، مکالمے کے لیے پہلا موضوع ''خالق ہے یا نہیں ہے ''ہونا چاہیے۔ جب'' خالق کا ہونا''ثابت ہو جائے تو پھر ''مخلوق کی مقصدیت ''کو موضوع بحث بنانا چاہیے کہ خالق کی تخلیق بامقصد ہے یا نہیں؟ جب تخلیق کا بامقصد ہونا ثابت ہو جائے تو پھر ''مذہب کی ضرورت ''کو موضوع بحث بنایا جائے کہ مذہب، انسانوں کی بنیادی ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت ہے یا نہیں؟ جب'' مذہب کی ضرورت ''ثابت ہو جائے تو پھر صرف اسلام ہی کے تمام مذاہب میں مذہب برحق ہونے کو موضوع بحث بنایا جائے۔

جب خدا کا وجود اور مذہب کی ضرورت ثابت ہو جائے تو پھر رسالت کی ضرورت پر بحث کی جائے کہ اگر خدا ہے تو رسول ضروری ہیں یا نہیں؟ جب رسولوں کی ضرورت ثابت ہو جائے تو پھر محمدؐ کے رسول ہونے

پر بحث کی جائے کہ وہ اللہ کے سچے رسول ہیں یا نہیں؟ جب ان کا سچا رسول ہونا ثابت ہو جائے تو اب آپ کے لیے اس ملحد کو یہ سمجھانا مشکل نہیں ہے کہ محمد ﷺ نے اتنی شادیاں کیوں کیں؟

جب خدا، مذہب اور رسالت ثابت ہو جائیں تو اب آخرت اور جنت و جہنم پر بحث کی جائے۔ جب ان تمام اصولوں پر بحث ہو جائے تو اب فروعات کو زیر بحث لانے میں حرج نہیں ہے۔ جو لوگ اصولوں میں آپ سے متفق نہ ہوں تو ان سے فروعات میں بحث کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ اور یہ اس لیے بھی کہ بڑا ذہن ہمیشہ اصولوں پر بحث کرتا ہے نہ کہ فروعات پر۔ اصول درست ہوں تو فروعات بھی درست ہی ہوتی ہیں یا انہیں صرف درست توجیہ (reasoning and interpretation) کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اگر اصول ہی غلط ہوں تو پھر فروعات کبھی درست نہیں ہو سکتیں۔

اور الحاد کو زیر بحث لاتے ہوئے اس کے اصولوں کو ضرور موضوع بحث بنانا چاہیے۔ ملحد ہوشیار ہے، وہ آپ کے میدان پر ہی کھیلنا چاہتا ہے، آپ اس کے میدان پر بھی کھیلیں۔ یعنی ملحد کے خدا کو موضوع بحث بنائیں اور وہ قوانین فطرت (laws of nature) ہیں یا عدم (nothingness) ہے، وغیرہ۔ ملحد کی کوشش ہوگی کہ آپ سے اس بات پر مکالمہ کرے کہ اللہ موجود ہے یا نہیں؟ اور آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ملحد کے عقیدے کو موضوع بحث بنائیں کہ قوانین فطرت اس کائنات کے خالق ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اور الحاد کا اصل الاصول (prime principle) "نظریہ ارتقاء" ہے۔ ملحدوں کے پاس دلیل کی کل جمع پونجی نظریہ ارتقاء ہے۔ آپ اس نظریے پر بات کرنے کے لیے ملحد کو آمادہ کریں اور اس (سے جو نتائج ملحدین نکالتے ہیں) کو غلط ثابت کر دیں تو ملحد کے ایمان و یقین کی کل عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔

تحریر ڈاکٹر زبیر

رد الحاد کا 'غزالی' منہج

معتزلین وملحدین کے مفروضات کے رد کے لیے امام غزالی نے جو عمومی طرز استدلال اختیار کیا اسے ''داخلی تنقید'' (internal criticism) کا منہج کہا جاتا ہے۔ اسکے مد مقابل نقد کا دوسرا عمومی طریقہ ''خارجی تنقید'' (external criticism) کہلاتا ہے۔

خارجی تنقید کا مطلب ایک نظریئے کو کسی دوسرے نظریاتی فریم ورک کے معیارات سے جانچ کر رد کرنا ھوتا ہے۔ مثلاا گر ہم مغربی تصورات کو قرآن وسنت پر پرکھ کر رد کریں تو یہ خارجی نقد کہلائے گا۔

داخلی نقد کا مطلب کسی نظریئے کو خود اسکے اپنے طے کردہ پیمانوں پر جانچ کر رد کرنا ہوتا ہے۔ اس طریقے کے تحت چند طرح سے تنقید کی جاتی ہے: (i فریق مخالف کے مفروضات یا دعووں میں تضاد ثابت کرنا، (ii یہ ثابت کرنا کہ انکے طے شدہ مقدمات سے لازما انکے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ (iii مفروضات کی لغویت ثابت کرنا وغیرہ۔

چنانچہ امام نے تہافت الفلاسفہ (Incoherence of Philosophers) میں رد اعتزال و فلسفہ کیلئے داخلی نقد کا منہج بطور خاص ہتھیار استعمال کیا (امام سے پہلے اعتزال کے خلاف اسلامی دنیا میں اس طریقے کو اتنے منظم انداز سے کسی متکلم نے استعمال نہیں کیا تھا)۔ امام اس بات کی بطور خاص تاکید کرتے ہیں کہ الحادی مفروضات کو مذہبی پیمانوں پر جانچ کر رد کرنا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ مذہب اور الحاد کے علمی تناظر (مفروضات، مقاصد اور نتائج اخذ کرنے کے طریقہ کار) میں بنیادی نوعیت کا فرق ہوتا ہے، لہذا الحاد کو رد کرنے کا درست طریقہ اس پر داخلی تنقید کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ امام یہ خصوصی وضاحت فرماتے ہیں کہ جو لوگ مذہبی نصوص کو الحادی ڈسکورس رد کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف مذہب کا نہایت کمزور مقدمے کی بنا پر دفاع کرتے ہیں بلکہ الٹا اسے نقصان بھی پہنچاتے ہیں

☆ کس سے بحث کریں اور کس سے نہیں؟

امام ''ایہاالولد'' میں فرماتے ہیں: ''خوب جان لے (میرے بیٹے) کہ جاھل لوگ ایسے مریضوں کی مانند ھوتے ہیں جن کے دلوں میں خامی ھے اور عالم طبیبوں کی مانند ہیں.....لاعلاج بیماری کے علاج میں مشغول رھنا وقت کا ضیاع ھے۔اب تو سمجھ کہ جاہل مریض چار قسم کے ھوتے ہیں،ان میں سے ایک کا علاج ممکن ھے باقی تین لاعلاج ہیں۔

1۔پہلا وہ جو حسد کی وجہ سے سوال پوچھے یا اعتراض کرے۔حسد ایک ایسی مہلک بیماری ھے (بحث) جس کا علاج نہیں،تو جو بھی جواب دے گا خوہ وہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ھو لیکن وہ تجھے اپنا دشمن شمار کرے گا اور اسکی جلن اور حسد کی آگ مزید بھڑکے گی (لہذا وہ اسمیں نکتہ سازی جاری رکھے گا)۔اس کا مداوا یہ ھے کہ اس حاسد کو تو چھوڑ دے

2۔دوسرا مریض وہ ھے جسکی بیماری کا سبب اسکی حماقت یا بیوقوفی ھے۔جاہل احمق وہ ھے جو علم حاصل کرنے میں بہت کم وقت صرف کرتا ھے،نہ ہی علوم نقلیہ وعقلیہ کی ابھی ابتداء کی لیکن بڑے بڑے علماء پر اعتراض کرتا ھے.....اسے معلوم ہی نہیں کہ اسکا یہ اعتراض فضول ھے اور اس بڑے عالم کی علمی گہرائی کو اس نے سمجھا ہی نہیں۔تو جب وہ یہ سب سوچ ہی نہیں سکتا تو یہ اعتراض وسوال اسکی نادانی ھے۔ایسے شخص سے بھی الگ رھنا چاہئے اور اسے جواب نہیں دینا چاھئے۔

3۔تیسری قسم کا بیمار وہ ھے جو اپنی بے قراری وبے صبرے پن کی وجہ سے اہل علم کی باتیں نہ سمجھے اور اپنی کم عقلی پر بھروسہ کئے رھے۔ایسا شخص بھولا اور بے عقل ھوتا ھے اور اسکا ذھن حقائق کو سمجھنے سے قاصر

هوتا هے۔ اسے بھی جواب دینا ضروری نہیں (یہاں امام کا اشارہ غالبا علم کی دنیا کے مبتدی کی طرف هے، واللہ اعلم)

4۔ چوتھی قسم کا بیماروہ هے جو صراط مستقیم کا طلب گار هو، فرمانبردار اور ذکی هو، اسمیں غضب، نفس پرستی، حسد اور دولت کی جاہ نہ هو۔ پس جو راہ حق کا متلاشی هو اور سوال یا اعتراض حسد، عیب جوئی یا امتحان لینے کی غرض سے نہ کرے ایسا ہی شخص وہ مریض هے جسکا علاج کیا جاسکتا هے۔ چنانچہ اس شخص کے سوال کا جواب دینا نہ صرف جائز بلکہ واجب هے"

☆ایمان عقلی دلیلوں (کلام) میں محصور نہیں:

"جو شخص یہ گمان کرتا هے کہ ایمان کا ماخذ علم کلام، مجرد دلیلیں اور وہ منطقی تقسیمات ہیں جو علم کلام میں مرتب ہیں تو وہ شخص راہ راست سے دور هے۔ ایمان ایک ایسا نور هے کہ اللہ اس کو اپنے بندے کے دل میں بطور عطیہ اور هدیہ کے کبھی تو ایک ایسی باطنی تنبیہہ کے ذریعے القا کرتا هے کہ جسکی تعبیر ممکن نہیں، اور کبھی بذریعہ خواب کے دیکھنے کے اور کبھی کسی نیک آدمی کے حال کے مشاهدے اور اسکی صحبت کے ذریعے سے اسکی طرف نور ایمان کی سرایت هوتی هے اور کبھی قرینہ حال کے ذریعے..... اس امر کا انکار نہیں کہ متکلمین کی طرف سے عقلی دلیلوں کا ذکر کرنا بعض انسانوں کے حق میں ایمان کیلئے ایک سبب هے مگر ایمان کا حصول محض انہی ادلہ متکلمین پر موقوف نہیں۔ سب سے نفع آور کلام وہ هے جو طریقہ وعظ پر جاری هو جیسے کہ قرآن، مگر جو کلام طریقہ متکلمین پر تحریر کیا گیا هے وہ طریقہ وعظ نہیں بلکہ طریقہ جدال پر هے

تاکہ مخالفین اس سے عاجز آجائیں نہ اس لئے کہ وہ نفسہہ حق ھے۔اور بعض اوقات علم کلام عام آدمی کیلئے عناد قلبی کے استحکام کاذریعہ بن جاتا ھے اور یہی وجہ ھے کہ تو کبھی متکلمین یافقہاء کے مناظروں میں کسی شخص کواعتزال یابدعت سے تائب ھوتا نہیں دیکھتا......وہ ایمان جو کلامی دلیلوں سے حاصل ھوتا ھے ضعیف اور ہر نئے شبہ سے تزلزل کے کنارے پر واقع ھوتا ھے۔ایمان محکم وہ ھے جو عوام الناس کو زمانہ طفولیت میں تواتر سماع یابعداز بلوغ ایسے قرآئن سے حاصل ھوتا ھے جنکی تعبیر ممکن نہیں۔اور ایمان کا پورا پورا محکم ھونا عبادت اور ذکر الہی سے ھوتا ھے..... ور اسکی نشانی (بحوالہ حدیث) دار غرور سے کنارہ کشی اور دار خلود کی طرف مائل ھونا ھے''(التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ')

☆عقل، نبی ومابعدالطبعیات کا تعلق:

یہ بات واضح ہے کہ عقل مابعدالطبعیاتی حقائق کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی بھی حکم لگانے سے قاصر ہے، چاہے اثبات میں ہو یا نفی میں۔یعنی جس طرح خدا آخرت وغیرہ کو عقلی دلائل کی مدد سے قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں کیا جاسکتا اسی طرح عقلی دلائل سے انہیں رد بھی نہیں کیا جاسکتا۔اس میدان تک رسائی صرف ''وحی'' ہے۔ عقل نبی کے کردار و معجزات کی بنا پر نبی کی صداقت کی گواہی دیتی ہے، اسکے بعد نبی ان امور کے بارے میں جو کہتا چلا جاتا ہے اس پر مہر تصدیق ثبت کرتی چلی جاتی ہے۔۔۔یعنی نبی کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے نفس کے اندر ظنی عقلی شواہد کی بنا پر نبی کے بتائے ہوئے حقائق کی تصدیق کرتی ہے۔اس بات کو امام غزالی (رح) نے المستصفی میں کچھ یوں بیان کیا:

"عقل نبی کی صداقت کی طرف راھنمائی کرتی ہے، اسکے بعد الگ ہو کر بیٹھ جاتی ہے اور یہ اعتراف کرتی ہے کہ اللہ اور آخرت کے بارے میں نبی جو کچھ کہے گا اسے قبول ہے کیونکہ وہ از خود انکا ادراک کرنے سے قاصر ہے اور نہ ہی انکے محال ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ عقل اپنے طور پر اس کا ادراک نہیں کر سکتی کہ اطاعت آخرت میں سعادت کا باعث ہے اور گناہ شقاوت کا لیکن وہ اسکے خلاف حکم لگانے کی اہل بھی نہیں۔ البتہ معجزہ جس کی صداقت پر دلالت کرتا ہے اسے سچا ماننے کا فیصلہ دے سکتی ہے اور مخبر صادق جب ان امور کی خبر دے تو انکی تصدیق کرتی ہے

==

=====================================

سلسلہ تعلیمات غزالی۔۔۔۔۔ مناظرے کا اصول

"ایہاالولد" میں امام نصیحت فرماتے ہیں:

"اول یہ کہ جہاں تک ھو سکے کسی سے مناظرہ نہ کر کیونکہ اس میں بہت سی آفتیں ہیں اور فائدے سے زیادہ نقصان ھے۔ مناظرہ و بحث بازی کا یہ کام برے خصائص مثلا ریاکاری، حسد، غرور، کینہ، دشمنی، فخر اور ناز وغیرہ کا سرچشمہ ھے۔ اگر تیرے اور دوسرے شخص کے درمیان کوئی مسئلہ چھڑ جائے اور تیری خواھش ھو کہ حق ظاھر ھو تو اس مسئلے پر بحث کرنے میں تیری نیت کی درستگی کی دو علامات ہیں:

1) اگر حق تیری یا تیرے مخالف کی زبان سے ظاھر ھو تو تو اس میں کوئی فرق نہ کرے یعنی دونوں صورتوں میں راضی رھے کہ بہر حال حق ظاھر ھو گیا

2) تو تنہائی میں بحث کرنے کو ترجیح دے۔ اگر دوران بحث تجھے یقین ھو جائے کہ تو حق پر ھے اور مخالف صرف بحث بازی کر رھا ھے تو تو خبر دار ھو جا اور اس سے بحث نہ کر اور بات کو وہیں ختم کر دے (یعنی اپنے نفس کو آڑے نہ آنے دے کہ میں تو ابھی غالب ہی نہیں آیا) ورنہ خوا مخواہ رنجش پیدا ھو گی اور کوئی فائدہ نہ ھو گا''

ملحدین کا علمی لیول - ملحدین کے ایک گروپ کیساتھ مکالمہ

بحث کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ جناب عزازی ہاشم صاحب نے تقدیر کے مسئلے پر ایک سوال پیش کر دیا اور اس میں سوال کے ساتھ ایک مجہول اصطلاحات جیسے ''عربی خدا'' اور ''عربی اللہ'' کا استعمال کیا۔ چونکہ موصوف تقریباً اپنی ہر پوسٹ میں اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں اور وقت کی کمی کے باعث میں ہر پوسٹ پر تبصرہ نہیں کر سکتا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اس موقعے پر اس سلسلے میں ضرور بحث ہونی چاہئے۔

اس سے پہلے کہ بحث کی روداد پر مزید کوئی روشنی ڈالوں میں قارئین کے فائدے کے لئے کچھ علمی پوائنٹ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح نہ صرف اس بحث کو سمجھنے میں آسانی ہو گی بلکہ بحث کے دوران ملحدین کی چالوں کو بھی آسانی سمجھا جا سکے گا۔

مناظرے اور بحث کے دوران کچھ فریق چکمہ دے کر اپنے غلط مؤقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کچھ مغالطے استعمال کرتے ہیں جسے انگریزی میں Fallacies کہتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کے Fallacy کے لئے مناسب ترین اردو ترجمہ کیا ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ اس کے لئے ہم ''چکمہ بازی'' کا لفظ استعمال کر لیں۔ اس بحث کے دوران ملحدین نے ان چکموں کا خوب استعمال کیا بلکہ ان کی پوری بحث انہیں چکمہ بازیوں کا مجموعہ تھیں۔ میں نے بحث کے دوران ان کو خوب ایکسپوز کیا جس کے نتیجے میں آخر کار مجھے بلاک کرنا پڑا۔ اس نوٹ سے میرا مقصد یہ بات ثابت کرنا نہیں ہے کہ یہ لوگ اس مجھول اصطلاح کو استعمال کرنے میں غلط ہیں، وہ تو آپ کو تھریڈ سے ہی معلوم ہو جائے گا۔ یہاں پر مقصد ان ملحدوں کی جہالت، بد دیانتی اور کمزوریوں کو ایکسپوز کرنا ہے۔ چونکہ انہوں نے ایک تاثر قائم کیا ہوا ہے کہ الحاد کی بنیاد عقل اور علم پر ہے اور مذہبی لوگ بغیر سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق کے کسی بھی چیز پر ''ایمان'' لے آتے ہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ ان کی جہالت کو ایکسپوز کر دیا جائے۔

میں یہاں پر ان کی چکمہ بازیوں کی تفصیل بیان کر رہا ہوں۔ دراصل اس قسم کی چکمہ بازیوں کی تفصیل اور تشریح میں ملحد ہی زیادہ لکھتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی مذہب کا ماننے والا اس طرح کی چکمہ بازیوں کا مرتکب ہو تو اس پر گرفت کریں۔ لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ آج کل ملحدین خود اپنے علمیت کی گرفت میں آ رہے ہیں۔ ہمارے مسلمان بھائیوں کو بھی سوچنا چاہیئے کہ جب وہ کوئی آرگیومنٹ پیش کرتے ہیں تو کہیں وہ بھی اس طرح کی چکمہ بازیاں پیش نہ کر رہے ہوں۔

ا۔لوڈڈ سوال یعنی:Loaded Question

اس میں یہ ہوتا ہے کہ ایک فریق کسی سے سوال پوچھتے ہوئے اس سوال کے اندر ایک دعوی داخل کر دیتا ہے جب کہ اس دعوی پر ابھی دونوں فریق متفق نہ ہوئے ہوں۔ مثلاً اگر کسی کو یہ پوچھا جائے کہ آپ نے کب سے ایمانداری سے انکم ٹیکس دینا شروع کیا تو اس سوال میں یہ دعوی چھپا ہے کہ اس بندے نے کچھ دور میں ایمانداری کے ساتھ انکم ٹیکس نہیں دیا۔ اب بظاہر تو یہ سوال لگتا ہے۔ لیکن در حقیقت یہ سوال نہیں بلکہ ایک الزام ہے۔ ہاں اگر بحث کا سیاق وسباق ایسا ہو کہ سوال کرنے سے پہلے اس فریق نے اپنی بے ایمانی تسلیم کی ہوئی تھی اور یہ سوال مزید تحقیق کے لئے پوچھا جائے تو یہ لوڈڈ سوال نہیں ہے۔ لیکن اگر ابھی اس فریق نے ایسا کوئی الزام قبول نہیں کیا تو پھر یہ لوڈڈ سوال ہے۔

۲۔ریڈ ہیرنگ،:Red Herring

ایک اہم اور زیر بحث مسئلے کی طرف سے توجہ ہٹا کر قارئین یا سامعین کا دھیان کسی دوسرے طرف لے کر جانا جس کا زیر بحث مسئلے کی منطق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثلا آپ نبی ﷺ کی امانت اور دیانت پر بات کر رہے ہوں اور کوئی فوراً یہ کہیں کہ اس کے اخلاق کس طرح اچھے ہوں گے جو چھ سال لڑکی سے جنسی تعلقات قائم کرے۔ مسئلہ ہے کہ آپ کا حضرت عائشہ سے نکاح، اس وقت حضرت عائشہ کی عمر اور جس سیاق وسباق میں یہ نکاح ہوا، اس پر حضرت عائشہ کا رد عمل اور رویہ ایک قطعی الگ ہی قسم کی بحث کا متقاضی

ہے۔ لیکن کسی اور بحث کے دوران اس قسم کی ڈائلاگ بازی کرنے کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا کہ اصل مسئلے پر دلیل دینے کی ضرورت پڑے ہی نہیں۔

۳۔ سرکیولرلاجک، Circular Logic یا دائروی منطق۔

اگر آپ کسی مسیحی سے پوچھیں کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ بائبل خدا کی کتاب، وہ کہے کہ بائبل اس لئے خدا کی کتاب ہے کیوں کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے ہمیں یہی بتلایا ہے۔ اور آپ پوچھیں کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ عیسی علیہ السلام نے یہی بتلایا ہے تو وہ کہے کیوں کہ بائبل میں یہی لکھا ہوا ہے۔ یہ ایک بہت سادہ سی مثال ہے Circular logic کی۔ بحث میں بعض اوقات یہی چکمہ دیا جاتا ہے لیکن وہ بحثیں تھوڑی بہت کامپلیکس ہوتی ہے اس لئے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سیدھی سی بات یوں سمجھیں جب کوئی بحث کر کے ایک نتیجہ ثابت کرنا چاہتا ہے اور ثابت کرتے ہوئے وہ اس بحث کے نتیجے کو ہی بحث کے ثبوت کے طور پر پیش کرے تو یہ سرکیولرلاجک ہوئی۔ حالانکہ جس چیز کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جارہا ہے وہی مسئلہ ابھی زیر بحث ہے۔

۴۔ سٹرامن آرگیومنٹ، Strawman Argument.

انگریزی میں بھس بھرے آدمی کو سٹرا مین کہتے ہیں۔یعنی کھیتوں وغیرہ میں جانوروں اور پرندوں کو ڈرانے کے لئے بھوسے کو استعمال کر کے ایک پتلا بنا کر رکھا جاتا ہے۔اب اس کی وجہ تسمیہ مجھے نہیں معلوم۔اس قسم کے آرگیمونٹ کا مطلب یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق سے ایک ایسے مؤقف کو مسنوب کرتا ہے جو کہ اس فریق کا ہے ہی نہیں۔اور پھر وہ دوسرے فریق کو شکست دے کر سمجھتا ہے کہ میں نے اس کو شکست دی۔حالانکہ جس مؤقف کو اس نے شکست دی ہے وہ فریق مخالف کا مؤقف نہیں تھا۔

۵۔نیم کالنگ، Name calling:

دراصل اس کو کسی خاص قسم کی Fallacy میں بیان نہیں کیا جاتا۔لیکن یہاں پر چونکہ اس قسم کی حرکت ہوئی ہے اس لئے میں نے اس کو بیان کرنا ضروری سمجھا۔کسی خاص مقصد سے یا کسی دلیل کو شکست دینے کے لئے فریق مخالف یا کسی اور شخصیت کو کسی نام سے منسوب کرنا۔یہ دراصل ایک انتہائی قسم کی گھٹیا حرکت ہوتی ہے۔اس کا مقصد بحث کرنا نہیں بلکہ کسی کو نیچا دکھانا ہوتا ہے۔کسی کے بارے میں منطق اور ثبوت کی بنیاد پر ایک بات کہنا الگ مسئلہ ہے۔اگر کوئی یہ دعوی کرے کہ اللہ دراصل عربی خدا ہے تو اس پر منطقی اعتبار سے بحث کر سکتے ہیں۔لیکن اگر اللہ کی جگہ پر بطور نام ہی عربی خدا استعمال کرنے لگے تو اسے Name Calling ہی کہا جائے گا۔انتہائی صورت حال میں جب کہ آپ کسی کی مذمت کرنا چاہتے ہوں تو اس کی گنجائش ہو سکتی ہے۔لیکن کسی منطقی بحث میں فریق مخالف سے بحث کرتے ہوئے یہ حرکت صرف اور صرف بدنیتی کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ویسے اس کو آپ ریڈ ہیر نگ کی ہی ایک قسم سمجھ سکتے ہیں۔

۶۔ Ad-Hominem:

کسی بحث کے دوران منطق کا رخ دلیل کے بجائے فریق مخالف کی شخصیت کی طرف کی جائے تو اسے Ad-Hominem کہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دلیل کا جواب دینے کے بجائے فریق مخالف کی قابلیت، صلاحیت یا اخلاقی حالت پر ہی اعتراض کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ یہ بندہ بحث کرنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ یا چونکہ اس قسم کا بندہ یہ بحث کر رہا ہے اس لئے اس کا مؤقف لازمی طور پر غلط ہوگا۔ یہ طریقہ کار ہمیشہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن اس کو سوچ سمجھ کر استعمال کیا جانا چاہئے۔

۷۔ Unfalsifiable claim:

اگر آپ کوئی دعوی کریں تو اس دعوی سے یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ کس طریقہ کار کو استعمال کر کے اس دعوی کی تصدیق یا تردید ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ زید کا قد پانچ فٹ نو انچ ہے۔ تو آسان سا طریقہ ہے کہ آپ ایک ٹیپ لیں اور زید کی قد کی پیمائش کریں۔ آپ کو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ دعوی صحیح ہے یا نہیں۔ اگر کوئی یہ دعوی کرے کہ زید کی حرکتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متکبر ہے۔ اب اس دعوی میں مسئلہ یہ ہے کہ دعوی سے یہ واضح نہیں ہے کہ زید کی کس حرکت کو تکبر سے تعبیر کیا جائے۔ اور کیا ایسا کوئی متفق علیہ پیمانہ ہے جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جائے کہ کونسی حرکت تکبر ہے اور کونسی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کے صرف اچھے کپڑے پہننے کو ہی تکبر سے تعبیر کیا جائے۔ ایک Unfalsifiable دعوی

ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ غلط ہو۔ لیکن کسی سے بحث کے دوران اس قسم کے دعوی کو بہت احتیاط سے استعمال کیا جانا چاہئے۔ الغرض Unfalsifiable دعوی کرنا ہمیشہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن اس قسم کی چیزوں کو بعض لوگ غلط مقصد سے استعمال کرتے ہیں۔

اب آتے ہیں اس بحث پر میرے تاثرات کی طرف۔

بحث میں کیا ہوا اس پر آپ جب بحث پڑھیں گے تبھی پتہ چلے گا۔ میں کچھ اپنے تاثرات ہوائنٹ بائی پوائنٹ بیان کرتا ہوں۔

ا۔ میں نے بحث کے اوائل میں جو بنیادی نکتہ اٹھایا تھا وہ یہ تھا کہ تقدیر پر بحث کے دوران ''عربی خدا'' کا لفظ استعمال کرنا لوڈڈ سوال ہے۔ اس میں آپ ایک مسئلہ پر سوال کھڑا کرتے ہیں لیکن بیچ میں ایک دوسرا دعوی گھسیٹ دیتے ہیں۔

۲۔ پوائنٹ نمبر ا کے جواب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ چونکہ اللہ کے لئے ''عربی خدا'' کا لفظ استعمال کرنے کا جواز موجود ہے اس لئے یہ لوڈڈ سوال نہیں ہوا۔ یہ جواب انتہائی احمقانہ ہے۔ یہاں پر ان کے پاس جو بھی جواز ہے وہ دو فریقوں کے درمیان ابھی متفق علیہ نہیں ہے۔ اس لئے عربی خدا کے الفاظ کو استعمال کرنا فی الحال ایک دعوی ہی تھا نہ کہ کوئی متفق علیہ کوئی چیز۔

۳۔ اپنی اسی بات کو مزید ثابت کرنے کے لئے عزازی صاحب یہ مسئلہ کھڑا کیا کہ ان کے نزدیک اللہ کوئی باشعور ھستی نہیں ہے اس لئے وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ عزازی صاحب نے جب تقدیر پر ایک سوال اٹھایا ہے تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اللہ ایک باشعور ھستی نہیں ہے۔ اب جناب موصوف جس چیز کو فی الحال "ثابت کرنے" کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اسی کو اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں۔ یعنی یہ واضح طور پر Circular Logic ہے۔

۴۔ میں نے اس بحث میں ایک اور نکتہ رکھا تھا کہ چونکہ اللہ نے خود یا اس کے معتقدین نے اللہ کے لئے "عربی خدا" کی اصطلاح استعمال نہیں کی اس لئے اللہ کو "عربی خدا" کہنا Name calling ہے۔ تو جناب موصوف نے کہا چونکہ مسلمان جس خدا کو مانتے ہیں وہ عربوں میں ہی متعارف ہوا اس لئے اس کی شناخت ظاہر کرنے کے لئے عربی خدا کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جب میں نے یہ کہا کہ تو پھر اس کی اس شناخت کو ظاہر کرنے کے سب سے بہتر لفظ "اللہ" ہی ہے تو جناب نے یہ بہانہ بنایا کہ چونکہ ان کی زبان اردو ہے اس لئے انہوں نے یہ لفظ استعمال کیا۔ جب میں نے کہا کہ خدا فارسی لفظ اور اللہ عربی اور دونوں الفاظ اردو میں بھی مستعمل ہیں تو موصوف کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہاں پر موصوف کی واضح بدنیتی اور جہالت نظر آتی ہے۔

۵۔ میں نے اللہ کی عربی شناخت کے سلسلے میں تین ممکنہ نکات رکھے تھے، عربی خدا کہنے کی گنجائش تبھی تسلیم کی جاسکتی ہے جب آپ یہ مانیں کہ اللہ کی مادری زبان عربی ہے، یا اللہ عربی النسل ہے یا پھر اللہ عرب میں رہائش پذیر ہے۔ موصوف نے پہلے دونوں نکات کا انکار کر دیا۔ جب تیسرے نکات پر بات آئی تو موصوف نہ یہ کمال کا نکتہ اُٹھایا "کمال ہے حضرت مکہ میں بغیر رجسٹری کے اس نے ایک گھر پر قبضہ کیا ہوا

ہے اور آپ کہتے ہیں کہ وہ عرب میں رہائش پذیر نہیں ہے"۔ جب میں نے علمی انداز میں گرفت کرنے کی کوشش کی تو جناب نے اس کو اپنا مذاق قرار دیا اور کسی بھی علمی بحث سے گریزاں رہے۔ اس قسم کی ڈائیلاگ بازی دراصل Red Herring کہلاتی ہے۔ یہ واضح طور پر موصوف کی بدنیتی تھی۔ موصوف کو خود اپنی ریڈ ہیرنگ اتنی پسند آئی تھی کہ اسی کو ایک الگ سے پوسٹ بنا کر خود ستائشی کے انداز میں ڈال دیا۔

۶۔ بحث کے تقریباً آخر میں ایک بھائی صاحب نے مجھ پر الزام لگایا کہ میرے اندر غرور و تکبر صاف نظر آرہا ہے۔ بلکہ کچھ دوسرے حضرات نے مجھے اخلاقیاتی طعنے بھی دئے۔ اسی طرح یاسر حبیب مستقل طور پر مجھ پر الزام لگاتے رہے کہ میں کج بحثی کر رہا ہوں اور تاویلات گڑھ رہا ہوں۔ اسی ضمن میں میں نے Unflasifiable Claim کی مثال دی کہ غرور و تکبر نظر آنے کا کیا مطلب ہے اور اس کے ہونے اور نہ ہونے سے کو کس طرح سے ثابت کیا جائے۔ حقیقت یہ تھی کہ جس اعتماد سے میں اکیلا ان طعنے بازوں کے مقابلے میں کھڑا تھا اس کو موصوف نے تکبر قرار دیا۔ اسی طرح ایک بحث کو تاویلات اور کج بحثی قرار دینے کا بھی کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ یہ سب Unfalsifiable Claim تھے۔

۷۔ سعید خالد، نعمان سعید اور یاسر حبیب مستقل طور پر میرے پیچھے پڑے رہے کہ میں یہ ثابت کروں کہ اللہ عربوں سے پہلے بھی پایا جاتا تھا۔ اگرچیکہ اس پر بحث کرنا ممکن تھا لیکن یہ بحث بہت زیادہ علمی ہو جاتی اور یہ نابغہ روزگار شخصیات نہ علم کے اعتبار سے اور نہ نیت کے اعتبار سے اس قابل قطعی تھیں کہ ان سے اس پر بحث کی جائے۔ اس بارے میں میرا موٴقف یہ تھا جسے کئی بار دہرانا پڑا کہ میں نے اپنے آرگیومنٹ پر یہ دعوی کیا ہی نہیں تھا کہ اللہ کا نام بہت پہلے سے مستعمل ہے۔ لیکن یہ حضرات کسی طرح سے مجھے اسی بحث کی

طرف لے کر آنے پر مصر تھے۔ تاریخ کی بحث منطقی بحث سے بہت زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے اور پھر ایسے بدنیت اور جاہلانہ مزاج کے لوگوں سے تاریخ پر بحث کرنا عبث تھا۔ چونکہ میں نے اس بحث میں اسم اللہ کا پہلے سے ہونے کا دعوی نہیں کیا تھا اس لئے مجھ سے اس بات کا ثبوت مانگنا دراصل Strawman Argument تھا۔

۸۔ اس بحث کے دوران ۔۔۔۔۔ مجھ پر الزام لگاتے رہے کہ میں کج بحثی کر رہا ہوں، تاویلات کر رہا ہوں وغیرہ وغیرہ حالانکہ وہ اپنی کوئی ایک بات بھی ثابت نہیں کر سکے۔ یہ Ad-Hominem تھا۔ موصوف مستقل طور اس شدید قسم کے تاثر میں رہے کہ وہ جب چاہیں کسی کے بھی بارے میں بغیر وجہ بتائے جس قسم کا چاہے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ جناب آخر تک یہ طئے نہیں کر پائے کہ وہ بحث میں ایک فریق ہیں یا ایڈمن ہیں۔

۹۔۔۔۔۔۔۔ جو کہ بہت بڑکیں مارتے ہیں اس تھریڈ میں آکر ممیاتے ہوئے نظر آئے۔ بحث کا بہاؤ اگرچیکہ علمی اور منطقی تھا لیکن اتنا دقیق بھی نہیں تھا کہ ایک پڑھا لکھا شخص اس میں شرکت نہ کر سکے۔ لیکن یہ حضرات بس کسی وقفے میں یکا دکا کمنٹ کر کے غائب ہو جاتے۔

۱۰- میرا تاثر یہ تھا کہ گروپ میں کچھ پڑھے لکھے اور واقعی میں پڑھے لکھے اور سمجھدار بندے ہیں۔ لیکن ان کی انتے چکمہ بازیوں کو ایکسپوز کرنے کے باوجود کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ کھل کے کہے کہ ملحدین واقعی میں چکمہ بازیوں میں مصروف ہیں۔ ہاں ان قدرے سمجھدار ملحدوں کی وجہ سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ انہوں

نے ابتداء میں ہی مجھے بلاک نہیں کیا۔ وجہ صاف تھی، ان پڑھے لکھے ملحدوں کی سامنے امیج خراب ہو جاتا۔ ورنہ اتنا زیادہ برداشت کرنا فری تھنکرز کی سرشت میں نہیں ہے۔

۱۱۔ آخر میں جا کر یہ ہوا کہ جب ان سے کچھ بھی نہیں بن پڑا اور یہ بھی دیکھا گیا کہ اس بحث میں مسلسل ان ملحدین کی حماقت ظاہر ہو رہی ہے جس کی وجہ الحاد کی علمیت کا تاثر شدید متاثر ہو رہی ہے تو مجھے بلاک کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وہ کچھ یوں کیا گیا کہ

لوڈڈ سوال پر بحث کرتے ہوئے جناب یاسر حبیب نے میری دلیل کو بھونڈی قرار دیا تھا۔ میں نے بھی بالکل اسی انداز میں اسی بحث میں یاسر حبیب کی دلیل کو بھونڈی قرار دیا۔ مجھے پتہ ہے کہ اس قسم حرکت کے نتیجے میں بلاک کیا جا سکتا۔ چونکہ یاسر حبیب نے خود اس قسم کی حرکت کی لبرٹی لی ہوئی تھی اس لئے میرا خیال تھا کہ مجھے بھی یہی آزادی دی جائے گی۔ لیکن ایک خاص موقعے پر جب جناب نے تنگ آکر مجھے بلاک کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ تقاضا رکھا گیا کہ میں اپنا کمنٹ ایڈٹ کروں اور معافی مانگوں۔ میں نے موصوف کو بتایا کہ یہ حرکت انہوں نے خود کی ہے اس لئے پہلے انہیں معافی مانگی چاہئے۔ ساتھ میں ان کے کمنٹ کی سکرین شاٹ بھی لگا دی۔

موصوف نے میری بات کا جواب دئے بغیر مزید معافی کا ڈیمانڈ رکھ دیا۔ میں نے پھر اپنے مؤقف کو دہرایا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ مجھے بلاک کر دیا گیا ہے اور وہ کمنٹ جس میں ان کی اسی حرکت کا ثبوت پیش کیا گیا تھا اسے بھی ڈلیٹ کر دیا ہے۔ لیکن کسی سچے اور مخلص ملحد کو تا حال یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس پر احتجاج کرے۔ ملحد یہی ہوتا ہے بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ عزازی میاں نے بھی مجھے بلاک کرنے کی تائید کی ہوئی ہے۔

۱۲۔ پوری بحث میں ایک چیز خاص طور پر محسوس کی گئی کہ ملحدین تین سٹرٹجی پر عمل کرتے رہے لیکن یہ ان کے کوئی کام نہیں آئی۔ اول یہ کہ اعتراض کے جوابات کو پڑھے بغیر اپنے اعتراضات کو وقفے وقفے سے دہراتے جانا، دوم یہ کہ نکات کا جواب دینے کے بجائے جوابات پر تبصرے کرنا جیسے یہ کج بحثی ہے، تاویلات ہیں، جذباتی باتیں ہیں، بچکانہ حرکات ہے وغیرہ۔ سوم یہ کہ جب کوئی ایک بندہ کمزور پڑ جائے تو وہ پیچھے ہٹ جائے اور دوسرے بندہ میدان میں آجائے اور جب وہ کمزور پڑ جائے تو پھر پہلے میدان میں آجائے۔ یاسر حبیب اور عزازی یہی گیم کھیلتے رہے۔ الحمد للہ مجموعی طور پر پوری بحث پر میری ایسی گرفت رہی کہ کسی کو بھی زیادہ حرکت کرنے کا کوئی موقعہ نہیں ملا۔ یہ ملحدین اپنا دفاع کرنے کے لئے Struggle کرتے نظر آئے۔ جب بھی انہوں نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی کوئی نہ کوئی نئی چکمہ بازی (Fallacy) کرتے ہوئے پکڑے گئے۔

۱۳۔ بحث کے دوران ایک خاص لیول پر جا کر میں نے محسوس کیا کہ یہ ملحدین کبھی اپنی غلطی نہیں مانیں گے اور نہ ہی اپنی غلطی کو صحیح ثابت کریں گے۔ اس بنیاد پر میں نے کہا کہ چونکہ معاملہ Stalemate کی سطح پر پہونچ چکا ہے اس لئے اس بحث کو ختم کر دیتے ہیں اور قارئین کو فیصلہ کرنے دیتے ہیں کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ میری اس آفر کو یاسر حبیب نے میری کمزوری سمجھا اور بڑے تکبر سے میری اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ ایسے میں اگر میں پیچھے ہٹ جاتا تو اس کو میری شکست مان لیا جاتا۔ اس لئے پھر مجھے بھی کمر کس کر میدان میں رہنا پڑا۔ یہ تکبر یاسر حبیب کو بہت مہنگا پڑا۔

۱۴۔ بحث کے دوران ایک سطح پر یاسر حبیب نے بحث کو بوریت قرار دے کر کہہ دیا کہ مزید اس کا وقت خراب نہ کیا جائے وہ مزید بحث میں حصہ نہیں لیں گے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عزازی معاملہ کو

سنبھال نہیں پایا تو پھر بار بار آتا رہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ موصوف کو لگ رہا تھا کہ الحاد کی عزت خطرے میں ہے۔

۱۵۔ بحث کے دوران عزازی نے اپنے مؤقف کا دفاع کرنے کے بجائے مجھ سے سوالات پوچھنے شروع کر دئے۔ چونکہ مجھے عزازی کی اس چکمے بازی کا علم تھا اس لئے میں نے عزازی سے یہ پوچھا کہ آپ کو اپنے مؤقف کے دفاع کرنے کے لئے سوال جواب کا کتنا دور پورا کرنا ہے۔ اور مزید یہ بھی مطالبہ کیا کہ جس طرح موصوف مجھ سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں اسی طرح مجھے بھی پوچھ گچھ کرنے کی آزادی دیں۔ عزازی کی چکمے بازی کا ایک مخصوص طریقہ یہ ہے کہ جب وہ لاجواب ہو جاتا ہے تو پھر اپنے مؤقف کا دفاع کرنے کے بجائے فریق مخالف پر ایک سوال داغ دیتا ہے اور جب اس کا جواب دیا جائے تو پھر ایک اور داغ دیتا ہے اور جب اس کا بھی جواب دیا جائے کچھ اور داغ دیتا ہے۔ اس طرح بحث نتیجے تک کبھی نہیں پہونچتی اور قارئین بحث میں اپنی دلچسپی کھو دیتے ہیں۔ اسی کے پیش نظر میں نے عزازی کے سوال جواب والے چکر کو انٹرٹین نہیں کیا۔ جب عزازی نے یہ صورت حال دیکھی تو اس نے مزید سوال کرنے کی ہمت نہیں کی۔

۱۶۔ بحث کے ایک مرحلے پر موصوف عزازی صاحب مجھے عجیب و غریب قسم کی خطابات دیتے نظر آئے۔ کبھی مجھے حضرت کہہ کر پکارتے کبھی اعلی حضرت کہہ کر۔ اب میری سمجھ یہ نہیں آیا کہ میرے دلائل کے دباؤ میں آکر خواہ مخواہ میری عزت کرنے لگے ہیں یا یہ کوئی طنز ہے جو کہ Name Calling کی شکل میں ظاہر ہوا یا پھر موصوف اس بحث کو کسی اور طرف Divert کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال یہ سلسلہ جبھی رکا جب میں نے بھی آنجناب کو علامۃ العصر جیسے خطاب سے نوازا۔ غالباً انہوں نے سوچا ہو گا کہ ''علامہ''

کے اس نام کی برکت سے کہیں ان کا حشر علامہ ایاز نظامی جیسا نہ ہو جائے۔ ویسے آج کل دیکھنے میں آیا ہے کہ ایاز نظامی صاحب نے اپنے آگے علامہ لکھنا بند کر دیا ہے۔

۱۷۔ بحث کے دوران یاسر حبیب نے اپنی کمزوری کو دیکھ کر ایک اور چال چلی۔ موصوف نے ایک کمنٹ میں اختتامی کلمات پیش کر دیئے اور پیش کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے اس بحث میں الحاد کی جیت ہو چکی ہے اور جن جن لوگوں نے اس بحث میں دلچسپی سب کا شکریہ وغیرہ وغیرہ۔۔ میری اپلوڈڈ فائل کے صفحہ نمبر چھیاسٹھ کے نیچے اس کمنٹ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بحث کے دوران چکمے بازی کی ایک اور گھٹیا قسم ہے جس کے لئے فی الحال کوئی نام نہیں ہے۔ لیکن میری تجویز ہے کہ اس قسم کی عیارانہ چکمے بازی کو Yasir Habib Fallacy قرار دیا جانا چاہیئے۔ بہر حال ایسا جواب ملا کہ موصوف کو مزید ایسی حرکت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

بہر حال ہم گروپ سے بلاک ہو چکے ہیں۔ پوری بحث کی فائل یہاں پر ملاحظہ فرمائیں۔۔ چونکہ ہم کو غلط طریقے سے بلاک کیا جا چکا ہے اور خود عزازی صاحب نے بھی ایک عدد لائک سے اس بلاک کئے جانے کی تائید کی ہوئی تو پھر مزید بحث کرنے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا ہے۔

تحریر: عزالدین دکنی

خدا، قرآن اور سیرت کے موضوع پر ایک ملحد کیساتھ مکالمہ

میرے فیس بک پیج پر مختلف لوگ اپنے مسائل کے لیے وقتاً فوقتاً مجھ سے رابطہ کرتے رہتے ہیں۔ دو روز پہلے ایک میسج آیا کہ ''میں قرآن کو محفوظ نہیں مانتا اور اس تعلق سے آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں''۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ سوال کرنے والا انڈیا سے تعلق رکھتا ہے تو میں نے اس سے فون پر بات کرنا مناسب سمجھا۔ میری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی، جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ سوال کرنے والا صرف 19 سال کا لڑکا ہے اور علیگڑھ کے ماحول میں رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شخص نے انٹرنیٹ پر موجود بہت سی ویڈیوز دیکھی ہیں اور تھوڑا بہت مطالعہ بھی کیا ہے۔ ذیل میں، میرے اور اس شخص کے درمیان ہونے والا مکالمہ ملاحظہ فرمائیں۔

ملحد: آپنے ایک ویڈیو میں یہ دعوی کیا ہے کہ قرآن محفوظ ہے، جبکہ میرا دعوی یہ ہے کہ قرآن غیر محفوظ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ (حضرت) عائشہ کی ایک روایت ہے جس کو مسلم نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے کہ 10 رضعات کو پانچ رضاعت والی آیت نے منسوخ کر دیا اور یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تک پڑھی جاتی رہی۔ مجھے بتایئے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے؟۔

مجیب: پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث میں یہ کہاں ہے کہ وفات کے بعد تک پڑھی جاتی رہی؟ وفات تک پڑھے جانے کا مطلب وفات کے بعد تک پڑھا جانا غلط خلاف واقعہ ترجمہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ "پڑھا جانا" عربی زبان کے قاعدے کے مطابق مجہول کا صیغہ ہے اور مجہول کا صیغہ کسی چیز کے کمزور ہونے کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس حدیث سے یہ بتانا چاہتی ہیں کہ چونکہ پانچ رضاعت والی آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے آخر میں منسوخ ہوئی، اس لئے سب لوگوں کو اس کا علم نہیں ہو سکا اور کچھ لوگوں کو وفات کے بعد تک وہ آیت یاد تھی اور وہ باآسانی پڑھ سکتے تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ آیت قرآن کا حصہ ہوتی تو حضرت عائشہ سب سے پہلے اپنے والد حضرت ابو بکر کے اوپر اعتراض کرتیں کہ انہوں نے جب قرآن کریم کو جمع کیا تو اس آیت کو شامل کیوں نہیں کیا اور اس کے بعد حضرت عثمان پر اعتراض کرتیں، جبکہ حضرت عائشہ کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد ہوئی ہے۔

ملحد: یہ تو آپ تاویل کر رہے ہیں ورنہ تو شیخ البانی نے اس حدیث کو سلسلہ الاحادیث الصحیحہ میں ذکر کیا ہے۔

مجیب: اول تو میں نے اس حدیث کی صحت کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کے وہ معنی بیان کیے جو درحقیقت درست ہیں، جبکہ آپ اس کے وہ معنی سمجھ رہے ہیں جو درست نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں یہ بھی بتا دوں کہ کسی حدیث کے سند کے اعتبار سے صحیح ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ قابل عمل بھی ہوگی۔ بہت سی احادیث ایسی ہیں جو سند کے اعتبار سے بہت مضبوط ہیں، لیکن وہ منسوخ ہیں اس لیے قابل عمل نہیں ہیں، بلکہ امام ترمذی نے ایک حدیث تو ایسی نقل کی ہے کہ جو ان کے نزدیک صحیح ہے۔ اس حدیث کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے بغیر کسی عذر کے، ظہر اور عصر کی نماز جمع فرمائی۔ خود امام ترمذی کے مطابق یہ حدیث قابل عمل نہیں ہے جبکہ وہ اس کی صحت کے قائل ہیں۔

ملحد: لیکن مولانا زبیر علی زئی نے تو اپنی ویڈیو میں یہ کہا ہے کہ یہ حدیث بھی قابل عمل ہے۔

مجیب: ہم امام ترمذی کی بات مانیں یا مولانا زبیر علی زئی کی۔ دوسرے یہ کہ مجھے صرف یہ بات ثابت کرنی ہے کہ امام ترمذی کے زمانے تک اس حدیث پر عمل نہیں ہوا، جبکہ اس حدیث کی سند پر کوئی غبار نہیں ہے۔ اس سے میرا یہ پوائنٹ ثابت ہوتا ہے کہ سنداً اگر کوئی حدیث صحیح ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر حال میں قابل عمل بھی ہو۔ رہی بات اس حدیث کی جس کا آپ حوالہ دے رہے ہیں وہ سنداً صحیح بھی ہے اور قابل عمل بھی ہے البتہ اس کے وہ معنی ہیں جو میں نے بیان کیے۔ اگر آپ کے بیان کردہ معنی درست ہوتے تو ثابت کیجئے کہ حضرت عائشہ نے بعد میں حضرت ابو بکر یا حضرت عثمان پر بھی اعتراض کیا تھا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ ملحد کیسے بنے؟ وہ کون سا سوال تھا کہ جس نے آپ کو مذہب کے بارے میں تردد اور شک میں ڈال دیا۔

ملحد: مجھے اس سوال کا آج تک کوئی جواب نہیں ملا کہ اگر اس کائنات کو اللہ نے بنایا تو پھر اللہ کو کس نے بنایا۔

مجیب: مجھے حیرت ہے کہ آپ نے قرآن اور حدیث اور اسی طریقے سے تاریخ کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، لیکن آپ اتنے بنیادی سوال میں اٹک گئے۔ اس کا جواب تو بہت آسان ہے۔

ملحد: آسان جواب ہے تو آپ دیجیے۔

مجیب: میں ایک مثال سے آپ کو سمجھاتا ہوں۔ تصور کیجیے کہ آپ ایک لڑکی سے اس کا ہاتھ مانگنے گئے اور اس سے کہا کہ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟ اس لڑکی نے جواب دیا کہ میں اپنی والدہ سے پوچھ کر بتاؤں گی۔ تو گویا کہ اس لڑکی کا ہاں کرنا اس کی والدہ کے جواب دینے پر منحصر ہوا۔ مگر والدہ نے کہا کہ وہ اپنی ماں سے پوچھ کر بتائے گی اور اس کی ماں نے کہا کہ وہ اپنی ماں سے پوچھ کر بتائے گی اور اس کی ماں نے کہا کہ وہ اپنی ماں سے پوچھ کر بتائے گی اور یوں یہ سلسلہ چلتا رہا، تو مجھے بتایئے کہ کیا آپ کی کبھی شادی ہو پائے گی؟ اسی طرح اگر اس کائنات کو اللہ نے بنایا ہے اور سامنے والا یہ سوال کرے کہ اللہ کو کس نے بنایا اور جواب ہوں کہ فلاں نے بنایا، تو فلاں کے بارے میں بھی یہی سوال ہو گا کہ اس کو کس نے بنایا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا اور کائنات کبھی بھی وجود میں نہیں آئے گی جب کہ کائنات موجود ہے۔ اسی چیز کو عربی میں تسلسل اور انگریزی میں infinite regress کہتے ہیں۔

ملحد: تسلسل کا یہ فارمولا صرف وہاں لاگو ہوتا ہے جہاں دو چیزیں کسی جگہ اور مکان میں موجود ہوں۔ تو کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ بھی کسی جگہ پر موجود ہے کائنات اس کے مقابلے میں دوسری جگہ پر؟

مجیب: اول تو آپ کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ پھر آپ نے یہ دعویٰ اس لیے کیا کیونکہ آپ نے اس فارمولے کو علم ریاضی میں پڑھا ہے۔ علم ریاضی میں انہی چیزوں پر گفتگو ہوتی ہے جو معدودات کے قبیل سے ہوں جب کہ اللہ تعالی معدودات کے قبیل سے نہیں ہے اور نہ ہی اللہ کی ذات علم ریاضی کا موضوع ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ نے خود اللہ کو مخلوق مان لیا تو وہ بھی معدودات کے قبیل سے ہو گیا اور اب اس پر بھی تسلسل کا یہ فارمولا نافذ ہو گا اور تسلسل غیر منطقی اور باطل ہے۔

ملحد: ٹھیک ہے میں نے مان لیا۔ میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ کائنات مخلوق ہے اور ایک خاص وقت میں اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے، تو اس کائنات کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ کیا کر رہا تھا۔

مجیب: ہمیں تو اللہ کی ذات کا بھی تفصیلی علم نہیں اور نہ ہی تفصیلا یہ معلوم کہ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد سے اللہ تعالی کیا کر رہا ہے، چہ جائے کہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ پیدا کرنے سے پہلے وہ کیا کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''اللہ کیا کیا کرتا ہے'' کا جاننا غیر محدود علم ہے اور انسان اپنی ذات اور اپنے علم کے اعتبار سے محدود ہے تو ایک محدود چیز غیر محدود علم کیسے رکھ سکتی ہے۔

ملحد: ٹھیک ہے میں آپ کی بات مانتا ہوں، لیکن آپ نے ایک ویڈیو میں یہ کہا ہے کہ قرآن کو شروع سے لے کر آج تک کسی نے بھی غلط قرار نہیں دیا، جبکہ آپ ہی کی حدیثوں کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ دو لوگ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کی کتابت کیا کرتے تھے مرتد ہو گئے تھے اور انہوں نے

یہ کہا تھا کہ محمد پر کوئی وحی نہیں آتی، بلکہ وہ اپنی طرف سے قرآن لکھواتے ہیں. آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟

مجیب: میں نے اپنی کسی ویڈیو میں یہ دعوی نہیں کیا کہ قرآن کو شروع سے لے کر آج تک کسی نے غلط نہیں کہا ہے۔ میں یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں جبکہ مجھے معلوم ہے کہ خود نزول قرآن کے دور میں مشرکین قرآن کو غلط کہا کرتے تھے۔ میرا دعوی یہ ہے کہ قرآن کی جو معجزانہ فصاحت و بلاغت ہے اس کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا ہے۔ رہی بات دو تین لوگوں کا مرتد ہو جانا اور یہ دعوی کرنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنی طرف سے قرآن لکھواتے ہیں تو اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ایسی بات تو آپ بھی کہہ رہے ہیں۔ رہی بات کہ وحی لکھنے والوں میں ایک شخص مرتد ہوا، تو دراصل وہ اسلام لایا ہی تھا کسی لالچ میں اور جب اس کی مراد پوری نہیں ہوئی تو وہ اپنے مذہب پر لوٹ گیا، لیکن اپنے اس عمل کو صحیح قرار دینے کے لیے اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹا الزام لگایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اس الزام کو ثابت نہیں کر سکا اور یہ دعویٰ محض دعویٰ ہی رہا۔ اس لیے کسی کے مرتد ہونے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ملحد: لیکن میرا ماننا یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نبی نہیں تھے بلکہ (العیاذ باللہ) ایک جنگجو تھے۔ کیونکہ انہوں نے مختلف قبیلوں کو جمع کر کے حکومت پر قبضہ کیا اور پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کی تیار کردہ جماعت نے حکومت کے لیے آپس میں جنگیں کی اور پڑوسی حکومتوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

مجیب: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں گفتگو بعد میں ہو گی۔ پہلے آپ یہ ثابت کیجیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی کس حکومت کو ختم کیا تھا۔

ملحد: لیکن صحابہ نے توپڑوسی حکومتوں کو ختم کیا۔

مجیب: میں نے پہلے ہی کہا کہ صحابہ کے بارے میں گفتگو بعد میں ہو گی۔ آپ نے یہ دعوی کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم العیاذ اللہ جنگجو تھے اور انہوں نے عرب کی حکومت کو ختم کیا، تو مجھے اس حکومت کا نام بتایئے جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم کیا تھا۔

ملحد: قبیلوں کو اس مقصد سے جمع تو کیا؟

مجیب: مختلف قبائل کو حکومت قائم کرنے کیلیئے جمع ضرور کیا، لیکن کسی حکومت کو ختم کرنے کے لیے نہیں، کیونکہ اس دور میں عرب میں کوئی حکومت تھی ہی نہیں۔

ملحد: چلیے مان لیا کہ حکومت قائم کرنے کے لیے ہی قبیلوں کو جمع کیا، لیکن آپ کے صحابہ نے پڑوسی ممالک پر حملہ کیوں کیا؟

مجیب: پہلے آپ اس بات کو تسلیم کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی حکومت پر قبضہ نہیں کیا، بلکہ ایک حکومت قائم کی۔

ملحد: تسلیم کر لیا۔

مجیب: یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ جو حکومت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی وہ نبوت ملنے کے تیرہ سال بعد قائم کی۔ پہلے ہی سال قائم نہیں کی تھی۔

ملحد: وہ اس لئے قائم نہیں کی تھی کیوں کہ مکہ میں حالات سازگار نہیں تھے۔

مجیب: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کی طرف سے سرداری کی آفر تھی، نیز اگر آپ چاہتے تو ابتدا میں ہی حبشہ ہجرت فرما دیتے یا وہاں کے بادشاہ سے کہتے اور حبشہ کے کچھ فوجی مکہ کے مشرکین کے خلاف چڑھائی کر دیتے۔ یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم اتنا ہی کر سکتے تھے کہ مدینہ کے وہ انصار جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے، آپ علیہ الصلاۃ والسلام ان سے کہتے کہ وہ اپنے قبیلے کو مکہ لا کر مشرکین پر حملہ کر دیں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی گوارا نہیں کیا، بلکہ خود ہجرت فرمائی اور مدینہ جا کر جہاں کوئی حکومت نہیں تھی ایک حکومت قائم فرمائی۔

ملحد: چلیے مانتا ہوں لیکن پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ نے پڑوسی ملکوں پر حملہ کیوں کیا؟

مجیب: جب ایک حکومت قائم ہو گئی تو اب اس حکومت کے تحفظ کی ذمہ داری بھی حکومت کے سربراہ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر سربراہ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ حکومت اور اس کے تحت بسنے والی رعایا کے جان و مال خطرے میں ہیں، تو سربراہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس خطرے سے نمٹے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جتنی جنگیں ہوئی وہ سب اسی فلسفے کے تحت ہوئی ہیں۔ فارس و روم پر اگرچہ اقدامی حملے ہوئے ہیں لیکن وہ مستقبل کے خطرے کو سامنے رکھ کر ہوئے ہیں۔ اگر ان دونوں سپر پاورز پر حملے نہ ہوتے تو عرب کی یہ حکومت نیست و نابود کر دی جاتی اور یہاں کے لوگ بڑی تعداد میں قتل کیے جاتے۔

ملحد: ابو بکر کے زمانے میں خود ان مسلمانوں پر جنھوں نے زکوۃ دینے سے منع کر دیا تھا فوج نے حملہ کیا، کیا وہ جنگجو ذہنیت کا عکاس نہیں ہے۔

مجیب: جب مدینہ کی ریاست ایک قانونی ریاست مان لی گئی، تو اب ریاست کے خلاف کسی بھی اجتماعی عمل کو بعض مرتبہ طاقت سے کچلنا پڑتا ہے۔ کیا آپ انڈیا کی سطح پر نکسلیوں کا ساتھ دیں گے یا حکومت ہند کا؟

ملحد: اور صحابہ کے درمیان آپس میں جو جنگیں ہوئی ہیں؟

مجیب: ہم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ صحابہ انبیاء تھے جن سے کبھی کوئی غلط فیصلہ صادر نہیں ہو سکتا۔ اگر صحابہ سے کبھی بھی کوئی غلطی نہ ہوتی، تو اللہ تعالی کا قائم کردہ نبوت کا نظام مشکوک ہو جاتا۔ کیونکہ جب نبی اور غیر نبی دونوں میں سے کوئی بھی غلطی نہیں کر سکتا تو نبی کی کیا فضیلت رہی؟ اس لیے صحابہ کے یہ اختلافات اپنے تمام تر خلوص کے باوجود اللہ کے تکوینی نظام کا حصہ ہیں۔ نیز صحابہ کے درمیان جو اختلافات ہوئے وہ حکومت حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اس بنیاد پر ہوئے کہ حکومت کس طرح چلانی ہے اور کس طرح نہیں۔

لیکن آپ کو ان سب معاملات میں پڑنے کی اس لیے ضرورت نہیں کیونکہ آپ تو خدا کے وجود کے ہی منکر ہیں۔ نبوت اور صحابیت تو بعد میں آتے ہیں۔ پہلے تو خدا کے وجود پر بات ہونی چاہیے۔

ملحد: جی نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے گفتگو اس لیے ہوگی کیونکہ آپ نے اللہ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہی جانا ہے۔

مجیب: ہم نے اللہ کے احکام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جانا ہے۔ اگر خدا کی معرفت مطلقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر موقوف ہوتی، تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی بھی خدا کو نہ جان پاتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اصل خدا ہے، نبوت کا درجہ بعد کا ہے اور صحابیت کا درجہ اس کے بھی بعد۔ لہذا آپ جب بھی گفتگو کریں تو خدا تعالی کے وجود کے تعلق سے گفتگو کیجیے۔ آگے کی گفتگو کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے ذہن میں اسلام کے غلط ہونے کا ایک مفروضہ قائم کر لیا۔ اب اس مفروضے کو ثابت کرنے کے لئے آپ مختلف دلائل حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ملحد: چلیے ٹھیک ہے میں آپ کے اس مشورے پر عمل کروں گا لیکن اب بقیہ گفتگو اگلی نشست میں ہوگی۔

اس طرح یہ طویل گفتگو ختم ہوئی اور میں یہ سوچنے لگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث مبارکہ میں جو بات فرمائی تھی وہ کتنی سچ تھی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''آخر زمانے میں کچھ لوگ آپس میں گفتگو کریں گے۔ ان میں سے ایک شخص یہ کہے گا کہ اگر اللہ نے کائنات کو پیدا کیا تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا۔ اگر کسی کے ذہن میں شیطان یہ وسوسہ ڈالے تو وہ شخص فورا سورہ اخلاص پڑھے اور بائیں طرف تھوکے''۔ حدیث میں اس شیطانی وسوسے کا علاج اس لیے بتایا گیا، کیونکہ یہیں سے الحاد اور ارتداد کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

علی گڑھ کے اس انیس سالہ لڑکے کے ذہن میں بھی یہی سوال سب سے پہلے آیا تھا کہ اگر اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے تو اللہ کو کس نے پیدا کیا۔ سوال کے غلط ہونے کے باوجود اس شخص نے اس سوال کو منطقی تسلیم کر لیا اور جب جواب نہیں مل پایا تو اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

میں اپنی اس تحریر کے پڑھنے والے ہر قاری سے درخواست کروں گا کہ وہ اس لڑکے کے ایمان کے لیے دعا کریں۔ ہم دلائل کے ذریعہ سامنے والے کو خاموش تو کر سکتے ہیں، لیکن ہدایت دینے والا صرف اللہ ہی ہے۔ میں جب بھی کسی ملحد سے گفتگو کرتا ہوں تو بہت دیر تک اضطرابی کیفیت رہتی ہے اور دل میں یہ سوال بار بار آتا ہے کہ آخر کب ہم اجتماعی سطح پر اس تعلق سے سنجیدہ ہوں گے اور نوجوان لڑکے لڑکیاں جو علما سے بے تعلق ہو کر انٹرنیٹ پر اسلام مخالف مواد پڑھ اور دیکھ رہے ہیں اور دین سے بیزار ہو رہے ہیں، اس زہریلے اور جھوٹے مواد کے مقابلے ہمارا صداقت پر مبنی مواد اسی انداز اور زبان میں کب آئے گا۔

گزشتہ مکالمے کا اختتام ملحد کے اس وعدے پر ہوا تھا کہ وہ بقیہ گفتگو اگلی کسی نشست میں کرے گا۔ اس دوران دو تین مرتبہ اس کے ساتھ مختصراً گفتگو ہوئی جس میں، میں نے اس سے یہ مطالبہ کیا کہ میری طرف سے اللہ کے وجود پر عقلی دلیل آچکی ہے۔ اب اس کی باری ہے کہ وہ اللہ تعالی کے وجود کے ناممکن ہونے پر کوئی عقلی دلیل پیش کرے۔ ڈارونزم وغیرہ جیسے نظریات پیش نہ کرے، کیونکہ یہ محض احتمالات ہیں جو کہ کچھ لوگوں کے نزدیک اعتبار حاصل کر گئے، بلکہ خود ان لوگوں کے نزدیک بھی یہ احتمالات حقائق کا درجہ حاصل نہیں کر پائے ہیں۔ لہذا میرا مطالبہ ایسی دلیل کا ہے کہ جو اہل عقل کے نزدیک متفقہ اصولوں پر مبنی ہو اور اس دلیل کی رو سے وہ اللہ کے وجود کے ناممکن ہونے کو ثابت کرے۔ میرے مخاطب نے تین سے چار دن کا وقت مانگا اور آخر کار یہ اعتراف کیا کہ میں کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔ درحقیقت ملحدین خواہ وہ امام غزالی کے دور کے ہوں یا آج کے دور کے، وہ آج تک خدا کے وجود کے ناممکن ہونے کو مضبوط عقلی دلیل سے ثابت نہیں کر پائے۔

جن حضرات نے اس مکالمے کی پہلی قسط پڑھی ہے، انہیں یاد ہوگا کہ اس میں وجود باری پر ایک دلیل دی گئی تھی کہ یہ سوال کہ خدا کو کس نے بنایا ہے اس لیے غلط ہے، کہ اگر اس سوال کو درست مان لیا جائے تو تسلسل لازم آئے گا۔ دوسرے الفاظ میں اگر یہ سوال درست ہو تو یہ کائنات کبھی بھی موجود نہیں ہو سکتی۔ ملحد کے ساتھ گفتگو کی دوسری باقاعدہ نشست کا آغاز دراصل اسی دلیل سے ہوا۔ اس نے عہد حاضر کے ملحدوں کے امام برطانوی نژاد رچرڈ ڈاکنز کی کتاب سے ایک اقتباس مجھے بھیجا، جس میں میری ذکر کردہ دلیل پر سوالات اٹھائے گئے تھے۔ رچرڈ ڈاکنز نے سب سے پہلے تو یہ بات لکھی کہ تسلسل کا باطل ہونا خود قابل بحث چیز ہے۔ گویا کہ کچھ لوگوں کے نزدیک تسلسل باطل نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض رچرڈ ڈاکنز نے یہ کیا کہ اگر کائنات میں ایک چیز دوسرے کا سبب ہے اور یوں خدا پوری کائنات کا سبب ہے تو آخر خدا کا بھی کوئی نہ کوئی سبب ہوگا، ورنہ کیا وجہ ہے کہ سبب و مسبب کے اس عمومی ضابطے سے خدا کو بلا کسی دلیل کے باہر رکھا گیا ہے، کیونکہ کسی بھی عمومی ضابطہ سے مستثنیٰ ہونے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، تو آخر کس بنیاد پر خدا کو اس ضابطے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے؟ اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد ملحد کے ساتھ گفتگو کچھ یوں ہوئی۔

مجیب: رچرڈ ڈاکنز کا یہ کہنا کہ تسلسل باطل نہیں ہے دراصل ایک بدیہی چیز کا انکار ہے۔ کیونکہ اگر الف کا وجود ب پر موقوف ہو اور ب کا وجود ت پر موقوف ہو اور ت کا وجود ث پر موقوف ہو اور یہ سلسلہ ہمیشہ یونہی چلتا رہے تو الف کا وجود کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز اتنی واضح ہے کہ تھوڑی بہت محنت کے بعد، بچوں کے بھی سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن اس کی ایک دوسری دلیل بھی سنیے۔ اگر ہم اس کائنات میں ممکنات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تصور کر لیں، تو یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ممکنات کے اس نہ ختم ہونے والے سلسلے

کے مجموعے کا سبب کیا ہے۔اس تعلق سے صرف دو ہی احتمالات ہیں۔پہلا احتمال تو یہ ہے کہ مجموعہ خود ہی سبب ہو۔یہ احتمال اس لیے باطل ہے کہ کوئی بھی چیز خود اپنی ذات کا سبب نہیں بن سکتی۔ارباب عقل کے نزدیک یہ ایک متفقہ اصول ہے۔دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس مجموعے کا کوئی ایک جزو پورے مجموعے کا سبب ہو۔یہ احتمال بھی اس لیے غلط ہے کیونکہ وہ جزو مجموعہ کا حصہ ہے اور جزو اگر کل کا سبب ہو تو گویا کہ شئی کا اپنا ہی سبب بننا لازم آیا اور یہ ناممکن ہے۔اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی یہ کہے کہ بارش کا سبب خود بارش ہے یا بارش کا ایک قطرہ ہے۔ لہذا جب یہ دونوں احتمالات باطل ٹھہرے تو تسلسل infinite regress یعنی ممکنات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بھی باطل ٹھہرا۔

ملحد: ٹھیک ہے میں نے مانا کے تسلسل ناممکن ہے۔لیکن رچرڈ ڈاکنز کا یہ بھی تو کہنا ہے کہ اگر ہر چیز کا کوئی نہ کوئی سبب موجود ہے تو خدا کا بھی سبب ہوگا آخر کس وجہ سے اس عمومی ضابطے سے آپ خدا کو الگ کرتے ہیں؟

مجیب: کیا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات اور اس میں موجود تمام چیزیں، موجود ہونے اور موجود نہ ہونے دونوں کی صلاحیت رکھتی ہیں۔یعنی جس طریقے سے یہ ممکن ہے کہ کائنات موجود ہو یہ بھی ممکن ہے کہ موجود نہ ہو؟

ملحد: جی ہاں کائنات کا موجود ہونا اور نہ ہونا دونوں ممکن ہیں۔

مجیب: دونوں باتوں کے امکان کے باوجود کائنات موجود ہے۔یقینا کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی کہ کائنات موجود ہونے اور نہ ہونے میں برابر ہونے کے باوجود موجود ہوئی۔ترازو کے دونوں پلڑے اگر خالی ہوں،

تو برابر ہوں گے لیکن اگر ایک پلڑا جھکا ہوا ہے، تو یقینا کوئی وزن دار چیز اس پر رکھی ہوئی ہے جو دوسرے پلڑے پر نہیں ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ وجہ کیا ہے جس کی بنیاد پر کائنات وجود میں آئی۔

ملحد: کائنات بغیر کسی کے ارادے کے خود سے وجود میں آسکتی ہے.

مجیب: گویا کہ آپ یہ مانتے ہیں کہ ایک چیز خود اپنی ذات کا سبب ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کے نزدیک یہ اصول درست ہے تو پھر بارش بادلوں کے بجائے خود بارش کا سبب ہو گی، گرمی آگ یا سورج کے بجائے خود گرمی کا سبب ہو گی اور بچہ اپنے والدین کے بجائے خود اپنی پیدائش کا سبب ہو گا؟

ملحد: یعنی آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ کائنات جو کہ اپنے موجود ہونے اور نہ ہونے میں برابر ہے وہ خدا کے ارادہ کرنے سے وجود میں آئی؟

مجیب: بالکل درست! نیز یہ میرا صرف دعوی ہی نہیں ہے، بلکہ میرے پاس اس کی دلیل بھی ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ توجہ سے میری یہ دلیل سنیں۔ آپ نے خود تسلیم کر لیا ہے کہ کائنات اپنے موجود ہونے اور نہ ہونے میں برابر ہے، لیکن اس کے باوجود وہ وجود میں آئی ہے، تو یقینا اس کے وجود میں آنے کا کوئی نہ کوئی سبب ہو گا۔ اس سبب کے تعلق سے تین احتمالات ہیں۔ پہلا احتمال تو یہ ہے کہ وہ سبب کہ جس کی وجہ سے کائنات وجود میں آئی ہے خود اس کا وجود ممکن نہ ہو۔ یہ احتمال اس لیے درست نہیں ہے کہ جو چیز خود موجود نہیں ہے، بھلا وہ دوسری چیز کو کیسے موجود کر سکتی ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سبب کا بھی موجود ہونا اور نہ ہونا برابر ہو۔ یہ احتمال اس لیے غلط ہے کہ اگر وہ سب بھی ایسا ہی ہو گا جیسا کہ بقیہ کائنات تو وہ بھی کائنات کا حصہ ہو گا اور اس سے شی کا اپنا ہی سبب بننا لازم آئے گا۔ گویا کہ پھر بات وہی ہوئی کہ بارش کا سبب

خود بارش ہوئی۔ تیسرا اور آخری احتمال یہ ہے کہ اس سبب کا موجود ہونا اتنا ضروری ہو کہ اس پر کبھی عدم طاری نہ ہو سکتا ہو۔ اسی کو ہم علم کلام میں واجب الوجود کہتے ہیں، جو کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔ اب رچرڈ ڈاکنز کے سوال کا جواب یہ ہوا کہ سبب اور مسبب کے ضابطے سے خدا اس لیے مستثنیٰ ہے، کیونکہ وہ واجب الوجود ہے اور یہ ضابطہ صرف ممکنات میں نافذ ہوتا ہے۔

ملحد: ٹھیک ہے میں نے آپ کی اس تشریح کو قبول کر لیا ہے۔ اب میں خدا کے تعلق سے ہی آپ سے دوسرا سوال کرتا ہوں۔ وجود خدا کا تصور انسان کے پاس کہاں سے آیا ہے؟

مجیب: یہ کوئی تصور نہیں ہے، بلکہ پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو معرفت کی بنیاد پر حاصل ہونے والا ایک عقیدہ ہے جو نسل در نسل ان کی اولاد میں بھی چلتا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ آگے چل کر کچھ لوگوں نے اس واضح اور صاف عقیدے میں دوسری چیزوں کی بھی آمیزش کر دی۔

ملحد: ایسا نہیں ہے، بلکہ قدیم زمانے میں یونانیوں نے سمندری طوفان کو خدا کی ناراضی سے جوڑا، اسی طریقے سے رومیوں نے مختلف آفات کو مختلف خداؤں سے منسوب کیا۔ لیکن آج ہمیں پتہ چل چکا ہے کہ سمندر میں طوفان کیوں آتا ہے، دنیا میں مختلف آفتیں کیوں آتی ہیں، لہذا ان کا جو تصور خدا تھا وہ نیست و نابود ہو گیا، تو آپ کا تصور خدا بھی نیست و نابود ہو سکتا ہے۔

مجیب: یونانیوں اور رومیوں نے اگر ان واقعات کو اپنے گڑھے ہوئے خداؤں کی طرف منسوب کیا تھا، تو اس تصور کو نیست و نابود ہونا ہی تھا۔ البتہ ہم مسلمان آسمانی آفتوں کو خدا کی ناراضی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اب آپ یہ کہیں گے کہ سائنس نے ہمیں بتا دیا ہے کہ آفتیں کیسے آتی ہیں۔ تو میں یہ جواب دوں گا کہ

سائنس نے ہمیں یہ بتلایا ہے کہ آفت کیسے آتی ہے، یہ نہیں بتلایا ہے کہ کیوں آتی ہے اور نا ہی سائنس کبھی بھی "کیوں" کا جواب دے پائے گی۔

ملحد: اچھا یہ بتائیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ کیوں رک گیا؟

مجیب: پہلے آپ یہ بتائیے کہ خدا کے وجود کے تعلق سے آپ کے تمام شکوک دور ہو گئے ہیں یا نہیں؟

ملحد: جی ہاں ابھی تک تو ایسا ہی ہے، لیکن اگر میرے ذہن میں کوئی سوال آیا تو میں یقیناً آپ کو میسج کروں گا۔

مجیب: اب آیئے آپ کے اس سوال کی طرف کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت اور رسالت کا سلسلہ کیوں رک گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہدایت کا اعلی ترین پیمانہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں انسانیت کو دے دیا گیا۔ اب اگر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعوی کرے تو یہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے ماؤنٹ ایورسٹ سے اونچی ایک چوٹی دریافت کرلی ہے۔ کیونکہ جس طرح پہاڑوں میں اونچائی کے پیمانے کی کہیں نہ کہیں انتہا ماننی پڑتی ہے، اسی طرح انبیاء میں اچھائی کے پیمانے کی کسی ایک جگہ آکر انتہا ماننی پڑے گی۔

ملحد: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اچھائی کا سب سے اونچا پیمانہ ہیں، تو آپ نے اپنے قبیلے کو حکومت میں برتری دیتے ہوئے یہ کیوں کہا کہ الائمۃ من قریش. اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقصد اپنے قبیلے کو مستحکم کرنا تھا۔

مجیب: یہ حدیث انشاء نہیں بلکہ خبر ہے.

ملحد: کیا مطلب؟

مجیب: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی ہے کہ آنے والے دور میں قیادت قریش کے پاس ہو گی، آپ علیہ السلام نے اس کا حکم نہیں دیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسی لیے اپنی خلافت پر اس حدیث سے استدلال کیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر غلط نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت عثمانیہ جب قائم ہوئی تو مسلمانوں نے، باوجودیکہ عثمانی خلفاء قریش سے نہیں تھے، اس خلافت کو قبول کیا بلکہ اس کے بقاء کے لیے جدوجہد بھی کی۔

ملحد: لیکن مولانا مودودی نے تو اپنی کتاب خلافت وملوکیت میں یہ لکھا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ وہی معتبر ہو گا جو قریش سے ہو۔

مجیب: مولانا مودودی یا ان کے علاوہ دیگر نے کیا کہا ہے اور کیا نہیں اس کا میں ذمہ دار نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے اس کا دفاع کرنا ہے۔ اس حدیث کی حد تک مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ مختلف لوگوں نے اس حدیث کو مختلف انداز سے سمجھا ہے۔ لیکن علماء کے ایک بڑے طبقے نے اس حدیث کی وہی تشریح کی ہے جو میں نے آپ کو بتلائی ہے۔ اس حدیث کی ایک تشریح ابن خلدون نے بھی کی ہے۔ ان کے مطابق حدیث کی رو سے خلیفہ کو قریش کی قائدانہ صفات کے مطابق ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس زمانے میں قریش میں قیادت کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔

ملحد: آپ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی عقلی دلیل کیا ہے؟

مجیب: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے کئی عقلی دلائل ہیں۔ان میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ نہ صرف قرآن کے مطابق امی تھے، بلکہ تاریخی روایات کے مطابق بھی امی تھے (تاریخی روایات کا میں نے اس لیے ذکر کیا کیونکہ آپ قرآن کے منکر ہیں ورنہ ہمارے لیے قرآن کی شہادت کافی ہے)۔اپنی امیّت کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلوں اور پچھلوں کے علوم کا جامع ہونے کا درست دعویٰ فرمایا۔ لہذا تمام اسباب علم کے منقطع ہونے کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین و آخرین کے علوم کا حامل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی معمولی شخصیت نہیں ہیں اور یہ کہ آپ کے پاس جو علم ہے وہ براہ راست وحی کی صورت میں اللہ کی طرف سے آیا ہے۔

ملحد: اگر یہی بات ہے تو وہ علم یقینا ایسا ہونا چاہیے جس میں غلطی یا کسی بھی قسم کے ظلم کا احتمال نہ ہو۔ جب کہ سنن ابی داؤد میں ایک حدیث آتی ہے، جس کے مطابق زندہ درگور کرنے والی عورت اور زندہ درگور ہونے والی بچی دونوں جہنم میں جائیں گے۔ تو کیا زندہ درگور ہونے والی بچی پر یہ ظلم نہیں ہے؟

مجیب: اس حدیث کے تعلق سے آپ کے ذہن میں جو اشکال آیا ہے اس کی بنیاد عربی زبان نہ جاننا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: الوائدۃ والموؤودۃ في النار. اس حدیث میں وائدہ اور موؤودہ پر داخل ہونے والے "الف لام" سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد ایک خاص کیس ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ایک خاتون تھی جس کا نام ام سلمہ بنت یزید تھا۔اس نے اپنی بیٹی کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب اس عورت کا تذکرہ آیا تو آپ نے فرمایا کہ زندہ درگور کرنے والی یہ عورت تو جہنم میں جائے گی ہی، اگر اس کی بیٹی زندہ درگور نہ ہوتی تو بڑے ہو کر اپنے کفر کی وجہ سے جہنم میں جاتی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن میں حضرت موسیٰ اور خضر کے قصے میں حضرت خضر نے ایک بچے کو اللہ کی جانب سے حکم ملنے کے

بعد اس لیے قتل کر دیا تھا، کہ وہ بڑے ہو کر کافر بنتا اور دوسروں کو بھی کفر کے دلدل میں دھکیلتا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس بچی کے (زندہ رہنے کی صورت میں) مستقبل کے بارے میں علم دے دیا گیا تھا۔

ملحد: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے لیے اتنا وقت نکالا۔ مجھے اچھا لگا کہ آپ اس پوری گفتگو کے درمیان نہ مجھ پر چیخے نہ چلائے۔

یوں یہ گفتگو اس انیس سالہ نوجوان کے ساتھ اس وعدے پر اختتام پذیر ہوئی، کہ اس کے ذہن میں اگر کوئی بھی شبہ آئے گا تو وہ مجھ سے رابطہ کر سکتا ہے۔

آخر میں، میں مدارس کے فضلاء اور طلبہ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں، کہ اس پورے مکالمے کے درمیان، وجود باری پر ،،تسلسل'' کے بطلان کو سامنے رکھ کر جو دلیل دی گئی ہے، اس کی بنیاد درس نظامی میں شامل شرح عقائد نسفی ہے۔ نیز رچرڈ ڈاکنز نے تسلسل کے بطلان کو جو مشکوک قرار دیا ہے، اس کا جواب بھی علامہ تفتازانی شرح عقائد میں دے چکے ہیں۔ کسی شئ کا اپنے ہی لیے سبب بننے کا نظریہ باطل ہے، یہ بھی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح کائنات (جو کہ ممکنات کا مجموعہ ہے) کی علت صرف واجب الوجود ہو سکتی ہے، یہ مبحث بھی اسی کتاب میں ہے۔ بہت سے طلبہ اور فضلاء مدارس کے نصاب میں شامل معقولات کی کتابوں کو مفید نہیں سمجھتے ہیں، جب کہ شرح عقائد میں شامل مباحث اور ان کے عقلی دلائل آج بھی اتنے مضبوط ہیں کہ جدید دور میں رچرڈ ڈاکنز جیسے مشہور ملحدین کو ان دلائل کی بنیاد پر آپ جواب دے سکتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شرح عقائد کے دلائل آخری درجے کے ہیں، لیکن اگر کوئی پہلے درجے

تک ہی نہ پہنچ پائے تو اس کا آخری درجے پر پہنچنا کیسے ممکن ہے۔اس گفتگو میں حضرت نانوتوی کے بیان کردہ دلائل ذکر نہیں کئے گئے، کیونکہ ان کا درجہ شرح عقائد میں مذکور دلائل کے بعد کا ہے۔

جوابات مولانا یاسر ندیم الواجدی

کیا عقل کا بھی کوئی دائرہ ہوتا ہے؟

آج کل عقل پرستی(rationalism) کا بڑا زور ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہر چیز کو عقل کی میزان پر پرکھ کر اور تول کر اختیار کریں گے، لیکن عقل کے پاس کوئی ایسا لگا بندھا ضابطہ(Formula) اور کوئی لگا بندھا اصول (Principle) نہیں ہے، جو عالمی حقیقت (Universal Truth) رکھتا ہو۔ جس کو ساری دنیا کے انسان تسلیم کرلیں اور اس کے ذریعہ وہ اپنے خیر و شر اور اچھائی اور برائی کا معیار تجویز کرسکیں۔ کون سی چیز اچھی ہے؟ کون سی چیز بُری ہے؟ کون سی چیز اختیار کرنی چاہیے؟ کون سی چیز اختیار نہیں کرنی چاہیے؟ یہ فیصلہ جب ہم عقل کے حوالے کرتے ہیں تو آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ جایئے، اس میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اس عقل نے انسان کو اتنے دھوکے دیئے ہیں جس کا کوئی شمار اور حد و حساب ممکن نہیں۔ اگر عقل کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے لیے میں تاریخ سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے عالمِ اسلام میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا، جس کو ''باطنی فرقہ'' اور ''قرامطہ'' کہتے ہیں۔ اس فرقے کا ایک مشہور لیڈر گزرا ہے جس کا نام عبید اللہ بن حسن قیروانی ہے۔ اس نے اپنے پیرو کاروں کے نام ایک خط لکھا ہے وہ خط بڑا دلچسپ ہے۔ جس میں اس نے اپنے پیرو کاروں کو زندگی گزارنے کے لیے ہدایات دی ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے: ''میری سمجھ میں یہ بے عقلی کی بات نہیں آتی ہے کہ لوگوں کے پاس اپنے گھر میں ایک بڑی خوبصورت، سلیقہ شعار لڑکی بہن کی شکل میں موجود ہے اور بھائی کے مزاج کو بھی سمجھتی ہے۔ اس کی نفسیات سے بھی واقف ہے۔ لیکن یہ بے عقل انسان اس بہن کا ہاتھ اجنبی شخص کو پکڑا دیتا ہے۔ جس کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ نباہ صحیح ہوسکے گا یا نہیں؟ وہ مزاج سے واقف ہے یا نہیں؟ اور خود اپنے لیے بعض اوقات ایسی لڑکی لے آتے ہیں جو حسن و جمال کے اعتبار سے

بھی، سلیقہ شعاری کے اعتبار سے بھی، مزاج شناسی کے اعتبار سے بھی اس بہن کے ہم پلہ نہیں ہوتی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس بے عقلی کا کیا جواز ہے کہ اپنے گھر کی دولت تو دوسرے کے ہاتھ میں دے دے، اور اپنے پاس ایک ایسی چیز لے آئے جو اس کو پوری راحت و آرام نہ دے۔ یہ بے عقلی ہے۔ عقل کے خلاف ہے۔ میں اپنے پیروؤں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس بے عقلی سے اجتناب کریں اور اپنے گھر کی دولت کو گھر ہی میں رکھیں" (الفرق بین الفرق للبغدادی، و بیان مذاہب الباطنیہ للدیلمی) بہن اور جنسی تسکین اور دوسری جگہ عبید اللہ بن حسن قیروانی عقل کی بنیاد پر اپنے پیروؤں کو یہ پیغام دے رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

"کیا وجہ ہے کہ جب ایک بہن اپنے بھائی کے لیے کھانا پکا سکتی ہے، اس کی بھوک دور کر سکتی ہے، اس کی راحت کے لیے اس کے کپڑے سنوار سکتی ہے، اس کا بستر درست کر سکتی ہے تو اس کی جنسی تسکین کا سامان کیوں نہیں کر سکتی؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ تو عقل کے خلاف ہے" (الفرق بین الفرق للبغدادی، و بیان مذاہب الباطنیہ للدیلمی)

آپ اس بات پر جتنی چاہے لعنت بھیجیں، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ خالص عقل کی بنیاد پر جو وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہو، جس کو وحی الٰہی کی روشنی میسر نہ ہو، اس عقل کی بنیاد پر آپ اس کے اس استدلال کا جواب دیں۔ خالص عقل کی بنیاد پر قیامت تک اس کے اس استدلال کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ تو بڑی بداخلاقی کی بات ہے، بڑی گھناؤنی بات ہے، تو اس کا جواب موجود ہے کہ یہ بداخلاقی اور گھناؤنا پن یہ سب ماحول کے پیدا کردہ تصورات ہیں۔ آپ ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئے ہیں جہاں اس بات کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لیے آپ اس کو معیوب سمجھتے ہیں۔ ورنہ عقلی اعتبار سے کوئی عیب نہیں۔

اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اس سے حسب ونسب کا سلسلہ خراب ہو جاتا ہے تو اس کا جواب موجود ہے کہ نسبوں کا سلسلہ خراب ہو جاتا ہے تو ہونے دو۔اس میں کیا برائی ہے؟ نسب کا تحفظ کون سا ایسا عقلی اصول ہے کہ اس کی وجہ سے نسب کا تحفظ ضرور کیا جائے۔اگر آپ اس استدلال کے جواب میں یہ کہیں کہ اس سے طبّی طور پر نقصانات ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اب یہ تصورات سامنے آئے ہیں کہ استلذاذ بالا قارب (Incest) سے طبّی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آج مغربی دنیا میں اس موضوع پر کتابیں آرہی ہیں کہ استلذاذ بالا قارب (Incest) انسان کی فطری خواہش (Human Urge) کا ایک حصہ ہے اور اس کے جو طبّی نقصانات بیان کیے جاتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں۔وہی نعرہ جو آج سے آٹھ سو سال پہلے عبید اللہ بن حسن قیروانی نے لگایا تھا، اس کی نہ صرف صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے بلکہ آج مغربی ملکوں میں اس پر کسی نہ کسی طرح عمل بھی ہو رہا ہے۔

یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ عقل کو اس جگہ استعمال کیا جارہا ہے جو عقل کے دائرۂ کار (Jurisdiction) میں نہیں ہے۔جہاں وحی الٰہی کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔اور عقل کی وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ ہم جنس پرستی (Homosexuality) کے جواز کا بل تالیوں کی گونج میں منظور کر رہی ہے اور اب تو باقاعدہ یہ ایک علم بن گیا ہے۔میں ایک مرتبہ اتفاق سے نیویارک کے ایک کتب خانہ میں گیا۔وہاں پر پورا ایک علیحدہ سیکشن تھا، جس پر یہ عنوان لگا ہوا تھا کہ ”گے اسٹائل آف لائف“ (Gay Style Of Life) تو اس موضوع پر کتابوں کا ایک ذخیرہ آچکا ہے اور باقاعدہ ان کی انجمنیں ہیں، ان کے گروپ اور جماعتیں ہیں، اور وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔اس زمانے میں نیویارک کا میئر بھی ایک Gay تھا۔

امریکی رسالے ٹائم میں یہ خبر آئی کہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں میں سے تقریباً ایک ہزار افراد کو صرف اس لیے فوج سے نکال دیا گیا کہ وہ ہم جنس پرست (Homosexual) تھے۔ لیکن اس اقدام کے خلاف شور مچ رہا ہے، مظاہرے ہو رہے ہیں اور چاروں طرف سے یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ یہ بات کہ ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے آپ نے ان لوگوں کو فوج کے عہدوں سے برخاست کر دیا ہے، یہ بات بالکل عقل کے خلاف ہے اور ان کو دوبارہ بحال کرنا چاہیے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ تو ایک Human Urge ہے اور آج "Human Urge" کا بہانہ لے کر دنیا کی ہر بُری سے بُری بات کو جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ اور یہ تو صرف جنسِ انسانی کی بات تھی۔ اب تو بات جانوروں، کتوں، گدھوں اور گھوڑوں تک نوبت پہنچ گئی ہے اور اس کو بھی باقاعدہ فخریہ بیان کیا جا رہا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا (Encyclopedia of Britannica) میں ایٹم بم پر جو مقالہ لکھا گیا ہے اس کو ذرا کھول کر دیکھیں۔ اس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ دنیا میں ایٹم بم کا استعمال دو جگہ پر کیا گیا ہے۔ ایک ہیروشیما اور دوسرے ناگاساکی پر، اور ان دونوں مقامات پر ایٹم بم کے ذریعہ جو تباہی ہوئی اس کا ذکر تو بعد میں آگے چل کر کیا ہے، لیکن اس مقالے کو شروع یہاں سے کیا گیا ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو ایٹم بم برسائے گئے اس کے ذریعہ ایک کروڑ انسانوں کی جانیں بچائی گئیں، اور ان کو موت کے منہ سے نکالا گیا اور اس کی منطق یہ لکھی ہے کہ اگر ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم نہ گرائے جاتے تو پھر جنگ مسلسل جاری رہتی اور اس میں اندازہ یہ تھا کہ تقریباً ایک کروڑ انسان مزید مر جاتے۔ تو ایٹم بم کا تعارف اس طرح کرایا گیا کہ ایٹم بم وہ چیز ہے جس سے ایک کروڑ انسانوں کی جانیں بچائی گئیں۔ یہ اس واقع کا جواز (Justification) پیش کیا جا رہا ہے جس پر ساری دنیا لعنت بھیجتی ہے کہ ایٹم بم کے ذریعہ ہیروشیما

اور ناگاساکی میں ان بچوں کی نسلیں تک تباہ کر دی گئیں، بے گناہوں کو مارا گیا، اور یہ جواز بھی عقل کی بنیاد پر ہے۔ لہٰذا کوئی بُری سے بُری اور کوئی سنگین سے سنگین خرابی ایسی نہیں ہے جس کے لیے عقل کوئی نہ کوئی دلیل اور کوئی نہ کوئی جواز فراہم نہ کر دے۔ آج ساری دنیا فاشزم (Fascism) پر لعنت بھیج رہی ہے اور سیاست کی دنیا میں ہٹلر اور مسولینی کا نام ایک گالی بن گیا ہے۔ لیکن آپ ذرا ان کا فلسفہ تو اٹھا کر دیکھیں کہ انہوں نے اپنے فاشزم (Fascism) کو کس طرح فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی اگر فاشزم کے فلسفے کو پڑھے گا تو اسے اعتراف ہونے لگے گا کہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، معقول بات ہے۔ یہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ عقل ان کو اس طرف لے جا رہی ہے۔ بہر حال! دنیا کی کوئی بد سے بد تر بُرائی ایسی نہیں ہے جس کو عقل کی دلیل کی بنیاد پر صحیح تسلیم کرانے کی کوشش نہ کی جاتی ہو۔ اس لیے کہ عقل کو اُس جگہ استعمال کیا جا رہا ہے جہاں اس کے استعمال کی جگہ نہیں ہے۔

علامہ ابنِ خلدون جو بہت بڑے مؤرخ اور فلسفی گزرے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عقل دی ہے وہ بڑی کام کی چیز ہے لیکن یہ اسی وقت تک کام کی چیز ہے جب اس کو اس کے دائرے میں استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر اس کو اس کے دائرے سے باہر استعمال کرو گے تو یہ کام نہیں دے گی اور پھر اس کی ایک بڑی اچھی مثال دی ہے کہ عقل کی مثال ایسی ہے جیسے سونا تولنے کا کانٹا۔ وہ کانٹا چند گرام سونا تول لیتا ہے اور بس اس حد تک وہ کام دیتا ہے اور وہ صرف سونا تولنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کانٹے میں پہاڑ کو تولنا چاہے گا تو اس کے نتیجے میں وہ کانٹا ٹوٹ جائے گا اور جب پہاڑ تولنے کے نتیجے میں وہ ٹوٹ جائے تو اگر کوئی شخص کہے کہ یہ کانٹا تو بیکار چیز ہے، اس لیے کہ اس سے پہاڑ تو تلتا نہیں ہے، اس نے تو

کانٹے کو توڑ دیا تو اسے ساری دنیا احمق کہے گی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس نے کانٹے کو غلط جگہ پر استعمال کیا اور غلط کام میں استعمال کیا اس لیے وہ کانٹا ٹوٹ گیا۔ (مقدمہ ابنِ خلدون، بحث علم کلام)

اسلام اور سیکولرازم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ بیشک تم عقل کو استعمال کرو، لیکن صرف اس حد تک جہاں تک وہ کام دیتی ہے۔ ایک سرحد ایسی آتی ہے جہاں عقل کام دینا چھوڑ دیتی ہے بلکہ غلط جواب دینا شروع کر دیتی ہے۔ اس چیز کے لیے اللہ تعالٰی نے انسان کو ایک تیسرا ذریعۂ علم عطا فرمایا ہے، جو وحی الٰہی ہے، جب وہاں عقل کو استعمال کروگے تو یہ عقل غلط جواب دینا شروع کر دے گی۔ یہی وجہ ہے جس کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ جس کے لیے قرآن کریم اتارا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے:

(ترجمہ: ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب اتاری جس سے واقع کے موافق آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں)(النساء105)

یہ قرآن کریم آپ کو بتائے گا کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے؟ یہ بتائے گا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ یہ بتائے گا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ یہ سب باتیں آپ کو محض عقل کی بنیاد پر معلوم نہیں ہو سکتیں۔

ایک معروف بین الاقوامی ادارہ ہے جس کا نام ''ایمنسٹی انٹرنیشنل'' ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس کے ایک ریسرچ اسکالر سروے کرنے کے لیے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ خدا جانے کیوں وہ میرے پاس بھی انٹرویو کرنے کے لیے آ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ ادارہ جس کی طرف سے آپ کو بھیجا گیا

ہے یہ آزادی فکر کا علمبر دار ہے، بیشک یہ آزادی فکر بڑی اچھی بات ہے، لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ آزادی فکر آپ کی نظر میں بالکل مطلق (Absolute) ہے؟ یا اس پر کوئی پابندی بھی ہونی چاہیے؟ کہنے لگے کہ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ میں نے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ آزادی فکر کا یہ تصور کیا اتنا مطلق (Absolute) ہے کہ جو بھی انسان کے دل میں آئے وہ دوسروں کے سامنے برملا کہے اور اس کی تبلیغ کرے اور لوگوں کو اس کی دعوت دے؟ مثلاً میری سوچ یہ کہتی ہے کہ سرمایہ داروں نے بہت دولت جمع کرلی ہے، اس لیے غریبوں کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ ان سرمایہ داروں پر ڈاکے ڈالیں اور ان کا مال چھین لیں اور میں اپنی اسی سوچ کی تبلیغ بھی شروع کردوں کہ غریب جاکر ڈاکہ ڈالیں اور کوئی ان کو پکڑنے والا نہ ہو۔ اس لیے کہ سرمایہ داروں نے غریبوں کا خون چوس کر یہ دولت جمع کی ہے۔ اب آپ بتائیں کہ کیا آپ اس آزادی فکر کے حامی ہوں گے یا نہیں؟ وہ کہنے لگے: اس کے تو ہم حامی نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا کہ میں یہی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جب آزادی فکر کا یہ تصور بالکل (Absolute) نہیں ہے تو کیا آپ اس کو مانتے ہیں کہ کچھ قیدیں ہونی چاہئیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! کچھ قیدیں تو ہونی چاہیے، مثلاً میرا یہ خیال ہے کہ آزادی فکر کو اس شرط کا پابند ہونا چاہیے کہ اس کا نتیجہ دوسروں پر تشدد (Violence) کی صورت میں ظاہر نہ ہو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ قید تو آپ نے اپنی سوچ کے مطابق عائد کردی، لیکن اگر کسی شخص کی دیانت دارانہ رائے یہ ہو کہ بعض اعلیٰ مقاصد تشدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتے، اور ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے تشدد کے نقصانات برداشت کرنے چاہئیں تو کیا اس کی یہ آزادی فکر قابل احترام ہے یا نہیں؟ دوسرے جس طرح آپ نے اپنی سوچ سے آزادی فکر پر ایک پابندی عائد کردی، اسی طرح اگر کوئی دوسرا شخص اسی قسم کی کوئی اور پابندی اپنی سوچ سے عائد کرنا چاہے تو اس کو

بھی اس کا اختیار ملنا چاہیے، ورنہ کوئی وجہ ہونی چاہیے کہ آپ کی سوچ پر عمل کیا جائے اور دوسرے کی سوچ پر عمل نہ کیا جائے۔ لہٰذا اصل سوال یہ ہے کہ وہ قیدیں کیا ہونی چاہیے؟ اور یہ فیصلہ کون کرے گا کہ یہ قید ہونی چاہیے؟ اور آپ کے پاس وہ معیار کیا ہے جس کی بنیاد پر آپ یہ فیصلہ کریں کہ آزادی فکر پر فلاں قسم کی پابندی لگائی جاسکتی ہے اور فلاں قسم کی پابندی نہیں لگائی جاسکتی؟ آپ مجھے کوئی نپا تلا معیار (Yardstick) بتائیں، جس کے ذریعہ آپ یہ فیصلہ کر سکیں کہ فلاں قسم کی پابندی جائز ہے اور فلاں قسم کی پابندی ناجائز ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ صاحب! ہم نے اس پہلو پر کبھی باقاعدہ غور نہیں کیا۔ میں نے کہا: آپ اتنے بڑے عالمی ادارے سے وابستہ ہیں اور اسی کام کے سروے کے لیے آپ جارہے ہیں اور اسی کام کا بیڑہ اٹھا ہے، لیکن یہ بنیادی سوال کہ آزادی فکر کی حدود کیا ہونی چاہئیں؟ اس کا اسکوپ (Scope) کیا ہونا چاہیے؟ اگر یہ آپ کے ذہن میں نہیں ہے پھر آپ کا یہ پروگرام مجھے بار آور ہوتا نظر نہیں آتا۔ براہِ کرم میرے اس سوال کا جواب آپ مجھے اپنے لٹریچر سے فراہم کر دیں، یا دوسرے حضرات سے مشورہ کر کے فراہم کر دیں۔

کہنے لگے کہ آپ کے یہ خیالات اپنے ادارے تک پہنچاؤں گا اور اس موضوع پر جو ہمارا لٹریچر ہے وہ بھی فراہم کروں گا۔ یہ کہہ کر انہوں نے میرا اچھا سا شکریہ ادا کیا اور جلد رخصت ہو گئے۔ میں آج تک ان کے وعدے کے مطابق لٹریچر یا اپنے سوال کے جواب کا منتظر ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ قیامت تک نہ سوال کا جواب فراہم کر سکتے ہیں، نہ کوئی ایسا معیار پیش کر سکتے ہیں جو عالمگیر مقبولیت کا حامل (Universally Applicable) ہو۔ اس لیے کہ آپ ایک معیار متعین کریں گے دوسرا شخص دوسرا معیار متعین کرے گا۔ آپ کا بھی اپنے ذہن کا سوچا ہوا ہوگا۔ اس کا معیار بھی اس کے ذہن کا

سوچا ہوا ہو گا۔ اور دنیا میں کوئی شخص ایسا معیار تجویز کر دے جو ساری دنیا کے لیے مکمل طور پر قابل قبول ہو، یہ بات میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ واقعتاً انسان کے پاس وحی الٰہی کے سوا کوئی معیار نہیں ہے جو ان مبہم تصورات پر جائز حدیں قائم کرنے کا کوئی لازمی اور ابدی معیار فراہم کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے سوا انسان کے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔

آپ فلسفہ کو اٹھا کر دیکھیے۔ اس میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا ہے کہ قانون کا اخلاق سے کیا تعلق ہے؟ قانون میں ایک مکتبِ فکر ہے جس کا یہ کہنا ہے کہ قانون کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اچھے برے کا تصور غلط ہے۔ نہ کوئی چیز اچھی ہے نہ کوئی چیز بُری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ Should اور Should not وغیرہ کے الفاظ در حقیقت انسان کی خواہشِ نفس کے پیدا کردہ ہیں، ورنہ اس قسم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس واسطے جو معاشرہ جس وقت جو چیز اختیار کر لے وہ اس کے لیے درست ہے۔ اور ہمارے پاس اچھائی اور برائی کے لیے کوئی معیار نہیں ہے جو یہ بتا سکے کہ فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں چیز بُری ہے اور اصولِ قانون پر مشہور ٹیکسٹ بک Jurisprudence ہے، اس میں اس بحث کے آخر میں ایک جملہ لکھا ہے کہ:

"انسانیت کے پاس ان چیزوں کے تعین کے لیے ایک چیز معیار بن سکتی تھی، وہ ہے مذہب۔ لیکن چونکہ مذہب کا تعلق انسان کے بلیف (Belief) اور عقیدے سے ہے اور سیکولر نظامِ حیات میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے، اس واسطے ہم اس کو ایک بنیاد کے طور پر نہیں اپنا سکتے"

ہمارے پاس اس کو روکنے کی کوئی دلیل نہیں ہے ایک اور مثال یاد آ گئی ہے۔ جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ جس وقت برطانیہ کی پارلیمنٹ میں ہم جنس پرستی (Homosexuality) کا بل تالیوں کی گونج

میں پاس ہوا۔ اس بل کے پاس ہونے سے پہلے کافی مخالفت بھی ہوئی اور اس بل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو اس مسئلہ پر غور کرے کہ آیا یہ بل پاس ہونا چاہیے یا نہیں؟ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی ہے اور فریڈ مین (Friedman) کی مشہور کتاب "دی لیگل تھیوری" (The Legal Theory) میں اس رپورٹ کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اس کمیٹی نے ساری رپورٹ لکھنے کے بعد لکھا ہے:

"اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ چیز اچھی نہیں لگتی، لیکن چونکہ ہم ایک مرتبہ یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ انسان کی پرائیویٹ زندگی میں قانون کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیے اس لیے اس اصول کی روشنی میں جب تک ہم گناہ (Sin) اور جرم (Crime) میں تفریق برقرار رکھیں گے کہ گناہ اور چیز ہے اور جرم علیحدہ چیز ہے، اس وقت تک ہمارے پاس اس عمل کو روکنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہاں! اگر سن اور کرائم کو ایک تصور کر لیا جائے تو پھر بیشک اس بل کے خلاف رائے دی جا سکتی ہے۔ اس واسطے ہمارے پاس اس بل کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے یہ بل پاس ہو جانا چاہیے"

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "Law" کو اسلامائز کیا جائے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ سیکولر نظام نے حصولِ علم کی جو دو بنیادیں، آنکھ، کان، ناک، زبان وغیرہ اور عقل اختیار کی ہوئی ہیں، اس سے آگے ایک اور قدم بڑھا کر وحیِ الٰہی کو بھی حصولِ علم اور رہنمائی کا ذریعہ قرار دے کر اس کو اپنا شعار بنائیں۔ ایک سوال جو اکثر ہمارے پڑھے لکھے طبقے کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ صاحب! آج سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ ساری دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کر رہی ہے لیکن ہمارا قرآن اور ہماری حدیث سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں کوئی فارمولا ہمیں نہیں بتاتے، کہ کس طرح ایٹم بم بنائیں، کس طرح ہائیڈروجن

بم بنائیں۔اس کا کوئی فارمولانہ توقرآن کریم میں ملتا ہے اور نہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے بعض لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں کہ صاحب ! دنیا چاند اور مریخ پر پہنچ رہی ہے اور ہمارا قرآن ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ چاند پر کیسے پہنچیں ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا قرآن ہمیں یہ باتیں اس لیے نہیں بتاتا کہ وہ دائرہ عقل کا ہے, وہ تجربہ کا دائرہ ہے, وہ ذاتی محنت اور کوشش کا دائرہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان کے ذاتی تجربے عقل اور کوشش پر چھوڑا ہے کہ جو شخص جتنی کوشش کرے گا اور عقل کو استعمال کرے گا، تجربہ کو استعمال کرے گا،اس میں آگے بڑھتا چلا جائے گا۔قرآن آیا ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کا دائرہ ختم ہو رہا تھا۔عقل اس کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتی،ان چیزوں کا ہمیں قرآن کریم نے سبق پڑھایا ہے۔ان چیزوں کے بارے میں ہمیں یہ معلومات فراہم کی ہیں۔

استفادہ تحریر کتاب اسلام اور ہماری زندگی از مفتی تقی عثمانی

ایمان، عقل اور سائنس

جب بھی کوئی نیا مسئلہ امت کے سامنے آیا اور کوئی ایسا موضوع چھڑا کہ جس کے دواعی کسی خاص دور میں ہی پیدا ہوئے ہوں اور اس دور کے لوگوں کو ہی اس کے ساتھ پورا اترنے کا چیلنج در پیش ہو، تو عموماً دیکھا گیا ہے کہ وہاں دو انتہائیں وجود میں آتی ہیں؛ ایک افراط اور دوسری تفریط۔ عقل اور سائنس کے معاملہ میں بھی یہاں دو انتہائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ طرزِ تفکیر جو عقل اور سائنس کے کردار کو حد سے بڑھا دیتی ہے یہاں تک کہ دین کو 'کونے' میں لگا دیا جاتا ہے بلکہ تو 'عقل اور سائنس' کے تابع کر دیا جاتا ہے، اور یہ رویہ بھی عالمِ اسلام میں کوئی کم نہیں۔ دوسری طرزِ تفکیر عموماً اس کے رد عمل کے طور پر آتے ہیں اور تاثر دیتے کہ اسلام کو 'عقل اور سائنس' ایک تابع حالت میں بھی قبول نہیں! عقل کا کردار خوب زندہ اور فعال کرنا بغیر اس کے کہ یہ 'وحی' کے سر آئے، 'مدرسہء ابن تیمیہ' کی ایک نہایت اہم جہت ہے۔ منہج اہلسنت کی اس جہت کو برصغیر کی اسلامی دنیا میں متعارف کرواتا مجلہ ایقاظ کا یہ مضمون پیش ہے۔

سائنس کی حیرت انگیز پیشرفت اور ٹیکنالوجی کی ناقابلِ یقین ترقی جدید دنیا کا سب سے منفرد واقعہ ہے اور انسانی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل۔۔۔۔سائنسی علم دراصل انسانی عقل و حواس کے مربوط (co-ordinated) استعمال کے ذریعے کیے گئے، مادی کائنات اور حیات کے مخصوص اور منظم (systematic) تدریجی مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے، جس میں مشاہدات کی بنیاد پر کیے گئے تجربات کی مدد سے کائنات اور حیات کو کنٹرول کرنے اور چلانے والی ''فطری'' اصولوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر ان فطری اصولوں کا انسانی مفاد کے لیے بروئے کار لیا جانا بشکل آلات و ایجادات، ٹیکنالوجی کہلاتا ہے، جو سائنسی علم کا ایک ''حاصل'' ہے۔ انسانی عقل جب ایک مخصوص انداز سے مادّے اور توانائی

(Matter & Energy) کے ساتھ اتصال میں آتی ہے تو سائنسی علم وجود میں آتا ہے۔ عقل ہی اس لحاظ سے سائنسی علم کے پیچھے کارفرما اصل جوہر ہے۔

دینِ اسلام جو تا قیامت زندگی کے ہر ایک شعبہ کو محیط ہے، سائنسی طریقہء مطالعہء کائنات کے مخالف ہے یا موافق، یہ البتہ اس بات پر موقوف ہے کہ اسلام عقل کے کس حد تک اور کہاں کہاں استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ کیوں کہ سائنس، عقل کے ایک مخصوص طریقہء استعمال ہی کا دوسرا نام ہے۔ اسلام کے خیر القرون کے تقریباً اختتام سے ہی عقل کے استعمال کی بابت مسلمانوں کے اندر دو انتہائیں پائی جاتی رہی ہیں، اُس ایک نقطہء وسط و اعتدال کے علاوہ، جو ہر دور اور ہر مسئلہ میں اہلِ سُنّت کا خاص وصف اور طرّہء امتیاز رہا ہے۔ چنانچہ، دورِ جدید میں سائنس کی ''عین اسلامی'' یا ''قطعاً غیر اسلامی'' ہونے کے حوالے سے دو انتہاؤں کا پیا جانا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس کے ڈانڈے، فی الواقع، عقل کی بابت کسی ایک انتہا سے جا ملتے صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے، اسلامی نقطہء نظر کے تحت، سائنس کی اہمیت پر گفتگو کئے جانے سے پہلے عقل کی حیثیت پر ہی بات کر لیا جانا موضوعِ زیرِ بحث پر ایک اچھی بنیاد فراہم ہونے میں ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ اگرچہ فی الحال، اس مسئلہ میں تفریط کا شکار مکتبہء فکر ہی ہمارا اصل مخاطب ہے۔

بلاشبہ دینِ اسلام بنی نوع انسان کو براہِ راست مخاطب کرنے اور اس کے نتیجے میں ان کے قلوب و اذہان میں ہدیت کی شمع روشن کرنے کے لئے آسمانوں سے نازل کیا گیا۔ انسان کی وہ خاصیت جسکے ذریعے وہ اس دین میں اُفتادہ روشنی کی تلاش و جستجو کرتا اور اسکے نور سے ہدیت و رہنمائی حاصل کرتا ہے وہ اسکی اپنی فطرت ہے اور اسکی عقل و خرد۔ قادرِ مطلق نے انسان کو عقل کا نور اسی لئے تو عطا کیا ہے کہ وہ اس کی روشنی میں اس (

دین کی) نُور کا سراٍ پائے کہ جس کا سنگم دونوں جہانوں میں اس کے اپنے وجود کی فلاح وکامیابی کے لئے لازمی ہے۔

عقل وفطرت کانُوراور پھررُشد وہدیت کانُور۔نُور علیٰ نُور!!!

دونوں میں ایسی زبردست ہم آہنگی(Conformity)اور مطابقت(Compatibility)ہے کہ گویا بنے ہی ایک دوسرے کے لئے ہیں۔بلکہ بلاشبہ دونوں ایک دوسرے کی وجہءِ تکمیل ہیں۔انسان کے پاس عقل نہ ہو تو پھر دین کا مصرف ہی کیا ہو؟اور اگر دین کی روشنی پاس نہ ہو تو محض عقل کی ٹمٹماتی روشنی میں انسانیت کہاں تک اپنا سفر فطرت کے اصولوں کے مطابق طے کرے؟؟؟

جس طرح کسی اندھے کے لئے روشنی کا ہونا محض بے فائدہ ہے اسی طرح یہ دین بھی کسی عقل سے کوری مخلوق کے لئے نازل نہیں کیا گے۔بصارت کی روشنی پاس نہ ہو تو باہر کے اندھیرے اُجالے میں پھر کیا فرق؟!لیکن اگر آنکھوں میں تو روشنی ہو،مگر خارج میں وہ روشنی ناپید ہو جو راستوں کو تا منزل منوّر کرتی ہے،تو ایسا آنکھ کا نُور بھلا کس کام کا؟

"بصارت"کی روشنی جب ہدایت کی روشنی سے جاملتی ہے تب بصیرت کا نُور حاصل ہوتا ہے۔

پس عقل انسان کی ایک لازمی صفت ہے،اور پیاس عقل کی ایک بنیادی خاصیت۔دین کے چشمہءِ صافی و شافی سے اس عقل کی سیر ابی اس کو ایک ایسے ذوق سے شاد کام اور ایک ایسے معیار سے ہمکنار کرتی ہے،کہ جس کے بعد اس نے تا زندگی صرف صاف شفاف چیزوں کو ہی قبول کرنا ہوتا ہے،خواہ کہیں سے دستیاب ہوں۔

الحکمۃ ضالۃ المؤمن، حیثما وجدھا فھو احق بھا(1)

اس عقل نے بہر حال کہیں نہ کہیں سے اپنی پیاس بجھانی ہوتی ہے۔ یوں اگر اس کا واسطہ اس اصیل چشمے سے نہ ہو، جو بنایا ہی اس عقل کی تطہیر کے لئے اور اس کی تشنگی کو ایک خاص و متعین جہت دینے کے لئے گیا ہے، تو پھر یہ ''ندی نالوں'' اور ''جوہڑ تالابوں'' پر منہ مارتی ہے اور وہاں سے اپنے ذوق اور خوب و ناخوب کے پیمانوں کی تشکیل کرتی ہے۔

پس عقل کی تشنگی دین کے چشمے سے بجھائی جانا اور ایک اسی سے سیرابی کے نتیجے میں اس کی پیاس کا ایک خاص ذوق متعین کیا جانا خود اس دین کا تقاضا ہے۔ جو اگر کبھی درست طور پر نبھایا نہ گیا ہو تو دین کے آگے سرِ تسلیم خم ہوتے ہوئے بھی عقل کو کہیں اور کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ پھر دین کی قدروں کی بنیاد پر دیگر سرچشمہ ہائے فکر کے ذوق و منہاج کا تعین کیے جانے کی بجائے خود انہی کے اصولوں پر یا ان سے اثر لے کر، دین کا مزاج و منہاج طے کیا جا رہا ہوتا ہے۔

دین اس لیے ہے کہ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ اور عقل اس لیے کہ وہ دین کو اپنی اوّلین ضرورت جان کر اسے تسلیم کرے۔ اس ''تسلیم'' کے عمل میں عقل کا کردار مرکزی و محوری نہ ہو تو اس ''انگارہء خاکی'' کے لیے پھر عقل کی ضرورت ہی نہ ہو۔ اس کے سوا کائنات کی ہر ایک مخلوق عقل کے بغیر بھی ویسے ہی تسلیم کی سپرَ ڈالے بیٹھی ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں عقل کا کوئی فیصلہ کن کردار نہ ہوتا تو پھر دین کی پہچان اور پیروی لازمی قرار دیکر اس مخلوق کو عقل کی نعمتِ غیر مترقبہ سے نوازا نہ جاتا۔ باقی تمام کائنات کے لیے تو تسلیم و رضا اور مطلق اطاعت و فرمانبرداری کے علاوہ کوئی چارہ اور راستہ بھی نہیں۔ اور یہ اس کے

لیے سرے سے کوئی مسئلہ بھی نہیں۔ کیونکہ تسلیم واطاعت اس کے لیے کوئی وجہء آزمائش وامتحان ہی نہیں۔ خالق وفاطر نے اس کے لیے جو راستہ اور طریقہ مقرر کر دیا ہے، اس نے اسی پر بغیر کسی انحراف کے سدا چلتے رہنا ہے۔ اُس کے لیے ''امرِ تکوینی'' ہی ''امرِ تشریعی'' ہے۔ یوں ''پہچان'' اور پیروی'' اس کا مسئلہ ہی نہیں۔

جو چیز کہ کائنات میں خدائے لم یزل کی پہچان اور تسلیم و بندگی کو سب سے بڑا امتحان اور سب سے کٹھن آزمائش بناتی ہے، بلکہ یوں اس کائنات کے وجود میں آنے کا ایک سبب ٹھرتی ہے، وہ انسان کو عطا کی گئی عقل و خرد ہے اور اُس کا شعور۔

ایک پہچان وہ ہے کہ خالق ومالک کی بابت ازل سے ہی کائنات کے ذرے ذرے کی گھٹی میں پڑی ہوی ہے اور جس میں ہوش و خرد کا کوئی دخل ہے نہ ضرورت۔ اور ایک یہ معرفت و بندگی کا مقدمہ ہے کہ عقل و شعور کا اصل میدان ہے اور انسانیت کا یہاں سب سے بڑا امتحان۔

ایک بندگی ''وہ'' ہے جس نے بہر حال ہونا ہی ہونا ہے، اور جس سے سرتابی محال ہے۔ اور ایک بندگی ''یہ'' ہے جو اس کائنات کو اس کے وجود کا حسن بخشتی ہے اور اس کی غیت کا جواز عطا کرتی ہے۔

ایک کائنات کی فطرت ہے اور ایک انسان کی فطرت۔ کائنات کی فطرت یہی ہے کہ وہ کچھ لگے بندھے اصولوں کے تحت چلتی ہے اور اپنے مالک کے حکم کی بجاآوری میں لگی رہتی ہے۔ بس یہی فطرت اس کائنات کا کل سرمایہ ہے۔ یہی اس کی ''عقل'' ہے اور یہی اس کا ''دین''۔

انسان کی فطرت یہ ہے کہ اس کے اندر اپنے خالق و مالک سے رغبت کا دیا روشن ہے، اور طبعاً اچھائی کو پسند کرتا ہے اور برائی کو ناپسند۔ لیکن محض اسکی فطرت اسے اسکے خالق و مالک تک درست طور پر پہنچا آنے کے لیے کافی نہیں۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ خود اسکے پاس کوئی ایسا آلہ یا اوزار یا سواری موجود ہو جو اسے ان راستوں کی تلاش میں مدد دے جو خالق تک پہنچاتے ہیں۔

عقل ہی وہ چیز ہے جو _ دین کی رہنمائی (Road Map) اگر موجود ہو تو _ انسان کو اس کی فطرتِ صالحہ کے تحت اس کے مالک کی طرف کشاں کشاں چلاتی ہے۔

پس ان تینوں چیزوں کی اپنی اپنی ایک اہمیت ہے اور ایک الگ کردار۔ یعنی انسان کی فطرت، اس کو عطا کی گئی عقل اور عقل کی رہنمائی کے لیے آسمان سے نازل کیا گیا دین۔

فطرت تو انسان کو جو ودیعت کر دی، سو کر دی گئے۔ اب اس نے مختلف رنگوں، جذبوں اور کیفیات میں انسان کے اندر ابھرنا ہے، اور اگر خود ہی مسخ نہ کر دی گئی ہو تو، انسان کے اندر خیر کی تلاش میں نکلنے اور چلنے کا تحرّک پیدا کرنا ہے۔ لیکن اگر فطرت اور وجدان کے ذریعے ہی خیر اور حق تک پہنچا جاسکتا ہے تو سوال پھر وہی ہے کہ پھر عقل کی کیا ضرورت؟ پھر اگر جواب میں عقل کے کچھ ''دیگر'' کام گنادیے جائیں تو ''حق تک رسائی'' کی طرح ''یہ'' کام بھی فطرت ہی کے کھاتے میں کیوں نہیں ڈالے جا سکتے؟ اوّل الذکر کی طرح یہ اتنے غیر معمولی تو بہرحال نہیں ہوں گے کہ فطرت سے انکی ذمہ داری نہ اُٹھوائی جا سکی؟!! پھر ایسی صورت میں باقی مخلوق اور انسانوں کی ''حیثیتِ تکلیفی'' میں کس طرح امتیاز کیا جاسکے گا؟

انسان کی فطرت اس کے اندر آپ سے آپ بولتی اور خود بخود جھلکتی ہے۔انسان اپنی فطرت کے تابع ہوتا ہے کیونکہ اس کی حیثیت ''غیر ارادی'' کی سی ہوتی ہے۔البتہ عقل جو فطری محرکات کے تحت کام کرتی ہے اس کی حیثیت ضرور ''ارادی'' ہوتی ہے،اور یوں وہ انسان کے تابع ہوتی ہے۔انسان کے اختیارات اور ان کے دائروں میں کیے گئے اعمال انسان کے ارادوں سے ہی متعین اور کنڑول ہوتے ہیں۔اور ارادے عقل کی کمین گاہ میں پرورش پاتے ہیں۔وہ ارادہ ہی کیا جو عقل کے بغیر وجود میں آجائی؟اور اگر قوّتِ ارادہ ہی نہ ہو تو پھر اختیار کیسا؟ نیز اختیار کے بغیر کسی آزمائش یا امتحان کا کیا سوال؟ پھر ''آزمائش بلا اختیار'' کے بعد ثواب وعقاب، جنت جہنم، حشر نشر اور بعث بعد الموت کا کیا مقصد؟؟

پس دین و دنیا میں انسان کے اختیار و تکلیف کا براہِ راست اور اصل تعلق اس کی عقل سے ہے۔اور کیوں نہ ہو، کہ یہی تو اس مخلوق کا اصل وصف اور دونوں جہانوں میں اس کا طرّہء امتیاز ہے، جس کے سبب جہاں ایک طرف یہ خلافت فی الارض کی حقدار ہے، وہیں آسمانی بہشت کی وراثت کی تنہا امیدوار بھی ہے۔۔۔، اس صورت میں کہ عقل کی تکمیل اور رہنمائی کے لیے آسمان سے اتری ہدایت کا سرا تھام لیا جائے۔

ایمان کوئی جبری چیز نہیں ہے!

لیکن کیا عقل کی تکمیل اور رہنمائی اس (عقل) سے عدمِ مطابقت اور اختلاف و تضاد رکھتے ہوئے یا عقل کی فطرت کو نظر انداز کرتے ہوئے ہوسکتی ہے؟ پھر وہ رہنمائی ہی کیا ہوئی؟ کیا کسی راستہ بھٹکے ہوئے یا منزل کی تلاش میں نکلے ہوئے کی رہنمائی جبراََ کی جاسکتی ہی؟ وہ ذات کہ جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو عقل کی

نعمت سے سرفراز کی۔۔۔۔ وہ ذات انسان کو خوب جانتی ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ (ق–16) ترجمہ: ''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں وہ ہم ہی جانتے ہیں۔''

اس ذات نے پھر اپنے پاس سے اپنی اس مخلوق کے لئے ہدیت ورہنمائی نازل فرمائے۔ خلاق العلیم اور حکیم و خبیر کی ذات سے بعید اور شان سے فرو تر ہے کہ وہ دو چیزوں کو خالص ایک دوسرے کے لئے بنائے اور دونوں میں پھر بھی عدمِ مطابقت اور تضاد یا اختلاف پیا جائے۔ چنانچہ دین پر ایمان لانے اور اس کو من و عن تسلیم کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس کو بغیر سمجھے بوجھے، اس کی حقانیت کی دلالت کو بغیر جانے اور اس پر غور کیے بغیر ''بس'' مان لیا جائے!! ایمان کوئی جبری چیز نہیں ہے۔۔۔۔ نہ خارجی طور پر، نہ داخلی طور پر۔

معاذاللہ دین کوئی اس لیے تھوڑی آیا ہے کہ وہ عقل کو چاروں شانے چت کر کے شکستِ فاش سے دوچار کر دے۔ جیسا کہ بعض مکتبہ ہائے فکر کی اپروچ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین میں اور عقل میں خدا واسطے کا بیر ہے! اور جب تک عقل کو چاروں کھونٹ باندھ کے اور اس کی مشکیں کس کے بالکل ہی عاجز و درماندہ (بلکہ ''ذلیل و خوار'') نہ کر دیا جائے تب تک دین کا حکم ہونا اور عقل پہ اس کا بالادست ہونا متحقق نہیں ہو سکتا..!!

اس طرح کی ضرورت ان مذاہب کو پڑتی ہے جن میں تحریف ہو چکی ہو اور عقائد و احکام حد درجہ مسخ ہو چکے ہوں۔ جیسا کہ عیسائی ایمانیات کی بنیاد یہ ہے کہ وہ ایمانیات کو ماورائے عقل کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تصوّرِ الٰہ اس قدر غیر منطقی و متضادِ عقل ہے کہ اس کو ''سمجھانے'' کے لئے ان کے پاس واحد حل یہی ہے۔

دین کا عقل سے ٹکرؤ یا تصادم تو خیر کیا ثابت ہونے والی چیز ہے، دین کی سب سے بڑی مؤید اور اس سے ہم آہنگ چیز خود عقل ہی ہے۔ دین کو واجب التسلیم ماننے کے باوجود اُس کا خلافِ عقل یا ماورائے عقل ہونا، اگر عقل سے ثابت ہو سکتا ہے تو سب سے پہلے خود یہی بات دین اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔ ورنہ دین میں کہاں آیا ہے کہ وہ خلافِ عقل ہی ہے؟ یعنی ان کے نزدیک دین جس چیز کے خلاف اور ماوراء ہے، خود اسی کے ذریعے وہ دین کا اس کے خلاف ہونا ''ثابت'' کرتے ہیں !!! سبحان اللہ و بحمدہ۔

چنانچہ دین کی آمد کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ عقل کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ نہ دین کو تسلیم کرنے میں عقل کے زیر ہو جانے کو ماننا ہی تسلیم کا لازمی تقاضہ ہے۔ دو چیزوں میں ''باہمی اتفاق'' اور ''قبولیت'' کے نتیجے میں بھی تو تسلیم کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ عقل کا دین کے ماتحت ہونے کے تقاضے سے نہ تو اس کا عدم استعمال لازم آتا ہے نہ غیر فعال ہو جانا۔ البتہ اس کے استعمال کی کچھ جہتیں متعین ہو جانا ضرور لازم آتا ہے۔ اب یہ جو ''اتفاق'' اور ''قبولیت'' ہے، یہ مجرد تسلیم برائے تسلیم سے بڑھ کر کوئی چیز ہے۔ اس میں عقل کا انبساط ہے نہ کہ انقباض۔ صدر کا انشراح ہے نہ کہ ضیق۔ دل کا اطمینان ہے نہ کہ تشویش۔ اور فکر کی بالیدگی ہے نہ کہ پژمردگے۔ اور یہی دین کی آمد کا مقصود بھی ہے کہ عقل اس کے ساتھ اتصال کی بدولت جِلا اور افزائش پائے، نہ کہ خود نقصان میں پڑ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل کے نقصان میں تو خود دین کا نقصان ہے۔

بلاشبہ دین میں ایک کشش، ایک جاذبیت، اور ایک تاء ثیر ہے۔ عقل کو جب دین کی معنی آفرینی سے صحیح معنوں میں اتصال کا موقع ملتا ہے تو وہاں وہ اپنے لیے ایک زبردست ہم آہنگی، مطابقت اور اتفاق پاتی ہے۔ چنانچہ اس کے پاس سوائے ایک بے ساختہ قبولیت کے کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں رہتا۔ ان معنوں میں بے

شک یہ عقل کی تسلیم ہے جو کہ دراصل مطلوب ہے۔اور ایک وہ تسلیم ہے جس میں عقل کا کوئی قابلِ ذکر کردار ہی نہیں ہوتا۔بلکہ وہ بے چاری تو ایک طرف ''محوِ تماشائے لبِ بام'' ہوتی ہے۔ایسی تسلیم جسکی بنیاد میں ''اتفاق'' اور ''قبولیت'' ایسی عقلی شراکت نہیں پائی جاتی، وہ پھر تشکیک کے چند جھٹکوں سے زمین بوس بھی ہو جاتی ہے،اور یا پھر اس میں ملاوٹ کی آمیزش ہو جاتی ہے،اگرچہ ظاہراًدعوائے تسلیم برقرار ہی رہے۔

حق اور خیر کے اجالوں کی طرف آنے میں عقل کا کردار:

دین جو کچھ بھی ہے وہ بلاشبہ آسمانوں سے ہی نازل ہوا ہونا ہے،اور یوں خدائی ہدایت ہونے کے ناتے عقل کو ہمیشہ اس کے تابع ہی رہنا ہے۔لیکن دین کیا ہے اور اس پر انسان نے کیسے چلنا ہے،اس کا فیصلہ بھی انسان نے اپنی عقل کے ذریعے ہی کرنا ہے خواہ اس تک دین رسول کے ذریعے پہنچا ہو یا رسول کے کسی متبع کے ذریعے۔

اب جیسا کہ انسان کو دنیا میں حق و باطل میں سے کسی ایک کو اپنا لینے کا جو اختیار عطا کیا گیا ہے وہ اس کے صاحبِ عقل و ہوش و حواس ہونے کی بِناء پر ہے،لہٰذا اس کی عقل و حواس کا اصل امتحان بھی اسی مرحلے میں،اپنے اصل معنوں میں،مراد اور درپیش ہوتا ہے۔(قبولیتِ حق کے)اس مرحلے کے بعد بھی گو عقل اپنی رسائی کے خوب خوب جوہر دکھاتی ہے،جسے فقاہت یا تفقہ فی الدین سے تعبیر کیا جاتا ہے،لیکن یہ اس کا اصل امتحان نہیں ہے،اگرچہ اپنی جگہ حد درجہ مطلوب ہے۔تاہم یہ معاملہ عقل کی استعداد اور قابلیت پر

منحصر ہے جو فرد، فرد میں مختلف ہوتی ہے۔البتہ جہاں تک حق و باطل کی آزمائش کا معاملہ ہے تو یہاں آدمی کا ایک کم از کم حد تک صاحبِ عقل ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔اس مرحلے میں آدمی کے مکلف ہونے نہ ہونے کا معاملہ اس کے صاحبِ عقل ہونے یا نہ ہونے سے بالترتیب متعلق ہی۔۔۔نہ کہ صاحبِ عقل ہونے کے بعد عقل کی استعداد سے۔اس پہلے مرحلے میں ہی آدمی اگر اپنی عقل کے کردار سے دستکش ہو کر تسلیم برائے تسلیم اختیار کر لے تو اس کے بعد عقل کے لیے پھر بچا ہی کیا جہاں وہ اپنا وہ کردار ادا کر سکے جس کے لیے دراصل بنائی گئی ہی؟اصل مسئلہ تو ایک چیز کو بطور ''کل،، تسلیم کرنے کا ہے جس کے بعد اس کے اندر کا ہر ایک جزو آپ سے آپ تسلیم ہو جاتا ہے، جس میں کہ عقل کو کوئی بہت زیادہ تگ و دو کرنے کی ویسے ہی ضرورت نہیں ہوتی۔

پس باطل کی ظلمتوں سے حق اور خیر کے اجالوں کی طرف آنے میں ہر انسان سے ایک خاص درجہ کا کم از کم عقلی کردار بہر حال مطلوب ہوتا ہے۔جو اگر ادا کیا جا رہا ہو تو تب ہی ''دین کا مسئلہ'' زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ قرار پاتا ہے،اور حق و باطل کی ایک جیتی جاگتی کشمکش کے روپ میں انسانیت کے وجود کا مرکزی عنوان ٹھہرتا ہے۔

یہ البتہ ایک الگ موضوع ہے کہ عقل کو کس طرح اس انداز میں خطاب کیا جائے کہ وہ اپنے اور دین کے مابین زبردست ہم آہنگی کو فطری انداز میں دیکھ لے۔اور پھر جو کوئی اس دین کو قبول کرے تو ''سمجھ کر''، اور جو کوئی انکار کرے تو اچھی طرح ''جان کر''۔بنیادی طور پر یہ موضوع دعوت اور اس کے طریقہ کار سے متعلق ہے۔

قلوب اگرچہ اللہ ہی کی قدرت واختیار میں ہیں اور دلوں کو پھیرنا اسی کی مشیئت کے تحت ہے۔ لیکن دعوت کی ''ناکامی'' یا ''کامیابی'' کا ایک بڑا تعلق اس اندازِ خطابت سے بھی ہے جو عقل کے ساتھ رَوا رکھا جاتا ہے۔ یہ اکثراوقات خود عقل سے اس کا اپنا کردار معطل کر دینے کی دعوت ہوتی ہے، نہ کہ (دین قبول کرنے میں) اپنا کردار ادا کرنے کی!

چنانچہ دین کی طرف لانے میں اس طرح کی اپروچ پیدائشی مسلمانوں پر تو کسی حد تک اثر رکھتی ہے، کہ وہ پہلے سے ہی دین کے ساتھ عقیدت کے جذبات سے سرشار ہوتے ہیں۔ البتہ اس طرح کے رجوع الی الدین سے خود دین کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہو پاتا۔ بلکہ بسا اوقات فکری عمل میں الٹا ایک جمود، تنگ i، انقباض اور سختی میں اضافے کا باعث بن جاتا ہے۔

البتہ غیر مسلموں کے لیے اس طرح کی دعوت میں (اگر کہیں غیر مسلموں کو دین کی دعوت دی جا رہی ہو!) کوئی خاص اثر اور جاذبیت نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ موجودہ دور میں مغربی ممالک کے لوگوں کی اسلام کے اندر بڑھتی ہوئی دلچسپی جہاں ایک طرف گلوبلائزیشن کی مرہونِ منت ہے، کہ جس کے نتیجہ میں تحقیق اور جستجو کا مادہ رکھنے والی اقوام کو خود اسلام کے زریں اور آفاقی اصولوں سے آشنا ہونے کا موقع ملا ہے، وہاں دوسری طرف انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور دہشتگردی کے خاتمے کے نام پر کفار کی طرف سے عالمِ اسلام پر مسلط کی گئی جنگ سے پیدا شدہ مباحث اور مکالمہ کا بھی اس میں اہم کردار رہا ہے۔ گویا اس تمام منظر نامہ میں قبولیتِ اسلام کی بڑھتی ہوئی لہر خود مسلمانوں اور ''دعوت'' کی بجائے حالات کی پیدا کردہ ہے۔ چنانچہ نومسلموں کی شخصیت کی انتہائی متوازن، متحرک اور معقول دینی جہت کا مشاہدہ کرکے جو ہم اکثر حیران رہ جاتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا قبولِ اسلام، عقل و خرد اور دین کے ایسے باہمی

اتصال و تعلق کا نتیجہ ہوتا ہے جو انسان پر نئے جہانِ معنی آشکار کرتا اور نفس، خدا اور کائنات کی صحیح پہچان دیتا ہے۔

جب تک عقل دین اسلام کی وسعت و جامعیت اور دنیا کی زندگی کے ساتھ اس کے تعلق (Relavance) سے بہرہ ور نہیں ہوئی ہوتی ہے تب تک اس کی تگ و تاز اور پرواز کا دائرہ نہایت محدود ہوتا ہے۔ اور اس کی سلامت فکر کے کئی کواڑ بدستور مقفل ہی رہتے ہیں۔ تا وقتیکہ دستیاب بہت ساری کنجیوں میں سے وہ واحد کنجی تلاش کر لی جائے جو اکیلی اس قفل کو کھولنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ چنانچہ عقل اور دین کا یہ Lock & Key Model جو کہ اپنی نوعیت میں نہایت خاص (selective) ہوتا ہے، جب درست زاویے سے روبہ عمل آتا ہے تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب "حجابات" اٹھ جاتے ہیں اور ابدی حقائق کا "کشف" ہونا شروع ہوتا ہے۔ تب انسان پر اپنی اور اپنے معبود کی ہستی کی حقیقت کھلتی ہے۔ اور وہ بے اختیار و بے ساختہ اس دین کی سچائی و آفاقیت پر ایمان لے آتا ہے۔

ایمان اور عقل کے تعلق کے بارے میں موجود افراط و تفریط

دین کا فطرتاً بمطابق عقل ہونا (یا دونوں کا باہم مطابق ہونا) ایک الگ چیز ہے، اور کسی کی طرف سے دین کا مدار عقل پر ہونے کا دعوٰی ایک بالکل اور بات۔ اول الذکر سے دوسرا قطعاً لازم نہیں آتا۔ جو چیز پہلے کہی گئی اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ دین انسان ہی کے لئے نازل ہوا ہے، اور انسان کا مکلف ہونا اس کے صاحبِ عقل ہونے کی وجہ سے ہے، اسلئے دین اور عقل میں ایک نہایت خاص اور گہرا تعلق ہی۔۔۔ اس

طرح سے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں اور دونوں میں کا ہر ایک، دوسرے کی موجودگی میں ہی کار آمد ہے۔ چنانچہ دین کو قبول کرنے اور اس پر چلنے میں، ہر جگہ اصل کردار عقل کا ہی ہے۔ جبکہ آخر الذکر بات کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ دین کی جو بات عقل کے مطابق ہو گی وہی قابلِ قبول ہو گے، ورنہ نہیں۔ یا یہ کہ جو بات عقل کے مطابق ہو گی وہی دین ہو گے، ورنہ نہیں۔ پہلی بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عقل اور دین دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جبکہ دوسری بات سے یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ عقل ہی مآخذِ دین ہے۔ (فلاسفہ اور معتزلہ کا مشہور مذہب)۔

لٰہذا یہ اندیشہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ دین و شریعت میں از اول تا آخر عقل کا کردار سراہنے سے دین پر عقل کی بالادستی اور اس کا حکم ہونا لازم آتا ہے۔ پھر اس اندیشے کی بنیاد پر عقل کا کردار ہی معطل قرار دینا (بطور خاص ایمان لانے اور دین قبول کرنے کے معاملے میں) بناء الفاسد علی الفاسد کی ایک مثال ہے اور اس معاملے کی ایک دوسری انتہا۔

دین کا عقل کے مطابق ہونے سے ہماری مراد اہواء اور خواہشات کے مطابق ہونا نہیں ہے۔ کیونکہ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ عقل میں صرف اہواء و خواہشات ہی پائی جائیں اور وہ فطری سلامتی سے بالکل ہی محروم ہو۔ نہ عقل کا دین کے تابع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دین کی ہدایت کا سرا پانے کے لئے اب عقل کو کوئی کردار ادا کرنا ضروری ہی نہیں۔ (''پیدائشی مسلمانوں'' کو ویسے یہ دین اس مرحلے سے گزرے بغیر ہی مل جایا کرتا ہے! اسی لئے ''دین قبول کرنے میں عقل کے کردار'' پر ان کو ایک اچنبھا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔)

چنانچہ عقل کا دین کے تابع ہونا اور دین کا عقل کے مطابق ہونا دو باتیں ہیں جو اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں، اور جن میں باہم کوئی ٹکراوٴ، تصادم یا منافات نہیں ہے۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو یہ دو باتیں دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ کیوں کہ عقل دین کے تابع اسی لئے تو ہے کہ وہ اس کے عین مطابق ہے۔ یہ مطابقت نہ ہو تو عقل کے پاس اس اتباع کی ''وجہ'' ہی کیا ہو؟!! وہ عقل ہی کیا جو کسی کی یونہی تابعداری کر جایا کرے؟!

عقل اور دین کے درمیان دُوری اور عدمِ تعلق کا منہج دراصل فلسفیانہ طریقہء تفکیر کے ردِ عمل میں سامنے آنے والے ایک مفروضہ (Pre-assumption) کا پیدا کردہ ہے جو بعض دینی حلقوں کی جانب سے اسلام کے عقائد و ایمانیات کی بابت بطور اصل الاصول اختیار کر لیا گیا ہے۔ یہ مفروضہ کچھ یوں ہے کہ، عقائد اور ایمانیات مکمل طور پر عقل و سمجھ سے ماوراء ہوتی ہیں، اور لہٰذا غیر محتاجِ دلیل ہوتی ہیں۔

اگرچہ واضح طور پر اور براہ راست یہ مفروضہ اسطرح پیش نہیں کیا جاتا، لیکن جو کچھ بھی عقل و دین کے باہمی تعلق (بلکہ عدمِ تعلق!) کے حوالے سے متذکرہ حلقوں کی طرف سے خیال آرائی کی جاتی ہے، اسکی روشنی میں یہ مفروضہ بطور ''مسلّمہ'' پسِ پردہ صاف طور پر کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ کہنا کہ ایمان و تسلیم کبھی دلیل سے پیدا نہیں ہو سکتے بلکہ خود دلیل کی بنیاد ایمان و تسلیم ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی کو دلیل کی بنیاد پر مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ کہ، موجودہ سائنسی حقائق و مسلمات (Existing Scientific Facts) اور دین میں مطابقت اور ہم آہنگی ثابت کرنا، دین کو عقل کے تابع کرنے کے مترادف ہے کیونکہ سائنس خود عقل کے تابع ہے۔۔۔

یہ سب ایسے ''شگوفے'' ہیں جو اسی مذکورہ بالا مفروضہ کے شجر سے ہی پھوٹ سکتے ہیں۔ ان دونوں نظریات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دین کے عقائد پر ایمان، عقل کے راستے سے گزر کر کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس لازم ہوا کہ ایمان عقل سے ماوراء کوئی شے ہے، جس میں عقل کا اپنا کوئی کردار نہیں ہوتا۔! انسان کو چاہیے کہ دین کی دعوت پہنچتے ہی عقل کو فوراََ ''بالائے طاق'' رکھ دیا کرے، تاکہ ایمان قبول کرنے میں حائل ''سب سے بڑی رکاوٹ'' دور ہو سکی!!!

یعنی جو چیز در حقیقت جس چیز کو حاصل کرنے اور اسے اپنائے رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے، اسی کا نہ ہونا ان کے یہاں اس مقصد کے حصول کے لئے لازمی ہے!!

چنانچہ دنیا کے عرصہءحیات میں اب انسانی عقل کا کردار (بطور آزمائش) اس کا ترک اور عدمِ استعمال ٹھہرا!! یہ تو واقعی بڑی آزمائش ہے!!!

یہی نہیں بلکہ آگے چل کر یہی ترکِ عقل، ترکِ دنیا کا بھی مقدمہ بن جاتا ہے (سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کی مخالفت کی صورت میں۔) اور اسکو ایک باقاعدہ شرعی حیثیت بلکہ ''فرضیت'' حاصل ہو جاتی ہی! گویا تمام ترزہد و تقویٰ ایک عقل کو ترک کر دینے کا نام ہی!!!

جو عقل دین میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنے پر تیار نہ ہو، وہ پھر اسی لائق ہے کہ دنیا میں بھی عاجز و درماندہ ہی رہے۔

تقویٰ و زہد بہر حال کفرانِ نعمت سے قطعاََ ہٹ کر کوئی اور ہی چیز ہے۔ عقل کو ''عقلی طور پر'' چھوڑ دینے سے بڑھ کر کفران نعمت بھلا اور کیا ہو سکتا ہے؟!

چنانچہ سائنسی مطالعہء کائنات کی مخالفت کی وجہ جہاں ترکِ عقل کا ''تقاضا'' ہے، جو کہ ایمان و تسلیم کی ''شرط'' ہے! وہیں دنیاوی وسائل وذرائع پر کنٹرول اور سائنس و ٹیکنالوجی کے استعمال کی ممانعت اسی ترکِ عقل سے لازم ٹھہرتی ہے، جو پھر زہد و تقویٰ کی بنیاد ہے!! گویا، معاذاللہ اسلام کا دینی پہلو بھی عقل سے خالی اور دنیاوی پہلو بھی عقل سے محروم!

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ

عالمِ غیب کی تفصیلات پر ایمان کی نوعیت:

دین اور اسلام کی اصطلاح میں ایمان یقینا کسی ایسی چیز کا نام ہے جو اس مادی دنیا سے پرے اور ماوراء کسی ہستی اور جہان سے متعلق ہے۔ اس دنیا اور کائنات کے اندر اندر چیزوں کی پہچان اور ان کا ادراک ان معنوں میں ایمان ہر گز نہیں۔ بلکہ یہ مشاہدہ کہلاتا ہے۔ لہٰذا ایسی چیز کو ماننا جس کا مشاہدہ نہ ہو سکتا ہو اور جو بظاہر محسوس نہ ہو سکتی ہو، ایمان کہلاتا ہے۔

''ایمان بالغیب'' بھی اس کو انہی معنوں میں کہا جاتا ہے۔ اس بات کو مزید گہرائی میں جا کر یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان صرف ان چیزوں کا مشاہدہ کر سکتا جو اس کے حواس (senses) کے دائرہء کار میں آتی ہیں۔ رہ گئے وہ امور جو انسان کے حواس کے دائرہء کار میں نہیں آتے اور لہٰذا قابل مشاہدہ نہیں تو ان کی بابت آراء رکھنے میں ایک طرف تو فلاسفہء مغرب ہیں جو یا تو سرے سے ایسے امور کے پائے جانے کے انکاری ہیں اور یا پھر ان امور کو انسانی عقل و فہم کے ادراک میں آجانے سے قطعاً ماوراء اور ناقابلِ رسائی قرار دیتے

ہیں۔اب چونکہ یہ فلاسفہ وحی، پیغمبر اور کسی بھی قسم کے فرستادہء خداوندی کو تسلیم نہیں کرتے لہٰذا ان امور کا اعتراف محض ایک ایسے عالم کا اثبات ہے جہاں ''حقیقت'' جاری و ساری ہوتی ہے اور جو ''عالمِ مظاہر'' سے قطعاً الگ ایک جہان ہوتا ہے۔البتہ یہ عالم کیا ہے، اسکی تفصیلات و جزئیات کیا ہیں اور ان تک رسائی کیسے حاصل کی جاسکتی ہی۔۔۔یہ گروہِ فلاسفہ ان سوالات کے جوابات دینے والے کسی بھی ذریعہ علم کا انکاری ہے۔

دوسری طرف وہ گروہ ہے جو عالمِ مادی و طبیعی کے علاوہ عوالم اور عوامل پر بھی یقین رکھتا ہے اور ان کو ایک نظام (system) کی صورت میں بہ تفصیل پیش بھی کرتا ہے۔لیکن اس غیر مادی نظام کی حقیقت اور اس کے اجزاء کے باہمی تعلق کی نوعیت کو ''بوجوہ'' انسانی عقل سے بالاتر گردانتا ہے، لہٰذا اس نظام کی تمام تر تفصیلات کو جوں کا توں ''بلا سوچے سمجھے'' قبول کرلینا ہی ''ایمان و تسلیم'' کا تقاضہ سمجھتا ہے۔مذکورہ اقدارِ مشترکہ کے باوصف اس دوسرے گروہ کے لوگ مزید گروہوں میں تقسیم پائے جاسکتے ہیں:

اول وہ لوگ جو اپنے عقائد اپنی دیومالا ((Mythology سے اخذ کرتے ہیں اور یوں ان کی ایمانیات اور دیومالا میں برائے نام فرق پایا جاتا ہو۔ مثلاً قدیم اہلِ یونان اور اہلِ ہند کی دیومالا اور عقائد کا مطالعہ کیا جائے تو دونوں ایک ہی تصویر کے دورخ نظر آئیں گے۔اب دیومالا چونکہ ایک فوق الفطرت دنیا کا احوال ہے، جسے اگر جادونگری ((wonder land سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ قرین قیاس ہوگا، تو لہٰذا اس میں کسی بھی وقت کچھ بھی ممکن ہوتا ہے۔چنانچہ بہت سے دیومالائی واقعات اور کرداروں میں جابجا عقلی تناقضات پائے

جاتے ہیں، جن کی دیومالا کے اندر سمانے کی پوری گنجائش ہوتی ہے۔ کیونکہ دیومالا کسی عقلی یا منطقی ضابطے کے تحت نہیں ہوتی۔ یہ تناقضات پھر وہاں سے عقائد میں در آتے ہیں۔ جس کے الزام سے بچنے کے لیے دیومالا اور ان عقائد کو ہی ماورائے عقل فرض کر لیا جاتا ہے۔ گویا مافوق الفطرت سے مافوق العقل ہونا لازم آنے کا کلیہ ''عقلی طور پر'' اختراع کر لیا جاتا ہے۔

دوسرے وہ لوگ جو کسی آسمانی شریعت اور پیغمبر و وحی وغیرہ پر یقین رکھتے ہوں لیکن دین میں تحریف ہو جانے کی وجہ سے عقائد و احکام حد درجہ مسخ ہو چکے ہوں۔ اور معاملہ یہ صورت اختیار کر چکا ہو کہ عقائد پر ایمان رکھتے ہیں تو عقل ہاتھ سے جاتی ہے اور اگر عقل اختیار کرتے ہیں تو ایمان جاتا رہتا ہے۔ جیسا کہ عیسائیت اور یہودیت کے عقائد ہیں۔ عیسائیت میں خدا کا بیٹا اور بیوی ہونے کا تصوّر اس قدر غیر منطقی اور متناقضِ عقل ہے کہ اس عقلی قضیہ (یعنی یہ کہ کسی چیز کے اندر تناقض کا ہونا ایک عقلی معاملہ ہی) سے ''عقلاً'' جان چھڑانے کے لیے عقائد کو ہی عقل سے ماوراء قرار دے دیا گیا۔ تاکہ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔

تیسرے وہ لوگ جو ایسی روحانیت کے قائل ہوں جس میں قلبی وارداتوں یا وجدان کی صورت میں احوال، کیفیات اور حقائق منکشف یا القا ہوتے ہوں، اور اس میں عقل کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ لہٰذا دین اور اس کے حقائق بس ایک روحانیت سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوں، جس کا کام مادے کی نفی کرنا ہو نہ کہ اس کی تکمیل کرنا۔ چنانچہ دین کو محض ایک روحانی چیز سمجھ کر اور عقل کو صرف ایک مادی چیز خیال کر کے دونوں کی راہوں کو الگ رکھنا خود اس دین کی بقا کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہو۔!!

اس تیسری قسم میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو وحی، پیغمبر اور رسالت و آخرت پر تو ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن روحانیت کے ''شدید تقاضوں'' کے تحت عقل کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے، کہ جن کے لیے وہ عطا کی گئی ہے، فارغ کر بیٹھتے ہیں۔ اب چونکہ وحی اور نبوّت کا کسب بذریعہ عقل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ ایک خالص وہبی چیز ہے۔ اور دوسرے یہ کہ عالمِ غیب کے تمام برگزیدہ حقائق اور وقائع صرف وحی کے ذریعے ہی بزبانِ نبوّت معلوم ہو سکتے ہیں اس لیے ان لوگوں کو خیال گزرا کہ عقل اور وحی دو ایسی الگ الگ چیزیں ہیں جن کو آپس میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اب جو چیز عقل کی گھڑنت سے وجود میں نہیں آئی ہے وہ لازماً عقل سے ماوراء ہی کوئی شے ہونی چاہیے !! لہٰذا عقل کا کام بس صرف سرنگوں ہونا ہے نہ کہ وحی اور نبوّت کو پہچاننا، یا اس کے ذریعے سے معلوم شدہ غیبی امور میں ربط و ضبط اور نظم تلاش کرنا، کیونکہ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہے !۔ مزید یہ کہ اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ مادی حقائق (جو کہ انسان کو مشاہدے اور عقل سے حاصل ہوتے ہیں) اور روحانی یا غیبی حقائق (جو بذریعہ وحی معلوم ہوتے ہیں) کے درمیان ربط اور تعلق تلاش کیا جائے !!۔ اور غلط ترین بات یہ ہے کہ مادی حقائق کو غیبی حقائق پر ایمان لانے کی بنیاد یا حوالے کا نقطہ (point of reference) بنایا جائے !!!

وحی اور نبوّت بلاشک وشبہ ایسی چیز نہیں جو عقل کے ذریعے کسب کر لی جائیں۔ لیکن اس سے یہ کہاں لازم آ گیا کہ وحی کے دستیاب ہونے کے بعد اب اس کی پہچان اور حقانیت کی معرفت حاصل کرنا بھی عقل کے بس کی بات نہیں ؟ آخر ایمان لانے کا عمل پہچان کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے ؟ اور پہچان کا کام عقل کے بغیر کیونکر ؟؟

چنانچہ نہ تو حواس سے ماوراء ہونے کا مطلب لازمی طور پر عقل سے ماوراء ہونا ہے اور نہ عالمِ غیب کی تفصیلات کا کسب بذریعہ عقل نہ ہو سکنے سے ہی یہ مطلب نکلتا ہے۔ اگر کسی چیز تک عقل خود سے نہیں پہنچ سکتی (یعنی صرف ان معنوں میں وہ ماورائے عقل ہے) تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اب وہ عقل کی سمجھ میں ہی نہیں آسکتی اور عقل کے مطابق نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ عالمِ غیب کی تفصیلات پر ایمان رکھنا، ایمان بالغیب، حواس کے نارسا ہونے کے حوالے سے ہے نہ کہ عقل کے۔ کیونکہ عقل حواس کے راستے سے نہ سہی، وحی کی بتائی گئی تفصیلات کے ذریعے اس عالم تک بہر حال رسائی حاصل کر لیتی ہے، جس کی پھر اپنی معقولیت، نظم و ضبط، جامعیت اور دنیائے مادہ سے اس کا ربط و تعلق عقل کو سرِ تسلیم خم کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ عالمِ غیب کو پہچاننے اور قبول کرنے میں عقل کا یہ کردار نہ ہو تو ابدی حقائق کی متلاشی، انسان کی پیاسی فطرت دین حق، دین محرّف اور دیو مالا کی ایمانیات میں پھر کیسے فرق روا رکھ سکے؟ اور ان تینوں میں سے کسی کو قبول کرنے اور کسی کو رد کرنے کی پھر اس کے پاس بنیاد کیا ہو؟؟

الہامی مذہب ہونے کے باوجود اسلام کی غور و فکر کی دعوت

اسلام کے دین حق ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس کے عقائد و ایمانیات اور اصول و فروع میں کوئی تضاد ،اختلاف، تعارض یا تناقض نہیں ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (النسآء—82) ''اگر یہ (قرآن) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً یہ لوگ اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے۔''

چونکہ کسی نظام میں تضاد یا تناقض کا ہونا نہ ہونا ایک عقلی((Rational معاملہ ہے، اس لیے اس لحاظ سے خود اپنے اندر کسی اختلاف کے نہ پائے جانے کا اعلان اس دین کے عقائد اور ایمانیات کی عقلی حیثیت کو واضح کرتا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہاں اختلاف کے نہ پائے جانے کا مجرد موضوعی((subjective اعلان نہیں کیا جارہا کہ جس پر بس ایمان رکھنا ضروری ہو اور اس کا عقل میں آنا غیر ضروری! بلکہ کفار کے بارے میں معروضی طور پر((objectively کہا جارہا ہے کہ وہ اس قرآن میں بڑے اختلافات پاتے اگر یہ کسی غیر اللہ کا بنایا ہوا کلام ہوتا۔

چنانچہ دین میں اضافے، بدعات اور تحریفات کی تمام کوششیں (بطور خاص عقائد اور ایمانیات کے معاملے میں) صاف طور پر پہچان لی جاتی اور بہ آسانی رد کر دی جاتی ہیں۔

دین کی یہ عقلی حیثیت نہ ہوتی تو معاذاللہ کسی دیومالا ہی کی طرح یا کسی "ماورائے عقل" ایمانیات پر مبنی تحریف شدہ دین ہی کی مانند اس میں بھی پھر تناقضات کے سمانے کی بھرپور گنجائش ہوتے۔ لیکن انسان کو پیدا کر کے عقل جیسی دولت سے نوازنے والی ذات نے اس کے لیے دین ایسے ہی نازل نہیں فرمادیا۔

پس دینِ اسلام پر بطور ایک کلِ((Holistically اور بطور ایک نظام اس طرح غور وتدبر کہ اس کے تمام اجزاء، بشمول عقائد و ایمانیات اور احکام وغیرہ، کا آپس میں تعلق اور مطابقت واضح سے واضح تر ہوتی جائے۔۔۔تاکہ قلوب کا اطمینان اور صدور کا انشراح اس دین کی قبولیت اور اطاعت وانقیاد کے لیے ہر آن بڑھتا ہی جائے۔۔۔اور بندہ تسلیم، خود سپردگی اور کامل رضامندی کا پیکر بن کر اپنے مالک کی طرف عالمِ شوق میں وارفتہ وار چلتا ہی جائے۔۔۔، یہ سب سے پہلے خود اس دین کا اپنا تقاضا ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (النسآء-82) ''کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ تعالی کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقینا یہ اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے۔

اسلام ہی وہ دین یا نظام ہے جو دنیائے مادہ اور دنیوی حیات کے مقصد اور غرض و غایت کے حوالے سے ایسی مکمل، جامع اور مربوط تفصیل پیش کرتا ہے جس میں کوئی ابہام، جھول، پیچیدگی یا تناقض نہیں ہے۔ چناچہ عقول کو اسکی قبولیت میں کوئی اصولی مانع بھی نہیں ہے۔

پس دین کی دعوت دراصل اس کی وہ خاصیت ہے جسکی بدولت عالمِ مادہ اور عالمِ غیب ایک ہی تصویر کے دو رُخ اور ایک ہی منصوبے کے دو متصل مراحل ثابت ہوتے نظر آتے ہیں۔ تصویر کے ان دونوں رُخوں کو ایک دوسرے سے جدا کرکے دیکھنے کی کوشش دو میں سے کسی ایک انتہا یا اس کی طرف ناروا جھکاوء کا ہی باعث بنتی ہی۔۔۔ یا صرف مادیت اور یا پھر صرف روحانیت۔ جبکہ روح اور مادے کے سنگم سے وجود میں آنے والی اس مخلوق کے لیے دونوں ہی یکساں طور پر اہم اور بیک وقت مطلوب ہیں۔

چناچہ روحانیت (بمعنی ''ایمان'') کے لیے طے کیا جانے والا سفر اگر عالمِ مادہ یا کسی قدر مادیت سے شروع نہ ہو تو پھر منزل ایک ایسی روحانیت ٹھہرتی ہے جو اس دنیا، اس کے ہنگاموں اور ان میں اِنسان کے مطلوبہ کردار سے ہی لاتعلق ہوتی ہے۔ یوں مادیت کا اصل کردار فنا ہو جانے کی بناء پر دنیا میں رزم گاہِ حق و باطل سجنے اور باطل کے ساتھ ستیزہ کاری و نبرد آزمائی کا سوال بھی بڑی حد تک روپوش ہی رہتا ہے۔

قرآن جو جابجا، کائنات میں مشاہدہ اور غور و فکر کی دعوت دیتا اور عقل کو جھنجھوڑتا نظر آتا ہے تو یہ کچھ بلا وجہ نہیں ہے۔ ایمان لانے کے لیے اگر مادی کائنات کا مشاہدہ اور اس میں تدبر ضروری نہ ہو، اور یہ دونوں ایمان لانے کی بنیاد نہ ہوں، تو معاذاللہ خدائے علیم و حکیم اپنے بندوں سے اس کا مطالبہ ہی کیوں کرے؟! بلکہ یہ عمل تو خود ایمان کی بقا کے لیے اس قدر ضروری ہے کہ بعد از قبولیت ایمان بھی مستقلاً مطلوب ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (البقرۃ۔164) ”بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات اور دن کا ہیر پھیر، کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیز کو لیے ہوئے سمندروں میں چلنا، آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دینا، اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا، ہواؤں کے رخ بدلنا، اور بادل، جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں۔، ان میں عقلمندوں کے لیے قدرتِ الٰہی کی نشانیاں ہیں۔“

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ (آل عمران – 190،191) ”بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو لوگ کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ اے پروردگار! تو نے اس کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا، پاک ہے تو۔“

قرآن تو آیا ہی اسی لیے ہے کہ وہ انسان کی عقل سے براہِ راست خطاب کرے اور اسے عقلی طور پر (Rationally) آمادہء تسلیم کرے، نہ کہ جبری طور پر۔ ہدایت کو گمراہی سے اسی لیے چھانٹ دیا گیا ہے کہ عقل دونوں کو الگ سے صاف طور پر پہچان لے۔

لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ۔256) "دین میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔"

قرآن کی دعوت کا انداز یہی ہے کہ وہ پہلے انسان کو اُس کے عام (common) مشاہدات یاد کراتا ہے، یا مشاہدات کی دعوت دیتا ہے۔ پھر ان کی بنیاد پر غور و فکر، تعقل اور تدبر پر آمادہ کرتا ہے۔ اس طرح سے کہ پھر نتیجتاً یہ غور و فکر ایمان لانے کی بنیاد بن جائے۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ 0 وَاِلَى السَّمَاۤءِ كَيْفَ رُفِعَتْ 0 وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ 0 وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ 0 فَذَكِّرْ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ 0 لَّسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ 0 (الغاشیۃ-17-22)

"یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں۔ اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں۔ اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔؟؟ تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو۔ تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔"

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (الاعراف–185) "کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں اور جو چیزیں

اللہ نے پیدا کی ہیں ان پر نظر نہیں کی۔ ؟اور اس بات پر (خیال نہیں کیا) کہ عجب نہیں ان (کی موت) کا وقت نزدیک پہنچ گیا ہو۔ تو اس کے بعد وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟"

اَفَلَم یَنظُرُوا اِلَی السَّمَاءِ فَوقَھُم کَیفَ بَنَینٰھَا وَزَیَّنّٰھَا وَمَا لَھَا مِن فُرُوجٍ 0 وَالاَرضَ مَدَدنٰھَا وَاَلقَینَا فِیھَا رَوَاسِیَ وَاَنبَتنَا فِیھَا مِن کُلِّ زَوجٍ بَھِیجٍ (ق: 6-8) "کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نگاہ نہیں کی کہ ہم نے اس کو کیونکر بنایا اور (کیونکر) سجایا اور اس میں کہیں شگاف تک نہیں۔ ؟اور زمین کو (دیکھو کہ اسے) ہم نے پھیلایا اور اس میں جہاز رکھ دیے اور اس میں ہر طرح کی خوش نما چیزیں اگائیں۔ تاکہ رجوع لانے والے بندے ہدایت اور نصیحت حاصل کریں۔"

قرآن انسان کو مشاہدے کے ذریعے پہلے اُن امور کی یاددہانی کراتا ہے جو مشاہدے سے "براہِ راست" لازم آرہے ہوتے ہیں۔ مثلاً مظاہرِ فطرت کی ہمہ رنگی کے باوجود ان میں ہم آہنگی اور نظم وضبط کے مشاہدے سے ایک ایسی ہستی کا ادراک جو اس کائنات کی خالق اور اور تنہا اس کا نظم چلانے والی ہے۔ پھر وہ ان امور پر ایمان لانے کی دعوت پیش کرتا ہے جو اس حاصل شدہ نتیجہ سے بالواسطہ لازم آتے ہیں۔ یا اس کا اصولی تکملہ (complement) ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ ان میں سے اکثر تک عقل کا خود سے پہنچنا ممکن نہیں ہوتا (مثلاً رِسالت، جنت جہنم، حشر نشر، حساب کتاب وغیرہ)۔ تاہم یہ امور نہ تو عقل کے مخالف ہوتے ہیں اور نہ اس کے لیے ناقابل فہم۔ بلکہ یہ مشاہدے سے حاصل شدہ نتائج کی بہترین تشریح، توجیہہ اور تکمیل کرتے ہیں۔ وحی سے ان امور کی بازیافت پر عقل دنیا کی غرض وغایت اور مقصد کے حوالے سے ایک طرح کا انبساط (Pleasure) اور اطمینان (Fulfilment) محسوس کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن کا، مشاہدہ اور غور وفکر کی دعوت دینا گویا ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب تم پہلے سے ان چیزوں کو تسلیم کرتے ہو تو پھر ان چیزوں

کو، پیش کرنے پر بھی، کیوں نہیں مان لیتے جو اول الذکر سے لازم آتی ہیں یا ان کی بہترین تشریح اور تکمیل کرتی ہیں؟اور جن میں باہم کوئی تضاد و تناقص نہیں ہے؟

مخاطب کو متوجہ کرنے اور اس کی عقل کو صحیح معنوں میں اپیل کرنے کے لیے کسی حوالے کے نقطہ (Point of Refrence) سے بات کا آغاز کرنا قرآن کی دعوت کے اُسلوب کا ایک معروف طریقہ ہے۔ حوالہ کا کوئی طے شدہ فریم نہ ہو تو مخاطب کو بات کی معروضیت (Objectivity) تک پہنچانا پھر ممکن ہی نہیں۔ چناچہ قرآن کے دعوتی اسلوب میں حوالہ کا یہ فریم یا تو مظاہرِ فطرت کی صورت میں مادی کائنات کا مشاہدہ ہے اور یا پھر مخاطب قوم اور اسلام کے مابین مشترکہ ایمانیات، جس کی بنیاد پر قرآن نے انسانی عقل کو Extrapolate کرواکے وہاں لے جانا ہوتا ہے جہاں پہنچنے سے انسان یا تو خود ''بوجوہ'' اعراض کر رہا ہوتا ہے یا پھر ان تفصیلات تک پہنچنا عقل کے لیے تنہا ممکن نہیں ہوتا، تاہم یہ تفصیلات ان مشترکہ امور سے حد درجہ مربوط نظر آتی ہیں۔

گویا حوالے کا یہ نقطہ یا فریم دراصل اسلام اور مخاطب اقوام کے درمیان کچھ مشترکہ امور (common terms) کی صورت میں سامنے آتا ہے جن کے اندر فریقین میں باہم کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ چناچہ غیر مشترکہ امور (uncommon terms) میں بھی اشتراک و یکجہتی لے آنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان امور کو مذاکرے کی بنیاد بنایا جائے جو پہلے ہی مشترک ہیں ۔ جس طرح ''نا معلوم'' (unknow) امور کا علم ''معلوم'' (known) کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا، اسی طرح غیر مشترکہ امور میں یکجہتی و اتفاق کا آجانا، پہلے سے مشترکہ امور کو مدار بنائے بغیر ممکن نہیں۔ بلکہ مشترکہ امور کے بغیر تو دو فریقوں کے درمیان بامعنی گفتگو اور تبادلہء خیال ہی ممکن نہیں، چہ جائیکہ دعوت و تبلیغ۔۔۔!

قرآن کریم کے زمانہ ءنزول میں تین قومیں بنیادی طور پر قرآن کی مخاطب تھیں: مشرکین عرب، یہود اور نصاریٰ۔ باوجودیکہ یہ تینوں قومیں اللہ پر پہلے سے ایمان رکھتی تھیں، اور اہل کتاب تو آسمانی شریعتوں کے ماننے والے تھے، اللہ نے قرآن میں ان سے گفتگو کے دوران محض مشترکہ ایمانیات کو ہی بحث کا نقطہ ءآغاز نہیں بنایا بلکہ ایسی بے شمار آیات بھی نازل کیں جو مادی کائنات کے مشاہدے اور ان میں تدبر کی دعوت دیتی ہیں۔

سائنسی حقائق کا قرآنی اشارات کے مطابق ہونا

یہ بات ایک حقیقت ہے کہ گزرتے ہوئے زمانے اور ادوار کے ساتھ انسان نے مادی کائنات کے متعلق اپنے بنیادی علم کو بذریعہ تجربات اور تحقیق و تفتیش ناقابل یقین حد تک آگے بڑھا دیا ہے۔ اور کئی ایک ایسے حقائق کا ادراک کیا ہے جن تک پہنچنا گزشتہ ادوار میں ایک ناممکن سی بات تھی۔ اور ایسا نہیں ہے کہ یہ تمام نئے سائنسی حقائق محض مفروضات ہی ہیں جو کسی بھی وقت بدل کر کچھ اور ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ان کی بنیاد پر عالمِ واقعہ میں ہونے والی نت نئی ایجادات اور ٹیکنالوجی کی ترقی ان حقائق کی مسلمہ حیثیت کو ثابت کرتی ہے۔

پھر یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مادی دنیا یا مادے سے متعلق قرآن کے بہت سے انکشافات ایسے ہیں کہ جو عالمِ واقعہ کے اندر گزشتہ ادوار میں انسان کے مشاہدے کے دائرے میں نہیں آتے تھے، اس لیے ان پر محض ایمان ہی رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ خصوصاً گزشتہ چند صدیوں میں جب کہ

سائنسی ترقی کی بدولت انسان کے مشاہدے اور تجربے کے دائرے میں نہایت درجہ وسعت پیدا ہو گئی تو بہت سے معلوم ہونے والے نئے مادی حقائق کی ان قرآنی انکشافات کے ساتھ حیرت انگیز مماثلت ثابت ہوتی نظر آئی۔ مثلاً بطنِ مادر میں جنین (Embryo) کی افزائش و نمو کے مختلف مراحل جنہیں قرآن بیان کرتا ہے، سائنسی ترقی کے دور سے پہلے انسان کے لیے قابل مشاہدہ نہیں تھے۔ لیکن اب جبکہ سائنسدانوں نے ان مراحل کو سائنسی طور پر معلوم و دریافت کر لیا ہے تو یہ عین وہی اور ویسے ہی ثابت ہوتے نظر آتے ہیں جس طرح کہ قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح کی اور درجنوں مثالیں موجود ہیں۔

چنانچہ قرآن اور جدید سائنسی حقائق کے درمیان مماثلت یا اشتراک کی بدولت حوالے کے فریم کی ایک نئ جہت سامنے آنا شروع ہوئی جو موجودہ دور میں سائنسی اور تجرباتی ذہن رکھنے والے انسان کو مخاطب اور اپیل کرنے کے لیے بجا طور پر حوالے کے نقاط فراہم کر سکتی ہے۔

قرآن پر اور دینِ اسلام پر لوگوں کو دعوتِ ایمان دینے کے لیے آخر کچھ نہ کچھ مشترکہ بنیادیں تو درکار ہوں گی۔ قرآن تو ہر دور اور ہر ذہن کے انسان کو خطاب کرنے کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ جبکہ دعوت کا مفہوم لوگوں کے قلوب واذہان پر اثر ڈالنا ہے نہ کہ محض بات پہنچا دینا۔ سو، جدید ذہن کے حامل انسان کو جو اسلام کے ساتھ کوئی قابلِ ذکر مشترکہ ایمانیات نہیں رکھتا، مخاطب اور متاثر کرنے کے لیے ہمارے پاس حوالے کے نقاط کیا ہیں؟

بادلوں کا بارش برسانا، ہواؤں کا چلنا، بارشوں سے مردہ زمین کا لہلہا اٹھنا، اندھیری راتوں میں ستاروں کا راہبر ہونا، پہاڑوں کا زمین میں بطور میخ گڑا ہونا، سورج اور چاند کا اپنے اپنے دائروں میں رہتے ہوئے گردش کرنا۔۔۔اور درجنوں ایسے ہی مادی حقائق کی بنیاد پر قرآن لوگوں کو ایمان لانے کے لیے دعوتِ غور و فکر دیتا آیا ہے تو آج کے ثابت شدہ مادی حقائق قرآن میں دکھلا کر ان کی بنیاد پر لوگوں کو غور و فکر اور ایمان بالغیب کی دعوت دینے میں بھلا کیا قباحت ہے؟ اور اس سے اسلام کی پیراڈائم کو کیا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے؟۔ قرآن کی ایک اپروچ اگر یہ بھی ہے کہ وہ مادی حقائق اور عالمِ غیب کے درمیان تلازم اور ربط دکھلا کر اپنی پیش کردہ غیب کی تفصیلات پر ایمان لانے کا تقاضا کرتا ہے تو اسی اپروچ کو استعمال کرتے ہوئے کچھ ''نئے'' سائنسی حقائق کا تعلق ''کلِ قرآن'' پر ایمان کی دعوت دینے کے لیے ''بعض'' قرآن سے کیوں نہیں جوڑا جاسکتا؟ جبکہ مقصد دونوں جگہ بالکل ایک ہے۔ رہا فرق طریقہ کار کا تو وہ دونوں جگہوں پر واقعات و حقائق کے بیان کی معجزاتی حیثیت کی نسبت سے ہے۔

معجزہ کا مقصد جہاں اللہ کی قدرت، اختیار اور فاعلیت کا براہِ راست ثبوت پیش کرنا ہوتا ہے (کیونکہ معجزہ، ''عادت'' (Routine) اور طبیعی و مادی قوانین کے برعکس واقع ہوتا ہے) وہیں اس ہستی یا شے کا، جس سے معجزہ کا صدور ہوا ہے، منجانب اللہ ہونا (یعنی خدا کا نبی یا خدا کا کلام ہونے کے حیثیت سے) بھی ثابت کرنا ہوتا ہے۔ کسی کا منجانب اللہ ہونا بطور کلِ اگر ثابت ہو جائے تو اس کی ہر ایک بات کا منجانب اللہ پھر آپ سے آپ متحقق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اصولی طور پر، اس ہستی یا شے پر ایمان لانے میں کوئی مانع بھی باقی نہیں رہتا۔

قرآن اللہ کا کلام اور دنیا کے اندھیروں میں آدمی کے لیے ہدایت کا نور ہے، جس نے تا قیامت انسانیت کے قلب وذہن کو اپنی لافانی روشنیوں سے منور کرتے رہنا اور حقیقت کی جستجو میں اس کی تشنگی کو ہر دور میں تسکین بخشتے رہنا ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ یہ اس خالق وفاطر کا کلام ہے جو اپنے اسماء وصفات اور افعال میں بے مثل، بے عیب اور غالب و قاہر ہے۔ "کلام" بھی اس کی ایک صفت ہے۔ یوں اللہ کا کلام ہونے کے ناطے یہ قرآن اس دنیا میں پورے کا پورا ایک معجزہ ہے، جس کی کوئی ذرہ برابر بھی نظیر اور مثال ہو ہی نہیں سکتے۔ خواہ اس کے الفاظ ہوں، اسلوب ہو، پیرایہ ء بیان ہو یا اس کے بیان کردہ واقعات و حقائق، یہ اپنے ہر ہر انداز سے ایک معجزہ اور فکر کو مہمیز دینے والا کلام ہے۔ اس کی معجز نمائی تا قیامت جاری رہے گے۔ اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہونگے۔ اس سے سیرابی اور شفایابی کی تمنا و جستجو رکھنے والے ہر دور میں اس کے فیض عام سے بہرہ اندوز ہوتے رہیں گے۔ تا قیامت لوگ اس سے ہدایت اور منفعت حاصل کرتے رہیں گے۔ کون سی چیز ہے جس کے ذکر سے یہ کتاب خالی ہے؟ کونسی بات ہے جس کا اس میں بیان نہیں؟

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ (النحل –89) "اور ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے کہ جو ہر چیز کا بیانِ (مفصل) ہے۔"

چنانچہ قرآن کی ہمہ جہت، ہمہ گیر اور ہمہ وقتی معجزاتی حیثیت کے پیش نظر اس میں ایسے سائنسی حقائق سے متعلق اشارات کا پایا جانا جو گزشتہ ادوار میں معلوم یا دریافت نہیں ہو سکے تھے (حتی کہ وہ بھی جو ابھی تک دریافت نہیں ہو سکے ہیں اور آئندہ کسی زمانے میں ہو سکیں گی) ہر گز مستبعد نہیں ہے۔ بلکہ از قبیل تسلسلِ عجائبِ قرآن ہے۔

کائنات اور حیات سے متعلق سائنسی حقائق کا قرآنی اشارات کے مطابق ہونا اور یوں ان کا انسان کے قرآن پر ایمان لانے کے لیے ایک نشانی (آیات) اور ایک بنیاد ہونا تو خود قرآن میں مذکور ہے جسے دورِ جدید کے داعیان اسلام بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حم السجدۃ – 53) ''ہم عنقریب انکو اطرافِ عالم میں اور خود ان کی ذات میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یہی (قرآن) حق ہے۔''

درست، کہ قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں ہے، نہ ہی اس کے نزول کا مقصد سائنس کی تعلیم دینا ہے۔ اسی طرح قرآن کی حقانیت پر ایمان جدید سائنس کی تائید و شہادت ہی پر منحصر نہیں ہے۔ لیکن نہ تو یہ دونوں امور قرآن میں سائنسی اشارات کے پائے جانے میں مانع ہیں، اور نہ جدید سائنسی حقائق اور قرآنی اشارات کے درمیان اشتراک تلاش کرکے اسے بطور معجزہء قرآن دعوت کا ایک حوالہ (Reference) بنانا قرآن کو جدید سائنس کے تابع کردینے کے مترادف ہے۔

پس اسلام کے کسی داعی کی طرف سے سائنسی حقائق اور قرآنی اشارات میں مماثلت پیش کیا جانا دراصل قرآن کی معجزاتی حیثیت کا بیان ہوناہے کہ جو بات جدید سائنس نے آج بڑی دقتوں سے معلوم کی ہے وہ قرآن نے صدیوں پہلے بغیر کسی مادی تحقیق کے بیان کردی تھی۔ پھر اسی بات کو دعوت کی بنیاد بنایا جاتا ہے ۔

قابل غور بات یہ ہے کہ

قرآن کی ''بعض'' کی معجزاتی حیثیت کی بنیاد پر قرآن کی ''کلۂ'' پر ایمان کی دعوت کوئی منطق کے استقرائی طریقہ کار کے تحت نہیں ہوتی (کہ جس میں حتی الامکان تمام اجزاء کو الگ الگ انفرادی طور پر ثابت کر کے پھر انکے مجموعے یا کلۂ کا اثبات ممکن بنایا جاتا ہے) بلکہ صرف چند حقائق میں مماثلت ہی کلۂ قرآن اور اسلام کی حقانیت کی دعوت پیش کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی نبی کے ایک معجزے یا چند معجزات کی بنیاد پر اسکی تمام باتوں پر ایمان لے آیا جائے۔ چنانچہ خود اسی طریقہ استدلال کو استعمال کرنے والے داعی حضرات اس طرح قرآن کو سائنسی کتاب کی بجائے ایک معجزاتی کتاب ثابت کر رہے ہوتے ہیں ۔

ان مخلص اور سلیم الطبع داعی حضرات پر قرآن اور دین کو جدید سائنسی پیراڈائم کے تحت و تابع کر دینے کا الزام تو ایک طرف رہا، خود مجرد جدید سائنس کے تمام نظریات سے ان لوگوں کا متفق ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ جیسے ڈارون کا نظریہ ءارتقاء اسلام کے نظریات سے شدید طور پر متصادم ہونے کی بناء پر ہمیشہ سے شدید اور کڑی تنقید کا سامنا کرتا رہا ہے۔ اور اگرچہ یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کچھ سائنسی نظریات بعض اوقات ردّ ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے سائنسی نظریات لے لیتے ہیں (البتہ روز افزوں سائنسی ترقی و تحقیق کے باعث اس عمل میں بھی بڑی حد تک کمی آچکی ہی) لیکن یہ بات بھی اسلام اور سائنسی حقائق کے درمیان اشتراک تلاش کرنے میں مانع نہیں ہے۔ کیونکہ صرف اسلامی اصول و عقائد کے موافق، اور مسلّمہ طور پر ثابت شدہ سائنسی حقائق (Well established scientific facts) ہی اسلام اور سائنس کی مماثلت کے موضوع پر، دعوت کی غرض سے، ان اسکالرز کی بحث و گفتگو کا محور بنتے ہیں۔

اسلام اور سائنس کے درمیان مماثلت تلاش کرنے کا یہ عمل ایک مخصوص اور محدود دائرے کے اندر اندر ہوتا ہے، جو دراصل خود اسلام کی اپروچ کے تابع ہوتا ہے۔ ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو، کثرت کے ساتھ قرآنی آیات کی بے جا سائنسی تاویلات اور دور از کار توجیہات ان لوگوں کی طرف سے دیکھنے میں آ رہی ہوتیں۔۔۔، جس پر کہ معروف وجید علمائے کرام کی تنقید و تردید پھر ایک مشہور و معلوم بات ہوتی۔

یہاں اگر تفریط کی صورت میں یہ ایک انتہا ہے کہ سائنس کو کلیتاً اسلام کے خلاف قرار دیکر اس سے "بری الذمہ" ہونے کی کوشش کی جاتی ہے، تو ہر شرعی مسئلہ کی طرح اس معاملے میں بھی بہ صورت افراط ایک دوسری انتہا کا پایا جانا ہرگز خارج از امکان نہیں بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔

چنانچہ کسی شخص نے اگر اپنی کسی تالیف یا تفسیر قرآن میں ہر سائنسی رطب ویابس (بشمول ڈارون کا نظریہء ارتقاء) کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہو تو ایک شخص یا چند اشخاص کی غلط اپروچ پر باقی تمام لوگوں کو تو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ نہ ہی ان سب کی یکساں صف بندی کی جانا کوئی عدل وانصاف کے قرین ہے۔ ویسے بھی اس قسم کی تفاسیر پر علمائے کرام کی شدید تنقید و تردید کا تو خود سائنس مخالفین کو اعتراف بلکہ دعویٰ ہے۔

قرآن میں ان سائنسی حقائق سے متعلق اشارات کا پایا جانا جو آج کے دور میں جا کر دریافت ہوئے ہیں، غیر مسلموں پر تو گہرا تاثر قائم کرتا ہی ہے، مسلمان بھی اس سے شدید متاثر ہوتے ہیں۔ یوں ان کا ایمان مزید بڑھتا اور ان کے اطمینان قلب میں مزید اضافہ ہوتا ہے، جس کی وجہ ان کا سائنسی ذہنیت کا حامل ہونے کی

بجائے قرآن کی معجزاتی حیثیت کو پاکر دم بخود رہ جانا ہوتا ہے۔ ورنہ قرآن پر ان (مسلمانوں) کا پہلے کا ایمان کوئی سائنس کا مرہونِ منّت تھوڑی رہا ہوتا ہے۔

یہ بات کہ اسلام کے بہت سے جدید اسکالرز اور داعی حضرات اسلام اور سائنس کے مشترکہ امور کو حوالے کی بنیاد بنا کر دین کی دعوت پھیلا رہے ہیں، آج کے دور کا ایک مشہور و معروف واقعہ ہے، کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اسلام کے آغاز سے اب تک ہر دور کی طرح اس دور میں بھی علمائے حق کی کثیر تعداد مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کے لیے ہمہ وقت موجود و مستعد ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطہ میں اسلام کے کسی نظریے یا عقیدے پر کوئی آنچ آ رہی ہو، یا اس کی ایمانیات میں ملاوٹ یا کمی بیشی کی کوشش کی جا رہی ہو تو سب سے پہلے یہ علمائے کرام ہی ہیں جو اس واقعے کا نوٹس لیتے اور عامۃ المسلمین کو اس سے خبر دار و ہوشیار کرتے ہیں۔ کسی مسئلہ یا واقع میں علمائے کرام تائید میں جاتے ہیں یا مخالفت میں، یا خاموش ہی رہتے ہیں ،۔۔۔ غرض جو بھی طرزِ عمل اپناتے ہیں وہی عامۃ المسلمین کی سمت بندی کے لئے ایک معیار بن جاتا ہے۔ چنانچہ کسی چیز کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے سے متعلق عالمِ اسلام کے جید علماء کی آراء ہی کو مد نظر رکھنا یا اس بابت ان ہی کی طرف رجوع کیا جانا ناگزیر ہے جس سے انحراف کی کی روش ایک خطرناک طرزِ عمل ہے۔

مزید برآں، سائنس اور عقل، اسلام اور اس کی ایمانیات کی کتنی مخالف ہیں، اور مخالف ہیں بھی یا نہیں اس کا کوئی ثبوت اگر ہو تو خود اسلام اور اس کی ایمانیات سے دیا جانا چاہیے نہ کہ کہیں اور سے۔ اسلام ایک جامع، کامل، ہمہ گیر اور آفاقی دین ہے، اور اپنی حقانیت اور دیگر ادیان و نظاموں کے بطلان کے دلائل آپ اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔ یہ اپنی نہاد میں اس قدر صاف، شفاف، کھرا، سچا اور خالص ہے کہ کسی بھی قسم کا

کھوٹ یا ملاوٹ اس میں بار پا ہی نہیں سکتی، بلکہ فوراً الگ سے، صاف طور پر پہچان لی جاتی اور ردّ کردی جاتی ہے۔اب اسلام کی ایمانیات کی کیا منہاج(paradigm)ہے، یا اس کی ایمانیات کے بنیادی اصول یعنی اسلام کے اصولِ عقیدہ کیا ہیں، تو اس کے لیے کوئی بہت زیادہ تحقیق کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔نہ ہی اس غرض سے اسلام کے اپنے طریقہء مطالعہ کو چھوڑ کر کسی اور طریقہء تفکیر(Discourse)مانند فلسفہ کو استعمال کرنا درست ہو سکتا ہے۔کیونکہ اسلام کے اصولِ عقیدہ تو روزِ روشن کی طرح واضح ہیں اور صدیوں سے چلے آئے غیر مبدّل اور ناقابلِ تحریف اسلام کے مصادر ہی اس کے بیان کا حق محفوظ رکھتے ہیں نہ کہ یہ موجودہ دور کے کچھ مغربی فلسفہ سے واقف افراد کو ہے،اسلام کے مزعومہ دفاع کے لیے کچھ نیا اس باب میں ''متعارف'' کرانا پڑے گا۔! مغربی فکر و فلسفہ کا مطالعہ اگر فرض نہیں، تو ایسا برا بھی نہیں ہے، بشرطیکہ اس نگاہ اور طریقہء تفکیر کا ہی پہلے شعوری تعین کر لیا جائے جسکے تحت پھر یہ مطالعہ کیا جانا ہو۔ بلکہ اس سے بھی پہلے، یا اسکے لیے، اسلام کے اصولِ عقیدہ پر مبنی مشہور و متداول کتب کسی عالم سے پڑھ لی جائیں تو پھر اس اپروچ کا درست ہو جانا کافی حد تک ممکن ہے۔اور توفیق تو صرف خدائے ربِّ ذوالجلال کے پاس ہے۔

ایمان، عقل اور سائنس [2]

معقولیت(Rationality)انسان کی فطرت کا لاینفک جزوہ

بدیہیات اور مسلمات کا اختیار کیا جانا اور چیزوں کا مسلّمہ معیارات کے مطابق پر کھا جانا ایسی چیز نہیں جو انسان کے اندر ''ماحول کے بگاڑ'' یا ''چار سُو پھیلی گمراہیوں'' کی وجہ سے دَر آتی ہو۔ یہ ایک لازمی وصفِ انسانی ہے، خواہ انسان تاریخ کے کسی دور اور تمدن و ترقی کے کسی درجے میں پایا جاتا ہو۔

کسی معاملے کے مختلف پہلوؤں کا آپس میں مربوط اور مطابق ((Consistent ہونا، اور خود اس معاملے کا خارج میں موجود معلوم شدہ بدیہی امور سے متضاد و مخالف نہ ہونا، اس کی معقولیت سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان کی فطرت بھی معاملات میں اس صفت کے پائے جانے کو چاہتی ہے اور اسی سے متاثر و مرعوب ہوتی ہے۔ انسان کی فطرت میں جو سچائی کی تلاش کا مادہ اور کائنات کی حقیقت کی جستجو کُوٹ کُوٹ کر بھر دی گئی ہے، اس کی معقولیت پسندی، حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی اس کی اسی فطری خواہش کی ایک مظہر ہے۔ ہر نئی چیز کسی پچھلی مسلّمہ چیز سے متصادم اور بالکل ہی غیر متعلق نہ ہو، اور خود اس چیز کے اپنے اندر اضطراب و بحران نہ پایا جاتا ہو، حقیقت کی ایک صفت یہ بھی ہے۔ یعنی کوئی چیز خارجی طور پر بھی نہایت محکم ، متوازن اور مربوط ہو اور داخلی طور پر بھی کسی انتشار وہیجان سے مأمون، فطرتِ انسانی کے پاس حقیقت کی تلاش کا ابتداءً یہی ایک معیار ہے۔ اور یہی معقولیت ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ فطرت انسانی میں ایک چیز کی جوت جگادی گئی ہو اور وہ چیز خارج میں اسی نسبت اور اسی انداز میں نہ رکھ دی گئی ہو جس انداز میں انسان کی فطرت میں اسے دیکھنے اور پانے کی طلب رکھی گئی ہے، یا خارج میں اس فطرت کے استعمال، تسلّی، اطمینان اور تسکین کے لئے اس کے ہم آہنگ مناسب قرائن نہ پیدا کئے گئے ہوں، کہ جن کے آشکار ہونے پر فطرت مقصدیت کا لطف اور انبساط حاصل کرتی ہے، بلکہ اسی ہم آہنگی کو حقیقت کی تلاش کے سلسلے کی

ابتدائی کڑی نہ بنایا گیا ہو۔ انسان کی معقولیت پسندی ہی اس طرح اس عالمِ اسباب میں اُس کے سچائی اور حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

معقولیت پسندی کا جو کہ عقل رکھے جانے کا ایک لازمی تقاضا ہے انسان خواہ قائل ہو یا نہ ہو، اور خواہ کتنا ہی ''غیر معقول'' ہو جائے، عقل کی چیرہ دستیوں سے اس کو ہر گز مفر نہیں۔ معقولیت اگر عقل کا کارنامہ ہوتی ہے تو ''غیر معقولیت'' بھی اسی عقل ہی کی کارستانی ہوتی ہے۔ انسان جب عقل کے کردار کو سراہتے ہوئے اس کو بروئے کار لاتا ہے اور اس کا بطور خاص قدردان بنتا ہے تب وہ عقل استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ اور جب وہ عقل کو محض فتنہ سمجھتے ہوئے اس سے کوسوں دور بھاگنے کا منہج اختیار کرتا ہے، تب وہ عقل کے زیرِ دام ہوتا ہے۔ انسان نے بہر صورت عقل کے زیرِ نگیں ہی رہنا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بعض لوگوں کو ''غیر معقولیت'' کا منہج ہی راس آتا ہے! پس اس معقولیت اور غیر معقولیت کے درمیان فرق یہ نہیں کہ ایک میں عقل کا استعمال ہوتا ہے اور دوسری میں نہیں، بلکہ دراصل یہ ہے کہ کچھ لوگ تلاشِ حقیقت میں ایک کی ضرورت اور اس کے لزوم کے قائل ہیں اور دیگر لوگ اس کے برخلاف دوسری کے۔ اور جہاں فرق کی یہ بنیاد یعنی ''حقیقت کی تلاش'' نہ پائی جاتی ہو وہاں عقل کا استعمال اور اس کی حدود زیرِ بحث ہی نہیں آتیں کیونکہ وہاں اس بابت سرے سے اختلاف ہی نہیں پایا جاتا۔ تاہم محلِ اختلاف میں عقل کو اُس کی ''اوقات'' میں رکھنے کے قائلین اپنی ''نامعقولیت'' کے جواز میں بھی خاصی معقولیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پائے جا رہے ہوتے ہیں۔ یعنی وہی طریقہ واندازِ استدلال جو معقولیت پسندی کا خاصہ ہے۔ تفکیر کے فطری طریقوں سے انسان کہاں تک راہِ فرار اختیار کر سکتا ہے؟!!

ویسے بھی انسان کے ارادی افعال اور فیصلے بغیر استدلال اور استنتاج کے واقع نہیں ہوتے۔اور کوئی استدلال ایسا نہیں ہوتا جو ''عقلی''،یعنی عقل پر سہارا کرنے والا نہ ہو،خواہ اپنی نہاد میں وہ استدلال کتنا ہی 'خلافِ عقل' ہو۔اب اگر کوئی اپنے فیصلوں میں آباء کی پیروی کرتا ہے، کوئی منطق و فلسفہ کی، کوئی رسوم ورواج کی اور کوئی انبیاءاور ان کے پیروکاروں کی، تو اگرچہ ہر کسی کا 'محلِ پیروی' بیک وقت درست نہیں ہو سکتا، تاہم ہر کوئی اپنے محل پیروی کے صائب ہونے کا استدلال شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے پاس رکھتا ہے، جو ظاہر ہے، عقل ہی کے مرہونِ منّت ہوتا ہے۔استدلال البتہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ چنانچہ دانشمندی اور غیر دانشمندی میں فرق یہ نہیں کہ ایک میں عقل کا استعمال ہوتا اور دوسری میں نہیں، بلکہ ایک میں عقل کے صادر کردہ فیصلے اور استدلال کی بنیادیں صحیح ہوتی ہیں اور دوسری میں غلط۔ حتیٰ کہ عقل سے جان چھڑانے اور چھڑائے رکھنے کے لیے بھی سارا زور عقل ہی کا استعمال ہو رہا ہوتا ہے!!!

پس ضروری نہیں لوگوں کے درمیان اصل فرق عقل کے استعمال یا عدم استعمال میں ہو، بلکہ ضروری نہیں یہ فرق معقولیت پسند rational ہونے یا نہ ہونے میں ہو، بسا اوقات تو یہ فرق حقیقت تک رسائی کے لیے عقل کے جواز اور ضرورت کے محض قائل ہونے نہ ہونے میں ہو جاتا ہے۔جس کی اصل وجہ پہلے سے طے کردہ معیارات یا مسلمات کا فرق ہوتی ہے۔ یا کسی منہاجِ علم کو اس کے اصل دائرے سے وسیع تر یا مختصر کر کے دیکھنے سے بھی یہی صورت سامنے آتی ہے۔یعنی ایک چیز جو کسی منہاج علم کا مقتضیٰ یا مشمول نہ ہو، اور اس کے ذمے جڑ دی جائے۔ یا ایک چیز کسی منہاج علم کا حصہ ہو، یا کم از کم وہ چیز اس منہاج سے متصادم نہ ہو، اور اسے اس کے متضاد قرار دیا جائے۔ پس ایسے مقامات پر مسلمات اور منہاج کے فرق (یعنی کسی مخصوص طریقۂ علم کے اپنے منہاج و مسلمات اور اس سے منسوب کئے جانے والے منہاج و مسلمات

کے درمیانی فرق) کی تفتیش و تفحیص ہی عقدۂ اختلاف کو کھولنے میں معاون ہو سکتی ہے، چاہے معاملہ اسلام کی منہاج کا ہو یا سائنس کی منہاج کا۔

پس اس معقولیت اور غیر معقولیت کے درمیان فرق یہ نہیں کہ ایک میں عقل کا استعمال ہوتا ہے اور دوسری میں نہیں، بلکہ دراصل یہ ہے کہ کچھ لوگ تلاشِ حقیقت میں ایک کی ضرورت اور اس کے لزوم کے قائل ہیں اور دیگر لوگ اس کے برخلاف دوسری کے۔ اور جہاں فرق کی یہ بنیاد یعنی ''حقیقت کی تلاش'' نہ پائی جاتی ہو وہاں عقل کا استعمال اور اس کی حدود زیرِ بحث ہی نہیں آتیں کیونکہ وہاں اس بابت سرے سے اختلاف ہی نہیں پایا جاتا۔ تاہم محلِ اختلاف میں عقل کو اُس کی ''اوقات'' میں رکھنے کے قائلین اپنی ''نامعقولیت'' کے جواز میں بھی خاصی معقولیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پائے جارہے ہوتے ہیں۔ یعنی وہی طریقہ واندازِ استدلال جو معقولیت پسندی کا خاصہ ہے۔ تفکیر کے فطری طریقوں سے انسان کہاں تک راہِ فرار اختیار کر سکتا ہے؟!!

ویسے بھی انسان کے ارادی افعال اور فیصلے بغیر استدلال اور استنتاج کے واقع نہیں ہوتے۔ اور کوئی استدلال ایسا نہیں ہوتا جو ''عقلی'' یعنی عقل پر سہارا کرنے والا نہ ہو، خواہ اپنی نہاد میں وہ استدلال کتنا ہی 'خلافِ عقل' ہو۔ اب اگر کوئی اپنے فیصلوں میں آباء کی پیروی کرتا ہے، کوئی منطق و فلسفہ کی، کوئی رسوم و رواج کی اور کوئی انبیاء اور ان کے پیروکاروں کی، تو اگرچہ ہر کسی کا 'محلِ پیروی' بیک وقت درست نہیں ہو سکتا، تاہم ہر کوئی اپنے محل پیروی کے صائب ہونے کا استدلال شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے پاس رکھتا ہے، جو

ظاہر ہے، عقل ہی کے مرہونِ منّت ہوتا ہے۔استدلال البتہ صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ چنانچہ دانشمندی اور غیر دانشمندی میں فرق یہ نہیں کہ ایک میں عقل کا استعمال ہوتا اور دوسری میں نہیں، بلکہ ایک میں عقل کے صادر کردہ فیصلے اور استدلال کی بنیادیں صحیح ہوتی ہیں اور دوسری میں غلط۔ حتی کہ عقل سے جان چھڑانے اور چھڑائے رکھنے کے لیے بھی سارازور عقل ہی کا استعمال ہورہاہوتا ہے!!!

پس ضروری نہیں لوگوں کے درمیان اصل فرق عقل کے استعمال یاعدم استعمال میں ہو، بلکہ ضروری نہیں یہ فرق معقولیت پسند rational ہونے یانہ ہونے میں ہو، بسااوقات تو یہ فرق حقیقت تک رسائی کے لیے عقل کے جواز اور ضرورت کے محض قائل ہونے نہ ہونے میں ہوجاتاہے۔ جس کی اصل وجہ پہلے سے طے کردہ معیارات یا مسلمات کا فرق ہوتی ہے۔ یا کسی منہاجِ علم کواس کے اصل دائرے سے وسیع تر یا مختصر کرکے دیکھنے سے بھی یہی صورت سامنے آتی ہے۔یعنی ایک چیز جو کسی منہاج علم کا مقتضیٰ یا مشمول نہ ہو، اور اس کے ذمے جڑ دی جائے۔ یاایک چیز کسی منہاج علم کا حصہ ہو، یاکم ازکم وہ چیز اس منہاج سے متصادم نہ ہو، اور اسے اس کے متضاد قرار دیا جائے۔ پس ایسے مقامات پر مسلمات اور منہاج کے فرق (یعنی کسی مخصوص طریقۂ علم کے اپنے منہاج و مسلمات اور اس سے منسوب کئے جانے والے منہاج و مسلمات کے درمیانی فرق) کی تفتیش و تفحیص ہی عقدۂ اختلاف کو کھولنے میں معاون ہوسکتی ہے، چاہے معاملہ اسلام کی منہاج کا ہو یا سائنس کی منہاج کا۔

اشیاءاور مظاہر کائنات کی حقیقت—دوانتہائیں

عالم مادّہ اور اس میں جاری و ساری مظاہر و واقعات کی حقیقت و کنہ کی بابت فلاسفہ و حکماء کی دو مخالف اپروچز کا تذکرہ یہاں ضروری ہے، جو در حقیقت اس معاملے کی دو انتہائیں ہیں۔

تفریط پر واقع انتہا اس نقطۂ نظر کی حامل ہے کہ اشیاء اور مظاہر کائنات جس طرح واقع ہوتے نظر آتے ہیں ان کی حقیقت بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور چیزوں کے وقوع پذیر ہونے سے کسی ایسی چیز کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جو انسانی عقل و حواس کے دائرے میں نہ آتی ہو۔ کیونکہ ایسی کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا! ان کے ہاں وہی چیز تسلیم کی جاتی ہے جو براہ راست ثابت کی جا سکتی ہو، اور ثابت ہونے کا مطلب ان کے اپنے طے شدہ حسّی معیارات کے مطابق ہونا ہے۔ جو چیز یوں ''ثابت'' نہ ہو وہ ہے ہی نہیں! چنانچہ ان کے یہاں کسی عالمِ غیر مادّہ یا عالم غیب یا عالمِ ماورا کا کوئی تصوّر نہیں پایا جاتا۔

دوسری انتہا کو پہنچا ہوا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حقیقت جو کچھ بھی ہے وہ سامنے ہر گز نہیں ہے، بلکہ آنکھوں اور دیگر حواس وغیرہ سے نہاں ہے۔ سامنے جو کچھ ہے وہ اس حقیقت کا ایک پرتو یا عکس تو ہو سکتا ہے، خود حقیقت نہیں ہے۔ اور اس کے ذریعے حقیقت تک نہ تو پہنچا جا سکتا ہے اور نہ اس کے اور حقیقت کے مابین کوئی ایسا ربط و آہنگ یا علاقہ ہی ہے جو حقیقت کی ماہیت پر دلالت کر سکتا ہو یا کم از کم اس کی طرف اشارہ ہی کر سکتا ہو۔ مزید یہ کہ مختلف مظاہر کائنات اور مادّی امور ایک دوسرے سے قطعاً غیر متعلق، غیر مربوط اور آزاد طور پر واقع ہوتے ہیں۔ چنانچہ چیزوں کے ہونے میں کوئی طبیعی یک رنگی اور استمرار نہیں پایا جاتا۔ یوں کوئی بھی چیز کبھی بھی کسی بھی انداز میں رُوپذیر ہو سکتی ہے، اور اس میں کوئی Predictability نہیں پائی جاتی۔

وجود وعدم کے پیچاک میں الجھی ہوئی ان دو انتہاؤں میں سے پہلی، عالم غیب یا عالم ماورا کو ''عدم'' کے ہم معنی ٹھہرا دیتی ہے۔ جبکہ دوسری انتہا کے نزدیک عالمِ وجود اپنی حقیقت کے اعتبار سے عالم عدم ہی ہے۔!! ایک غیب کی منکر ہے تو دوسری سے شہود کا انکار لازم آتا ہے۔

ثانی الذکر فکر کے قائلین کچھ فرق کے ساتھ فلاسفۂ مغرب اور مسلمان حکماء دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہماری اس تمام گفتگو کا دائرہ البتہ اس فکر کے ان قائلین تک محدود ہے جو اسے اپنے تیئں اسلام کے تناظر میں لیتے ہیں۔

عالمِ مادّہ کے ایک ''قطعاً بے حقیقت شے'' ہونے کے مذکورہ بالا نظریے کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ انسان کے محسوسات اور مشاہدات سب کے سب قریب قریب واہمہ اور سراب کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اور چیزوں کا ظاہری ادراک محض فریب ہستی۔ واقعات اور اشیاء میں ربط وضبط، ان کا باہمی قرار و آہنگ اور ان کا وقوع پذیر ہونا اتفاق اور حادثہ قرار پاتا ہے جو کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح یہ کائنات ''ممکنات کی دنیا'' سے بدل کر محض ''حادثات کی دنیا'' رہ جاتی ہے۔

اس نظریے کے مطابق چونکہ عالمِ مظاہر (World of Phenomena) نہ خود حقیقت ہے نہ اس کے ساتھ مربوط و متصل کوئی جہان، لہٰذا نتیجتاً، انسانی عقل وحواس اس کائنات کے ساتھ تفاعل کے بعد جن اصول و قوانین تک پہنچتے ہیں، وہ حتمی نہیں ہوتے، بلکہ سرے سے قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ اور اس لحاظ سے یہ بات اظہر من الشمس بھی ہے، کہ جب اس کائنات کا اشیاء اور واقعات کا ایک نہایت بے ہنگم وبے ڈھب کارخانہ ہونا طے پاجاتا ہے تو کسی سلسلۂ واقعات کا انجام یا نتیجہ ((inference احاطۂ ذہن

میں کیونکر لایا جاسکتا ہے؟ بلکہ خود واقعات کا کوئی سلسلہ ہونا ہی محلِ نظر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سلسلہ تو وہاں بنتا ہے جہاں چیزوں میں کوئی ربط وضبط ہو۔!!

نوبت بالآخر یہاں جا پہنچتی ہے کہ کسی چیز کا پھر کوئی مطلب ہی متعین ہونے کے لائق نہیں رہتا، اس کا کسی ضابطے یا قانون کی شکل میں منضبط ہو جانا دور کی بات۔ جب مختلف واقعات کا سرے سے آپس میں کوئی ربط ہی نہ بن سکتا ہو، نہ ہی حقیقت کے ساتھ کسی واقعے کے ڈانڈے جا ملتے دکھائی دیتے ہوں تو کسی شے کے معنی کا تقاضا بھی نہایت بے معنی لگتا ہے۔ پھر کسی اَمر کی جو تعبیر رکھی جائے اس میں ہر ایک کے لئے اس کی اپنی صوابدید ہی معتبر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جب یہاں کوئی چیز حتمی ہے ہی نہیں تو ایک کی بات دوسرے پر حجت کیونکر ہو سکتی ہے؟ خارج کا جب وجود ہی اصل حقیقت سے متغایر ہو، اور اس میں استحکام، استمرار اور یک رنگی نہ پائی جاتی ہو، تو اس سے دلیل کیسے پکڑی جا سکتی ہے؟ معروضیت ((Objectivity پھر وہ شے ہوتی ہے جسے موضوعیت ((Subjectivity سے کوئی تباین نہیں ہوتا۔ اور دونوں میں فرق ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آکر عقلِ انسانی انتہائی بے کار، فالتو اور زائد از ضرورت شے محسوس ہوتی ہے۔

اس فکر کے حامل فلاسفۂ مغرب حقیقت کی کوئی تفصیل یا ماخذ پیش نہیں کرتے، بس اجمالاً اس حقیقت کے پائے جانے کا اثبات کرتے ہیں۔ کیونکہ خود ان کے نزدیک بھی مجرّد عقل کے ذریعے اس حقیقت تک پہنچا نہیں جا سکتا۔ البتہ عقل وحواس کے علاوہ کسی اور ذریعۂ علم کے قائل نہ ہونے کی بناء پر وہ اس ماورائے مادّہ حقیقت تک رسائی ہو سکنے کے انکاری ہیں۔

البتہ جب یہ فکر مسلمانوں میں نمودار ہوتی ہے تو ان کے ہاں حقیقت سے مراد ذاتِ خداوندی اور اس کی لامحدود قدرت و غلبہ ہوتی ہے، جس تک پہنچنے کا واحد راستہ وحی کے ذریعے حاصل شدہ علم ہے جو انبیاء پر نازل کیا گیا۔ حقیقت کی نشاندہی کرنے میں تو اس فکر کی اصابت واضح ہی ہے، لیکن مادی جہان کی حیثیت متعین کرنے میں یہ فکر مادّہ پرستوں کے بالمقابل ردِّ عمل کا شکار ہو کر دوسری انتہاء کو پہنچی نظر آتی ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان کھینچاتانی کا عنوان ہے: ''حقیقت اور اس تک رسائی میں عقل کا کردار''۔ ایک جس قسم کی حقیقت کی قائل ہے اُس تک پہنچنے میں محض عقل ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اور دوسری جس حقیقت پر ایمان رکھتی ہے اس تک رسائی حاصل کرنے میں وہ عقل کے کسی کردار ہی کی منکر ہے۔ اس انکار کی وجہ اغلباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس باب میں عقل کا کوئی کردار تسلیم کر لینے سے وحی کی اہمیت کم ہوتی نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے، جب عقل کے ذریعے حقیقت تک پہنچا جا سکتا ہو تو پھر وحی کی کیا ضرورت؟ اور اس کے معکوس کے طور پر، جب وحی ہی حقیقت تک رسائی کا اصل ذریعہ ہے تو اس میں پھر عقل کا کیا کام؟ چنانچہ اس طرح ایک انتہا کے بالمقابل دوسری انتہا وجود میں لائی جاتی ہے۔ پھر ذات خداوندی کے غلبہ و قدرت اور ربوبیت و الوہیت کے جتنے اشارے کائنات سے عقل کو دستیاب ہو سکتے ہیں ان کو کالعدم قرار دینے کے لئے مادی واقعات و اشیاء کو حقیقت سے بالکل الگ تھلگ اور خود آپس میں غیر مربوط و لاتعلق ''ثابت'' کیا جاتا ہے۔ تاکہ عقل وحی کی غیر موجودگی میں کسی ابتدائی درجے میں بھی حقیقت کی جستجو کی ''جسارت'' نہ کر سکے اور یوں وحی کی اہمیت میں فرق پیدا نہ ہو۔ نتیجہ یہ کہ اس طرح نہ صرف کائنات میں جا بجا کارفرما، علم وحی کے برحق ہونے کی نشانیاں دیکھنے کے عقل کے اختیارات زائل کر دیے جاتے ہیں، بلکہ خود کائنات کو بہتر سے بہتر انداز میں برتنے کے (سائنسی) اصول و قوانین کا بھی انکار کرنا پڑ جاتا ہے۔ اس طرح وحی کی

خود ساختہ اہمیت قائم کروانے کے لئے بہت ساری چیزوں کو ان کی جگہ سے ہٹا دینا پڑتا ہے جس کی وجہ سے فکری توازن جاتا رہتا ہے اور نظریاتی و اقعاتی اعتبار سے آدمی دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا۔

جب آپ خارج کو ''اصل حقیقت'' کے ساتھ عقلی اعتبار سے بالکل ہی منقطع اور غیر متعلق مان لیتے ہیں تو یہیں پر آپ ایمان قبول کرنے کے معاملے میں عقل کے کردار پر پابندی قائم کر دیتے ہیں۔ وحی کی نشانیاں خارج میں نہ پاکر عقل کے پاس کیا رہ جاتا ہے جو اُسے وحی کو برحق تسلیم کرنے پر آمادہ و راغب کرے؟ چنانچہ آپ کو ایمان لانے کا غیر اختیاری اور جبری نظریہ تشکیل دینا پڑتا ہے۔ جس میں ظاہر ہے خارج کا ''حقیقت'' سے ربط قطعاً غیر متعلق و غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کے تحت خدا جس کے دل میں چاہتا ہے ایک الہامی انداز میں ایمان کی شمع روشن کر دیتا ہے، خواہ اسے دین کی تعلیمات کی ہوا بھی نہ لگی ہو (حتیٰ کہ خوابوں میں نبی کریم ﷺ آ آکر کافروں کو کلمہ پڑھوا کے مسلمان کرواتے بیان کیے جاتے ہیں!) اور جسے چاہتا ہے اس الہام سے محروم رکھتا ہے۔ اس طرح ایمان قبول کرنے نہ کرنے کا سارا معاملہ خدا پر موقوف ہو رہتا ہے، اور بندوں کا اپنا کردار درمیان سے غائب ہو جاتا ہے۔ اور ہو بھی کیوں نہ، جبکہ اس کردار کو ادا کرنے کے تمام قرائن اور لوازمات اس سے پہلے غائب کرائے جا چکے ہوتے ہیں! (یعنی خارج اور ظاہر کائنات کو ایک بے حقیقت، غیر مربوط، بے معنی اور نتیجتاً مہمل و عبث شے ثابت کر کے۔) ایک بے معنی و بے حقیقت شے سے انسان کو کسی چیز (یعنی وحی) کے سچے ہونے کی گواہیاں اور نشانیاں تو ملنے سے رہیں۔ لیکن ایمان لانا بھی فرض ہے!! چنانچہ یہ فرضیت پھر اس طرح طے پاتی ہے کہ بندوں کی بجائے یہ خود خدائے تعالیٰ کے اوپر ثابت ہوتی نظر آتی ہے۔ معاذ اللہ، یوں ایمان لانے کا معاملہ ایک ''تکوینی امر'' ہو رہتا ہے، جس کا تعلق صرف خدا سے ہوا کرتا ہے اور معاملے کا ''تشریعی پہلو'' خارج از سوال ہو جاتا ہے

جس کی ذمہ داری بندوں پر ہوا کرتی ہے۔ اس طرح جبریت کے نظریے کو تقویت ملتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ''اصل حقیقت'' کی پہچان اور بندوں کے لیے اس کی ''آزمائشی حیثیت'' کا ہونا بھی محلِ نظر ہو جاتا ہے۔ پھر ایمان کے اس نظریے سے متفرع ہونے والی دعوت دین میں بھی جبریت پوری طرح کارفرما نظر آتی ہے، جس کی وجہ سے یہ دعوت کی بجائے ایک دعٰوی بن جاتی ہے، کیونکہ اسے خارجی دلائل وقرائن سے مبرہن کرنے کا اہتمام نہیں کیا جاتا، بلکہ ان کو دلائل ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔

عقل وحواس جب خداوندِ فطرت کی طرف سے انسان کو عطا کیے گئے ہیں تو اس کا ایک طے شدہ مقصد ہے اور دونوں کا ایک باقاعدہ کام۔ ان دونوں کا کردار صرف یہی نہیں کہ دنیا گزارنے میں انسان کے لئے ضروری وکارآمد ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور جن وانس کو جس مقصد کے لئے پیدا فرمایا ہے اس مقصد کو تکمیل تک پہنچانے میں انسان نے اپنا کردار انہی کے ذریعے ادا کرنا ہوتا ہے۔ یعنی ان کا ''دنیاوی کردار'' تو اپنی جگہ، جس سے کسی کو انکار نہیں، ان کا ''دینی کردار'' البتہ اہمیت میں اس سے کہیں بڑھ کر ہے، جس کے لئے ہی انہیں انسانی شخصیت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ تاہم ان کے دنیاوی کردار کی طرح ان کا دینی کردار بھی اسی دنیا اور اس کے مظاہر سے شروع ہوتا ہے (جو کہ اصل نکتہ بحث ہے) کیونکہ ان دونوں کا دائرۂ عمل اپنی نوعیت میں مادی ہے۔ حتی کہ علم وحی سے بھی عقل کا اتصال ابتداءً اسی طرح ہوتا ہے جس طرح دیگر علوم سے۔ کیونکہ ایک عام آدمی کے لئے (مسلمان ہونے سے قطع نظر) یہ بھی دیگر علوم کی طرح مدوّن شدہ ایک علم ہے۔ اب ایک غیر نبی حقیقت تک پہنچنے کے لئے وحی کے تجربے سے تو گزرنے سے رہا۔ اس کے پاس بھی لے دے کر وہی حواس خمسہ اور وہی ایک عقل ہے جس سے کام لیتے ہوئے اس نے حق کو پہچانتے ہوئے حقیقت تک پہنچنا ہے۔ ایسا شخص اگر کائنات میں فکر وتدبر کے ذریعے اس کی حقیقت کی بابت کچھ

سوالات، الجھنیں، اشکالات اور نتائج زیر غور لا ہی نہ سکتا ہو، نہ کائنات ہی اسے سوچنے پر مجبور کر دینے والے کچھ ایسے اشارے دے سکتی ہو تو وحی کا علم بھلا اس کی کونسی مشکل کا مداوا کر پائے گا؟ بلکہ وہ شخص ایسے کسی علم کی طرف رجوع کی طلب ہی کیونکر رکھے گا؟؟

پس حقیقت مطلقہ ((Absolute Reality تک پہنچنے میں عقل کے کام کا آغاز اسی مادّی جہان اور اس کی موجودات سے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ضروری اور بدیہی ہے کہ عقل اس دنیا کے ظاہر سے اس کے باطن اور اس کی حقیقت تک رسائی حاصل کرے تو لازم ہے کہ اس ظاہر اور باطن کے درمیان کوئی کمال درجے کا عقلی ربط وضبط ہو، اور جو عقل کو مہمیز بھی دیتا ہو۔ لیکن اس کی گرہ علمِ وحی سے ہی کھل سکتی ہو۔ تاکہ اس کی اہمیت اور فوقیت اپنی جگہ قائم رہے۔ البتہ وحی کا اس ظاہر و باطن کے درمیان ہونا عقل کو آپ اس حقیقت کی طلب و تلاش سے بھی نہ روکتا ہو۔ بلکہ عقل میں (نہ کہ محض فطرتِ انسانی میں) اس طلب و تلاش کی کیفیت کا پاجانا (نظم و نظام کائنات کی ہیئت کی وجہ سے) اور اس کا ابتداءً "میانِ غیب و حضور" بھٹکتے پھرنا اس پر وحی کے صحیح طور پر اثر انداز ہونے کے لئے ایک درجہ میں مطلوب بھی ہو۔

اصل حقیقت کا ماخذ "وحیٔ الٰہی" اور "شریعت" ہونے کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ خارج اور ظاہر حقیقت سے عقلی طور پر منقطع ہی ہوں گے۔ اور نہ یہ کہ خارج کے اجزاء آپس میں کوئی عقلی ربط نہ رکھتے ہوں گے۔ ایسی کوئی دلیل جبکہ خود وحیٔ الٰہی اور شریعت میں موجود نہیں ہے تو ان پر ایمان رکھنے والوں نے اسے کہاں سے درآمد کر لیا؟ اگر انہوں نے اسے عقلی طور پر اخذ کیا ہے تو کیا اس طرح انہوں نے خود "حقیقت" کی بابت کوئی رائے رکھنے میں اس کے اصل ماخذ سے ماورا ہونے کی جسارت نہیں کر لی؟؟؟

کیاسائنسی علوم اور شرعی علوم میں ہم آہنگی ہو سکتی ہے ؟

سائنس کی منہاج(Paradigm) مظاہر کائنات سے علاقہ رکھتی ہے۔ کائنات میں ہمہ وقت جاری وساری اَن گنت واقعات وامور میں ارادۂ الٰہی نے اگر کچھ موزونیت اور اصول پنہاں کر رکھے ہیں تب تو یہ دنیا ایک بامعنی اور بامقصد جہان ہے ، وگرنہ محض تو ہم کا کارخانہ۔ لیکن جبکہ ایسا نہیں ہے، یعنی حقیقتاً کائنات خالق کے طے کردہ کچھ طبیعی اصولوں کے تحت چلی جارہی ہے، اور ابتدائے آفرینش سے ہی یہ اصول و قوانین انسان کی عقل سے اتصال کرتے اور اس کے مشاہدے میں آتے رہے ہیں توانسان کے ہاں اِن اصولوں کے مطالعہ کے کسی ایسے طریقے کا وضع ہو جانا جواِن کی ٹھیک ٹھیک دریافت پر منتج ہوتا ہو، قیاس کا عین تقاضا ہے۔ یہ طریقۂ مطالعہ سائنس کہلاتا ہے۔ مختصراً، انسانی عقل وحواس کو بروئے کار لاتے ہوئے ان فطری اصولوں کو طبیعی طور پر معلوم کر لینے کا نام سائنس ہے۔

سائنس کا دائرۂ کار یہی ہے کہ وہ مادے کے برتاؤ اور اس کے عمل کرنے کے طبیعی اصولوں سے بحث کرتی ہے، اور بس۔ اس دائرے سے ہٹ کر کوئی گفتگو کرنا سائنس کے بس کی بات ہی نہیں ہے، کجا یہ کہ وہ اپنے دائرے سے باہر کسی شے کے ہونے یا نہ ہونے کا دعوی کرتی پائی جائے، اور لوگ اسے سائنس کی دخل در معقولات ماننے پر مجبور ہوں۔! عالم غیب (کہ جہاں ''حقیقت'' چھپی ہوئی ہے!) کے بارے میں سائنس جو ہمیشہ سے خاموش ہے تو کوئی اس لیے نہیں کہ وہ اس عالم کی منکر ہے، بلکہ در حقیقت سائنس کی اتنی ''اوقات'' ہی نہیں ہے کہ وہ عالم غیب کی بابت مثبت یا منفی کوئی بات کر سکے۔ وہ تو اس کا انکار کر سکتی

ہے نہ اقرار، کہ وہ اس کے حیطۂ انکار واقرار سے ہی باہر ہے۔ البتہ کوئی سائنسدان اگر اپنے طور پر اس موضوع پر اظہارِ خیال کر دیتا ہے تو اِس میں بے چاری سائنس کا کیا قصور؟ سائنسی طریقۂ مطالعہ تو اپنی حدود سے باہر کسی موضوع پر لب کشائی کی ذمہ داری اپنے سر لینے کا روادار نہیں ہے۔ نہ یہ اپنے علاوہ کسی اور دائرے کا اِحاطہ کرنے والے، کسی دوسرے طریقۂ مطالعہ و تفکیر کا انکار یا اس سے تصادم ہی کرتا ہے۔ لیکن اگر سائنس عالمِ غیب سے بحث ہی نہیں کرتی تو کیا اس سے اس کا کفر اور الحاد پر مبنی ہونا لازم آتا ہے؟ ایسا ہے تو پھر جو چیز سائنسی مطالعے کا بنیادی نقطۂ ترکیز ہے (یعنی مادّہ) اس کا ماننا بھی پھر کفر اور الحاد ہے۔ لیکن مادے کا وجود تسلیم کرنے سے ماورائے مادّہ کا انکار لازم نہیں آتا۔ ایک شے کا اثبات دوسری کی نفی کو مستلزم نہیں ہوتا۔

سائنسی طریقۂ مطالعہ میں ایک مؤمن اور ایک ملحد شخص برابر ہو سکتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ممکن ہے کہ آخرالذکر شخص سائنسی دریافتوں سے اپنے کفر والحاد پر شواہد لیتا ہو جبکہ پہلا شخص انہیں اپنے ایمان بالغیب کے لئے ایک نشانی کے طور پر لیتا ہو جس کی وجہ خود سائنس نہیں بلکہ وہ نظر (Vision) ہو گی جس کے تحت سائنس بلکہ ہر ایک شے کو دیکھا اور برتا جا رہا ہو، اور جو قلب و ذہن میں پہلے سے پائی جاتی ہو۔

شرعی علوم و طبعی علوم:

علم شرعیہ یعنی وحی سے حاصل ہونے والا علم اور طبیعی علوم یعنی سائنس دونوں ہی فطرت کے اصولوں کی دریافت و تحقیق پر موکوز ہوتے ہیں۔ فطرت کے کئی پہلو اور جہتیں ہو سکتی ہیں۔ فطرت اپنی حقیقت وماہیت کی بنیاد پر بنی نوع انسان سے جن مقاصد کی تکمیل ہوتے دیکھنا چاہتی ہے اس کے لیے وہ اس کو عالمِ

طبیعی کا میڈیم فراہم کرتی ہے، جس کے دائرے اور قاعدے میں رہتے ہوئے انسان نے فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کرنی ہوتی ہے۔ چنانچہ فطرت کی کنہ اور اس کے مقاصد کے اصول اپنی جگہ، اور ان مقاصد کے حصول کے لئے فراہم کردہ میڈیم کے عمل کرنے کے اصول و قوانین اپنی جگہ۔ شرعی علوم فطرت کے پہلی قسم کے اصولوں سے بحث کرتے ہیں اور سائنسی علوم دوسری قسم کے۔ پہلی قسم کے اصول خداوندِ فطرت نے وحی کے ذریعے انسان تک پہنچائے اور ان کا جاننا اور ماننا انسانیت پہ فرض کر دیا، کہ یہ حقیقت کی "اصل" اور اس کے مقاصد سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ دوسری قسم کے اصولوں کو سمجھنے اور ان سے تفاعل کرنے کے لئے انسانی عقل کو آزاد چھوڑ دیا۔ البتہ چونکہ ہر دو قسم کے اصول و قوانین کی پنہائی، فطرات کی مشّاطگی سے ہی ودیعت کردہ ہے، اس لئے اسی کی طرف سے طبیعی اصولوں کے نظام کو شرعی اصولوں کے نظام یا مبداء (origin) کے لئے ایک طرح سے ایک نشانی اور indicator بنایا گیا۔ پھر انسانی قلب وذہن میں حقیقت کی کنہ کی جستجو لگا کے دہر میں وَحی کا ڈنکا بجا دیا۔ یعنی ایک طرف طبیعی و مادّی امور سے غیر طبیعی و غیر مادّی امور کے ہونے کی نشانیاں دکھلائیں، پھر طبیعی اصولوں کے نظام سے اس طرف راہ سجھلائی کہ اس سے بھی بالاتر اور عظیم تر اصولوں کا کوئی ایسا نظام بھی ضرور موجود ہے جو مادّی و طبیعی امور سے بلند تر معاملات کو کنٹرول اور طے کرتا ہے، اور یہ کہ انسانیت کے وجود کا مقصد اور غرض وغایت کسی ایسے ہی نظام سے پتہ چل سکتی ہے، اور اس کے بعد انسانوں میں سے ہی اپنے نیک طینت و پاک فطرت فرستادوں کے ذریعے وحی کی شکل میں یہ پورا نظام انسانیت کے سامنے اُس کے ایمان و تسلیم اور نتیجتاً اُس کی وسیع تر فلاح و کامیابی کے لیے پیش کر دیا۔ اور اِس سارے عمل کو اِنسانیت کی آزمائش قرار دے کر اس کی پیدائش کا ہی اصل مقصد ٹھہرا دیا۔

اس طرح طبیعی اصول اور شرعی اصول ایک ہی سلسلے کی دو باہم منسلک کڑیوں کے طور پر ترتیب پاتے ہیں۔ چنانچہ یہ طبیعی اصول، شرعی اصولوں سے انتہائی مختلف نوعیت رکھنے کے باوجود بطور ایک نظام ان کے ساتھ ایک گونہ استنتاجی ربط و تعلق کے حامل ہوتے ہیں۔

طبیعی اصول اگر کائنات میں کارفرماہی نہ ہوتے تو دوسری بات تھی لیکن اس طرح معاذاللہ خداوندِ فطرت کا غیر حکیم ہونا لازم آتا۔ اصول تو وہی ہوتے ہیں جن میں ایک باہمی ربط، نظم، توازن، ہم آہنگی اور یک رنگی پائی جاتی ہو۔ اصولوں کا کوئی نظام انہی خصوصیات کی بناء پر تشکیل پاتا ہے۔ یعنی اصول الگ الگ انفرادی حیثیت میں نہیں پائے جاتے بلکہ اپنی قبیل کے دیگر اصولوں کے ساتھ ایک مکمل نظام کی صورت میں وجود رکھتے ہیں کہ جن کے درمیان زبردست ہم آہنگی اور یک رنگی پائی جاتی ہے۔ پھر کسی نظام کا پایا جانا اس کے کسی یکہ وتنہا سرچشمہ کے ہونے پر دلالت کرتا ہے جو درحقیقت اس نظام کو برپا اور قائم کیے ہوئے ہے۔ اس کے برعکس کائنات میں ہمہ وقت جاری طبیعی حوادث وواقعات کے پیچھے طبیعی اصولوں کے کارفرمانہ ہونے کے تصوّر سے کائنات میں توازن، نظم اور یک رنگی ((uniformity پائے جانے کی نفی ہوتی ہے، جس سے خالق کا حکمت سے خالی ہونا تو، معاذاللہ، لازم آتا ہی ہے، طبیعی واقعات وحوادث کا بے ہنگم، بے ڈھب، بے نظم اور بے ربط طور پر واقع ہونا بھی لازم آتا ہے جو ''فساد'' کے لوازمات میں سے ہے، جس سے درپردہ اس نظریے کو تقویت مل سکتی ہے کہ کائنات میں بیک وقت کئی مختلف قوتوں کے سرچشمے برسرِ عمل ہیں۔! جن میں سے ہر ایک دوسرے سے جدا و بیگانہ ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ

’’اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور بھی الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو جاتے۔ پس اللہ، عرش کا رب، ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ (اُس کے لیے) بیان کرتے ہیں۔‘‘(الانبیاء۔22)

گویا کائنات میں توازن و یک رنگی اور اُس کے جاری و ساری ہونے میں طبیعی اصولوں کے کسی نظام کا پنہاں ماننا وحدانیتِ خداوندی کا ایک تقاضا ہے۔

کیا شک ہے کہ کائنات کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا وقوعہ بغیر ارادۂ الٰہی و منشائے خداوندی کے انجام نہیں پاسکتا۔ اس کی مرضی، اختیار اور علم کے بغیر پتّا بھی نہیں ہلتا اور ذرہ بھی نہیں سرکتا۔ وہ زبردست قدرت والا غالب و قاہر ہے۔ اس کا حکم اور اختیار ہر ایک شے کے ظاہر و باطن پر بدرجۂ اُتم طاری اور جاری و ساری ہے۔ اس کی بلاشرکت غیرے فرمانروائی، اقتدار اور سلطنت سے کسی کو ایک ذرہ برابر چھوٹ اور راہِ فرار کا امکان نہیں۔ ہر اِک شے اور ہر اِک امر اپنی انجام دہی کے لئے ہر آن ایک اسی کا رہین التفات ہے۔

البتہ وہ قادر ہے حکیم و دانا ہونے کے ساتھ، اور غالب و قاہر ہے علیم و خبیر ہونے کے ساتھ۔ بے مقصدیت اس کو روا نہیں۔ بے معنی کام اس کو زیبا نہیں۔ ’’عبثیت‘‘ سے وہ پاک ہے۔ لہو و لعب ہرگز اس کے شایان شان نہیں۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا لَاعِبِیْنَ o مَا خَلَقْنَاھُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ o

’’ہم نے زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان کی چیزوں کو کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ بلکہ ہم نے انہیں درست تدبیر کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔‘‘(الدّخان۔39،38)

اسی نے جب اپنے بندوں کو کائنات میں اس کی نشانیاں دیکھنے اور ان میں فکر وتدبر کرنے کا حکم دیا ہے تو ضرور کائنات اور عقلِ انسانی میں کوئی ربط و تعلق رکھا ہے۔اور عقلِ انسانی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر شے کو اس کے اطراف اور ساتھ پائی جانے والی اشیاء کے حوالے اور تعلق سے دیکھتی اور سمجھتی ہے۔یوں اشیاء میں خود بخود ایک خاص ربط اور ہم آہنگی کا ہونا ناگزیر ٹھہرتا ہے،ایسا ربط و تعلق جو انسانی عقل کی گرفت میں آسکتا ہو۔ اشیاء کے باہمی ربط و تعلق سے ان کے عمل کرنے اور واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے کچھ اصولوں کا پایا جانا بھی پھر ضروری ٹھہر جاتا ہے،ایسے اصول جو انسانی عقل سے دریافت کیے جا سکتے ہوں۔

پس کائنات میں ایک طرف طبیعی امور و واقعات کے رونما ہونے کے لئے خدا ہی کی طرف سے مقرر کردہ طبیعی اصولوں کے کسی نظام کا ہونا، اور دوسری جانب ہر ایک انفرادی واقعہ میں ارادۂ الٰہی کا الگ سے کارفرما و پنہاں ہونا ایک زبردست حکمت الٰہیہ کا مظہر ہے، جس کی بدولت نہ تو یہ کائنات ہی ایک بے نظم، بے ڈھب، ناقابل ضبط اور عقل انسانی سے بے تعلق شے قرار پاتی ہے اور نہ کوئی بھی چیز ایک لمحہ کے لئے بھی غلبہ وقدرت خداوندی سے آزاد ٹھہرتی ہے۔

البتہ کچھ لوگ طبیعی اصولوں کے کسی نظام کا پایا جانا تسلیم کر لینے کو ہر ایک انفرادی وقوعہ میں ارادۂ خداوندی کے الگ سے موجود ہونے کا انکار سمجھ بیٹھتے ہیں۔یعنی جب ہر واقعہ کچھ لگے بندھے اصولوں کے تحت انجام پا رہا ہے تو خدا کا ارادہ ہر واقعے کے پیچھے تو کارفرما نہ ہوا! چنانچہ ایک کو دوسرے کا نقیض سمجھتے ہوئے انہیں ان اصولوں کے کائنات میں پنہاں ہونے کا ہی انکار کرنا پڑ جاتا ہے۔جب ایسے کوئی اصول موجود ہی نہیں تو اشیاء و واقعات کے ہونے اور عمل کرنے میں ان کا باہمی کوئی ربط اور تعلق نہیں! کیونکہ اس ربط و تعلق سے ہی تو یہ اصول وجود پاتے ہیں اور اس تعلق کی وضاحت کرتے ہیں۔اس طرح انہیں یہ ماننا پڑ جاتا

ہے کہ ہر ایک انفرادی وقوعہ تنہا ارادۂ خداوندی کا نتیجہ ہونے کے ناتے گردوپیش کے باقی تمام واقعات واشیاء سے آزاد اور لاتعلق ہو کر انجام پاتا ہے۔ یوں مشیئت الٰہی نے جب وقوعات کے درمیان کوئی طبیعی ربط نہیں رکھا تو حوادث کے وقوع پذیر ہونے کے طبیعی اصول نام کی کسی شے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی۔ جب یہ اصول فطرت میں پائے ہی نہیں جاتے تو ان کو ضبط میں لانا چہ معنی دارد؟ یوں انکار کا یہ سلسلہ دراز ہوتے ہوتے بالآخر سائنسی طریقۂ علم ہی کے انکار پر جا منتج ہوتا ہے۔

گویا واقعات میں ربط اور تسلسل، اور ان کے رُوپذیر ہونے کے طبیعی اصولوں کو تسلیم کر لینے سے یہ ماننا لازم آسکتا ہے کہ خدا نے اس کائنات اور اس کے نظام کو کچھ مخصوص اصولوں کے تحت بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اور اب کائنات کا نظام خود بخود خالق کی منشا سے لاتعلق ہو کر ان اصولوں کے تحت چلا جا رہا ہے، جس طرح گھڑی ساز گھڑی کو بنا کر چھوڑ دیتا ہے اور وہ اپنے تیار کرنے والے سے آزاد طور پر چلتی رہتی ہے۔ ظاہر اس طرح کی سوچ رکھنا سراسر الحاد و کفر ہے لیکن ان کے حق میں جو پہلے سے ہی ملحد ہیں۔ مسلمانوں پر یہ کفر تو تب لازم آئے جب ان طبیعی اصولوں کے وجود اور اثر پذیری کو ماننے سے واقعی خالق کائنات کے ہمہ وقت کارفرما ارادے سے بالاتری اور بے نیازی کا تصور لازم آتا ہو۔ خالق کے قائم کردہ ان طبیعی اصولوں کو ماننا نیچریت نہیں ہے۔ کیونکہ نیچرسٹ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان اصولوں کو غیر استثنائی مانتے ہیں اور خود خالق کو ایک طرح سے ان اصولوں کے آگے مجبور۔ جبکہ ایمان والے تو ہر ایک وقوعے کی نسبت خدائے علیم و حکیم کی طرف ہی کرتے ہیں۔ اس کی انفرادی حیثیت میں بھی اور کسی سلسلۂ واقعات میں ایک کڑی کی حیثیت میں بھی۔ کیونکہ اللہ کی قدرتِ مطلقہ و کاملہ پر ایمان رکھنے والے اس کی حکمتِ واسعہ و بالغہ پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ اور ان دونوں کے آثار وہ زمین و آسمان میں خدا کی جاری کردہ بے شمار سنتوں میں واضح طور

پر دیکھتے ہیں۔ یہ سنتیں خواہ بندوں کے اعمال کے نتیجے میں ظاہر ہوں یا کائنات کے ''افعال'' کی صورت میں، ہر طرح سے یہ خدا ہی کے بنائے ہوئے اصول و قوانین کو واضح کرتی ہیں۔ البتہ استثناء ہر دو اقسام کی سنتوں میں پایا جا سکتا ہے، جو ہر ایک انفرادی معاملے میں خدائی ارادے کی برتری اور غلبہ کو ظاہر کرتا ہے۔ استثناءات البتہ کہیں بھی ہوں، اصول و قوانین کی ضبط و تدوین میں آڑے نہیں آتے۔

خدا کی فرمانبرداری یا نافرمانی کی جانے کے حوالے سے جو خدائی سنتیں ازل سے چلی آ رہی ہیں، جن کے تحت کبھی انسان کی بداعمالیوں کے سبب خشکی اور تری میں فساد پھیل جاتا ہے اور کبھی اس کی فرمانبرداری کے صلہ میں زمین و آسمان سے برکات کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، تو جب ان ''شرعی اسباب'' پر مبنی خدائی سنتوں کے اصول و قوانین طے شدہ ہو جانے سے ارادۂ خداوندی کا معطل ہو جانا لازم نہیں آتا تو مادّی اور طبیعی اسباب پر مبنی خدا ہی کی طے کردہ سنتوں اور اصولوں کے متعین ہو جانے سے کیونکر ایسا لازم آ سکتا ہے؟؟

کسی قسم کے فطری اصولوں اور قوانین کے وجود رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ لازماً قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہوں۔ قرآن و سنت بنیادی طور پر شرعی اصولوں اور شرعی اسباب سے بحث کرتے ہیں۔ تاہم وہ مادی اور طبیعی اصولوں اور ان کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کرتے۔ یہ تو علوم شرعیہ کی اپنی منہاج کا تقاضا ہے کہ وہ کچھ خاص قسم کے اصولوں سے ہی بحث کریں۔ چنانچہ طبیعی علوم ان کی راہ میں آڑے نہیں آتے اور یہ خود طبیعی علوم کے آگے رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ شرعی علوم اور طبیعی علوم دونوں فطرت کے علوم ہیں۔ ان دونوں کی منہاج کا فرق یہی ہے کہ شرعی علوم عقل سے نہیں گھڑے جاتے، بلکہ

ان کے لیے وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ طبیعی علوم کے لیے وحی کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ عقل کے ذریعے معلوم ودریافت کیے جاسکتے ہیں۔

طبیعی اصول و قوانین_ جو خداوند فطرت نے ہی کائنات کے وقوعات میں اثر پذیر فرمائے ہیں، لیکن یہ کسی انفرادی وقوعہ میں ارادۂ خداوندی کے الگ سے پنہاں ہونے میں مانع نہیں ہیں_ یہ طبیعی اصول اگر اس کائنات میں پنہاں ہیں تو پھر محال ہے کہ انسانی عقل کبھی اِن کو دریافت ہی نہ کر سکے۔ یعنی شب و روز صدیوں سے مادّی عوامل وامور انسان کے سامنے رُونما ہوتے رہیں اور عقل کی نعمت غیر مترقبہ رکھنے والی یہ اکلوتی مخلوق کبھی یہ معلوم کرنے پر ہی نہ آسکے کہ یہ طبیعی عوامل کیسے اور کیونکر واقع ہوتے ہیں۔! یا اگر معلوم کرے بھی تو بھی صدیوں کے سفر اور ذہنی ومادّی ارتقاء کے باوجود ہمیشہ غلط اندازوں اور نتائج ہی تک پہنچے۔! یا کبھی اگر ''بظاہر'' درست اندازوں تک پہنچ بھی جائے تو بھی اس کا نتیجہ کبھی حتمی نہ ہو۔ اور یہ جہان اور اس کے مظاہر انسانی عقل کے لیے ہمیشہ ایک دھوکا، سراب اور گورکھ دھندہ یا ایک ''شجر ممنوعہ'' کی سی حیثیت اختیار کیے رکھیں۔ اس طرح حقیقت تو کجا، ''حقیقت کے مظاہر'' ہی انسانی عقل کی ضبط بندیوں سے بالاتر قرار پائیں۔ پھر سوائے اس ایک بات کے انسانی عقل کسی حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو کہ مظاہرِ کائنات اور عقل، ہر دو کی کوئی ضرورت ہے نہ مقصد! اور باقی حقیقتوں کے لیے کسی ''الہام'' کا منتظر رہنا پڑے۔

رہا یہ کہ تاریخ کے سفر میں انسان بہت سے اپنے ہی سائنسی نظریات بدلتا اور ردّ کرتا چلا آیا ہے، تو اِس سے یہ کہاں طے پا گیا کہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا رہے گا، اور کبھی کوئی نظریہ حتمی شکل اختیار ہی نہیں کر سکے گا؟ جب تک نظریات، مفروضہ (Hypothesis) کے phase میں ہوتے ہیں، اور ان کو تجربات کی مدد سے پرکھا اور جانچا نہیں گیا ہوتا، یا تجربات سے ان کی تصدیق نہیں ہوئی ہوتی، تب تک تو اس بات کی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ کسی phenomenon کی تشریح کرنے والے کسی سائنسی نظریے کی جگہ کوئی اور نظریہ لے آیا جائے۔ لیکن تجربات سے بار بار ثابت ہو جانے کے بعد جب وہ مفروضہ، تھیوری کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو پھر یہ گنجائش قریب قریب ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مزید سائنسی ترقی کے نتیجے میں پہلے سے ثابت شدہ کسی نظریے میں کوئی پیشرفت کر لی جائے، یا اس میں کوئی بہتری لے آئی جائے۔ سائنسی نظریات کی صداقت یا صحت دنیا میں پائی جانے والی سائنسی و ٹیکنالوجیکل ترقی کی صورت میں بہ آسانی بچشم سر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ طبیعی اصول و قوانین عالم میں اگر کارفرما نہیں ہیں، یا اگر کارفرما تو ہیں مگر صحت و یقین کے ساتھ معلوم نہیں کیے جا سکتے، تو دنیا میں ایجاد کردہ ہزارہا آلات، پرزے، مشینیں، مصنوعات اور پلانٹس انسانیت کو کیونکر اپنی پیداوار، ثمرات اور مضمرات بہم پہنچا رہے ہیں؟؟ یا یہ بھی محض فریبِ نظر، اور فہم کا دھوکا ہے؟ یا یہ کہ یہ ایجادات اور دریافتیں بھی صرف الہامات کا نتیجہ ہیں، اور عقل نے بہر صورت لبِ بام تماشا ہی دیکھنا ہے؟؟؟

کائنات میں کارفرما طبیعی اصولوں میں یک رنگی و استمرار (uniformity)، ان کی مدد سے طبیعی واقعات اور اشیاء کے وقوع پذیر ہونے کی بابت ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا جانا (predictability) اور ان کی مقداری و تحسیبی حیثیت (computability) کا ہونا دنیا کا ایک مسلّمہ واقعہ بن چکا ہے۔ یعنی

سائنسی نظریات کو اس قدر ترقی یافتہ شکل دی جاچکی ہے کہ انہیں اب بہ آسانی ریاضیاتی فارمولوں کی مدد سے بیان کیا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ اور عالمِ واقعہ میں اِن اصولوں کا اِطلاق و استعمال (یعنی ٹیکنالوجی کا حصول) اِن فارمولوں کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے۔ بعض سائنسدانوں کے بقول، طبعی اصول (physical laws) تو وہی ہوتے ہیں جنہیں فارمولوں کی زبان میں ڈھالا جاسکے۔ فارمولوں کی شکل اختیار کر لینے کے بعد طبعی اصولوں کی مذکورہ تینوں خصوصیات یعنی uniformity، predictability اور computability انتہائی واضح طور پر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ اِس کے بعد اِن فارمولوں کی پشت پر پائے جانے والے سائنسی نظریات کے تبدیل یا رڈ ہونے کے اِمکانات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

اس کی ایک انتہائی سادہ مثال سورج گرہن اور چاند گرہن ہونے کی سائنسی پیشینگوئیاں ہیں۔ فلکیات اور ہیئت کے علوم سے تعلق رکھنے والے سائنسدان اپنے علم کی مدد سے مہینوں پہلے اِن واقعات کی جو پیشینگوئی کر دیتے ہیں، وہ بعد ازاں اپنے وقت اور مقام کے اعتبار سے بالکل درست اور صحیح (exact & accurate) نکلتی ہیں۔ جدید دنیا کے باسیوں کے لیے یہ بات تقریباً معمول کا ایک واقعہ بن چکی ہے، کہ وہ اِن فلکیاتی پیشینگوئیوں کی صداقت اور صحت بارہا ملاحظہ کرتے رہے ہیں۔ یہ سائنسدان اتنی درست پیشینگوئی کیسے کر جاتے ہیں؟ کیا اُن کے ہاتھ علمِ غیب کا کوئی سرا لگ جاتا ہے، یا یہ کہ وہ اجرامِ فلکی سے متعلق طبعی اصولوں پر مبنی ریاضیاتی فارمولوں کی مدد سے اِن اجرام کی حرکت و رفتار وغیرہ کی تحسیب کے ذریعے ان نتائج تک پہنچتے ہیں؟ در حقیقت ایسے محض ایک واقعے کی درست اور مکمل prediction کے لیے کئی ایک ریاضیاتی تخمینات (Mathematical Calculations) کی مدد لی جاتی ہے۔ پھر ہر ایک تخمین اور فارمولے کے ساتھ کئی ایک سائنسی نظریات متعلق ہوتے ہیں، جن میں سے کسی ایک جگہ

بھی ذرا سی غلطی نتائج میں بہت بڑا فرق لے آنے کا باعث بن سکتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نتائج مذکورہ مثال کے حوالے سے ہمیشہ سو فیصد درست نکلتے ہیں۔

اِس مثال سے کم اَز کم یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ بہت سے پیچیدہ طبیعی اصول _ جو خالقِ کائنات نے ہی وضع فرمائے ہیں _ اِنسانی عقل سے بالکل صحیح صحیح طور پر معلوم و دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ پھر جب خلا میں موجود اجرام سے متعلق اتنے درست سائنسی نظریات قائم کیے جا سکتے ہیں جو اِنسان کی پہنچ اور رَسائی سے حقیقتاً بہت ہی دور ہیں تو انسان خود اپنی دنیا کے کرّۂ حیات (Biosphere) سے متعلق سائنسی نظریات رکھنے میں درستی اور صحت کے مقام پر کیوں نہیں پہنچ سکتا؟!

مظاہرِ کائنات اور ان کے طبیعی اصول _ یعنی سائنس _ اگر خود حقیقت نہیں، تو حقیقت سے جدا اور منقطع بھی نہیں۔ حقیقت سے ہی پھوٹنے اور اس سے ایک زبردست تعلق و ہم آہنگی رکھنے کے ناتے یہ اِنسان کو حقیقت ہی کی طرف پلٹاتے اور اسی کا سرا تھماتے نظر آتے ہیں۔ کوئی تھامنے پر آئے تو۔!

تحریر محمد بن مالک، ایقاظ

شرعی دلیل بیک وقت عقلی کیوں نہیں ہو سکتی؟

بعض اصطلاحات، جو کہ کچھ علوم اور فنون میں استعمال ہوتی ہیں، بسا اوقات ہمارے ذہنوں کو ایک جامد اور بے روح ساخت دے دیتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ہم اسی ساخت کے پابند ہو جاتے ہیں۔ تب حقائق کو ہم انہی اصطلاحات کے قالب میں رکھ کر دیکھنے کے قابل رہ جاتے ہیں۔ یوں حقائق پر اصطلاحات غالب آجاتی ہیں اور حقائق فنون کے ملبے تلے آجاتے ہیں!

حقائق کو جاننے اور سمجھنے کیلئے آپ کوئی سی بھی زبان استعمال کر سکتے ہیں۔ جب تک حقائق اپنی ساخت نہیں بدلتے یا کسی خاص ساخت کا پابند نہیں کر دیے جاتے تب تلک کوئی سے بھی الفاظ اور پیرائے آپ حقائق کے بیان اور تفہیم کیلئے اختیار کر سکتے ہیں مگر معاملہ جب اس حد سے گزر جائے اور الفاظ، اصطلاحات اور فنون حقائق کی قید گاہ بنا دیئے جائیں تو ان کو اس سے آزاد کرا دینا بھی از حد ضروری ہو جاتا ہے۔

اشیاء کو عقلی دلائل سے ثابت کرنا، اشیاء کو شرعی دلائل سے ثابت کرنا.... بڑی حد تک ایک دوسرے کی ضد ہو گیا ہے۔ بعض لوگوں کو 'عقلی دلائل' لطف دیتے ہیں اور بعض کو صرف اور صرف 'شرعی دلائل' سے ہی غرض ہوتی ہے اور کچھ اس طرح کہ جیسے 'شرعی دلیل' بتاتے ہوئے 'عقل' کو چڑانا مقصود ہو!

'شریعت میں عقل کا کیا کام؟' یہ انداز فکر ایک بڑی تعداد کے ہاں اختیار کیا گیا ہے۔ 'جب تک عقلی توجیہ نہ ہو جائے تب تک شریعت کی باتیں جمود کی علامت دکھائی دیتی ہیں' دوسری جانب یہ طرز فکر بھی کچھ کم مقبول نہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں تضاد کیونکر فرض کر لیا گیا؟ آخر اس 'مقابلے' کی نوبت ہی کیونکر آئی؟ عقل اور شریعت میں مغایرت کے قالب میں ہمیں کس نے قید کر دیا ہے؟ یہ کچھ فنون کو اور ان میں پائی جانے والی اصطلاحات کو حد سے بڑھا دینے کا ہی تو نتیجہ ہے جس کے باعث ہم صدیوں سے اس جدلیات (ڈائیلکٹس) کا اسیر ہو گئے ہیں۔

انبیاء دنیا میں آئے تو وہ 'فطرت' اور 'عقل' ہی، جو کہ انسانوں کو خدا کی جانب سے ودیعت ہوئی ہے، انبیاء کا استقبال کرتی رہی۔ انبیاء کی ساری دلچسپی اس انسانی فطرت اور عقل سے ہی رہی اور وہ اسی کو جلا دینے میں کوشاں رہے کہ یہی وہ قابلیت ہے جس سے انسان اس جوہر نایاب کو پہچان سکتا ہے جو انبیاء خدا کے ہاں سے ان کی فلاح کیلئے لے کر آیا کرتے تھے۔ انسانیت کا یہ اصل جوہر ہی نبوت کے جوہر کی شناخت کر سکتا ہے اور اس کو سراہ لینے (ایپریشی ایٹ کرنے) اور اس سے لطف اور راحت پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

پھر انبیاء نے انسانوں کو خدا کی جانب سے جو کچھ پہنچایا اس کی ہر بات عقل کو لگتی تھی۔ بے شک نبی کی بتائی ہوئی کوئی بات انسان کو پوری طرح سمجھ نہ آپائے پھر بھی عقل اس کے حق ہونے کی ہی شہادت دیتی تھی۔

کسی بات کی 'سمجھ نہ آپانا' اس کا 'خلاف عقل' ہونا نہیں۔ صرف شریعت نہیں، عقل بھی یہی کہتی ہے!

پس وہ بہت سے امور جن کو 'عقل' کی بنیاد پر رد کیا جاتا ہے یا 'عقل' کی بنیاد پر پرکھنے کی بات کی جاتی ہے، اگر نبوت سے ثابت ہوتے ہیں تو ان کو رد کرنے اور پرکھنے کی بات سب سے پہلے عقل ہی کے خلاف ہے۔

پھر اسی طرح نبوت کی بات کو ایک خشک نص بنا کر رکھ دینا اور چوں وچرا نہ کرنے کی رو میں انسان کے عقلی اور فطری قویٰ کو معطل کر دینا اور اس کو کلام نبوت سے ایک قدرتی اور بے ساختہ انداز کا تفاعل نہ کرنے دینا خود مقاصد شریعت ہی کے خلاف ہے۔

یہ دونوں متعارض رویے جو مختلف طبقوں میں کم یا زیادہ پائے جاتے ہیں دراصل ایک تاریخی جدل کا نتیجہ ہیں جبکہ اُمت کو اپنے اسی اصل پہ واپس آنا ہے جس پر سلف تھے اور اس زمانہ میں تھے جب یہ جدل نہیں پایا گیا تھا۔

یہ ایک خوامخواہ کا معرکہ تھا جو ایک فریق کی عاقبت نااندیشی نے چھیڑ دیا تھا۔ مگر یہ کہ یہ معرکہ ہمارے ذہنوں کی ساخت میں بیٹھ جائے اور ہم اسی کا ردعمل ہو رہیں، یہ ہمارے مقام سے فروتر ہے۔ یہ نہ 'شرعی' رویہ ہے اور نہ 'عقلی'۔

ایک شرعی دلیل آخر عقلی دلیل کیوں نہیں کہلا سکتی؟

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کتاب النبوات میں کچھ قرآنی دلائل کی مثالیں دیتے ہیں:

"لوگو! اگر تمہیں مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو (ذرا یہ سوچو) ہم نے تمہیں مٹی سے ہی تو پیدا کیا، پھر ایک ٹپکتے قطرے سے، پھر ایک خون کے لوتھڑے سے، پھر ایک گول مول بوٹی سے جس پر کہیں نقش نکل آئے ہوتے ہیں اور کہیں نہیں نکلے ہوتے.... اس لئے کہ ہم تم پر (یہ) معاملہ کھول دیں...."

’’پھر تم دیکھتے ہو کہ زمین بے حس و حرکت پڑی ہے پھر کیا ہوتا ہے جو نہی ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور لگی قسما قسم خوش منظر نباتات اگانے‘‘۔

تب اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا:

’’یہ سب کچھ اسی لئے تو ہے کہ اللہ ہی حق ہے (خدا ہی سب سے بڑی حقیقت ہے) اور یہ کہ وہ مردوں کو جلاتا ہے اور یہ کہ اسے ہر چیز پر کامل قدرت ہے اور یہ (دلیل ہے اس بات کی) کہ قیامت کی گھڑی آکر رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور یہ کہ اللہ ان لوگوں کو، جو قبروں میں دفن پڑے ہیں، زندہ کر لینے والا ہے‘‘۔

پھر اسی طرح سورہ مریم کی یہ آیت:

’’انسان کہتا ہے کیا جب میں مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا!؟ انسان کو کیا اتنا بھی یاد نہیں کہ پہلے بھی تو آخر ہم اس کو پیدا کر ہی چکے ہیں، جبکہ وہ کوئی چیز ہی نہ تھا!؟؟

اس کے بعد شیخ الاسلام تحریر کرتے ہیں:

’’پس انسان کی تخلیق سے خالق (کے وجود، اس کی قدرت اور اس کی وعید کی سچائی) پر استدلال کرنا ایک حد درجہ عمدہ اور مستقیم طرز استدلال ہے۔ یہ خالصتاً عقلی طریقہ ہے اور درست طریقہ ہے۔ اور یہ بیک وقت شرعی ہے۔ قرآن اس پر باقاعدہ دلالت کرتا ہے۔ اسی طرز استدلال کی جانب قرآن راہنمائی کرتا ہے اور اسی کو بار بار واضح کرتا ہے۔ سو یہ شرعی طریقہ ہوا۔ اور یہ عقلی بھی ہے۔ کیونکہ انسان کا جب کہیں نام نشان

نہ تھا تو اس کے بعد اس کا یوں پایا جانا اور پھر اس بنی نوع انسان کا وجود میں آنے کیلئے منی کے ایک ٹپکتے قطرے سے برآمد ہونا اور پانی کی اس بوند سے پہلے اس کا لوتھڑا بننا اور پھر لوتھڑے سے بوٹی بننا اور پھر آخر کار اس سے ایک جیتا جاگتا انسان بن کر نکل آنا.... یہ کوئی ایسی بات تھوڑی ہے جو انسانوں کو محض رسول کے بتانے سے ہی معلوم ہو پائی ہو۔ بلکہ یہ بات تو سب انسانوں کو معلوم ہی ہے اور جو کہ ان کو خود عقل ہی کی بدولت معلوم ہوئی ہے۔ رسول یہ بات ان کو بتائے تب ان کو یہ معلوم ہے اور نہ بتائے تب معلوم ہے۔ مگر رسول ان کو کہتا ہے کہ وہ اس سے باقاعدہ استدلال کریں اور ایک نتیجہ تک پہنچیں۔ رسول ان کو استدلال کی یہ راہ دکھاتا ہے اور اس کو واضح کرتا ہے اور پھر اسی کو حجت بناتا ہے۔ پس یہ شرعی دلیل ہے کیونکہ شارع نے اس سے استدلال کیا ہے اور اس سے استدلال کرنے کا حکم دیا ہے۔ پھر یہ عقلی ہے کیونکہ عقل سے ہی یہ بات سمجھ آتی ہے اور اس کے درست نتیجہ تک پہنچا جاتا ہے“۔

’علم‘ یا ’دانش‘ یا ’معرفت‘ وغیرہ تک قطعی رسائی کا جو مسئلہ ہے اور اس معاملہ میں جو لوگ بحث و نزاع کرتے ہیں.... ان میں کی اکثریت اس طرز استدلال کو اختیار کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اور تب ان کا نزاع یہ ہو رہتا ہے کہ دانش کا مصدر آیا شرع ہے یا عقل؟ (یعنی یا شرع ہو گی اور یا پھر عقل۔ گویا یہ طے ہے کہ ان دونوں کی آپس میں لگتی ہے!! معاذ اللہ)

قرآن اسی طرح کی دلیلوں سے بھرا ہوا ہے۔ مثلاً بادلوں کے اٹھنے اور بارشیں برسانے سے استدلال کیا جانا۔ جو کہ قرآن میں ایک نہیں متعدد مقامات پر مذکور ہوا ہے۔ (یہ ایک مثال ملاحظہ کیجئے)

"اور کیا ان لوگوں نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا کہ ہم ایک بے آب و گیاہ زمین کی جانب پانی کو ہانک لاتے ہیں اور پھر اس کے ذریعے ہم (اسی زمین سے) وہ ساری کھیتیاں برآمد کر لاتے ہیں جس سے ان کے چوپائے پیٹ بھرتے ہیں اور یہ خود بھی۔ کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں؟"

چنانچہ یہ وہ چیز ہے جو آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ لوگ اپنی آنکھوں سے زمین کو دیکھتے ہیں کہ اس میں صرف خاک اڑتی ہے۔ کوئی ہریالی، کوئی سبزہ، کوئی زندگی کا نشان دور دور تک کہیں نہیں۔ یہاں تک کہ ایک عجیب و غریب انتظام سے یہاں پانی پہنچایا جاتا ہے۔ خدا بارش کرتا ہے تو یہ مردہ زمین زندگی سے بھری کروٹ لیتی ہے۔ اس میں زندگی کی یکدم ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور پھر یہ زندگی کی اور زندگی کے اسباب کی نشوونما کرنے لگتی ہے۔ طرح طرح کے پودے اس کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔

چنانچہ یہ آیات یعنی نشانیاں جن کو کہ خدا لوگوں کو دکھاتا ہے تاکہ لوگ جان لیں کہ قرآن کے قائم کردہ مقدمات بالکل سچ ہیں.... یہ دراصل عقلی نشانیاں ہیں جن سے استدلال کر کے عقل قرآن کے دعوی کی حقانیت تک پہنچتی ہے جبکہ یہ بیک وقت شرعی ہیں کیونکہ شریعت ان پر دلالت کرتی ہے اور ان سے راہ پانے کا سبق دیتی ہے۔

چنانچہ قرآن ہمیں ان 'آیات' سے جو بیک وقت عقلی بھی ہیں اور شرعی بھی، پُر نظر آتا ہے۔ مگر لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو 'شرعی دلیل' کا لفظ صرف اس چیز کیلئے بولتی ہے جس پر دلالت مجرد رسول کی خبر سے ہوتی ہو۔ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو مکمل معنی دینے سے شدید قاصر ہے"۔

(کتاب النبوات از شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ صفحہ: ۲۹، ۳۹، بحوالہ الاصول الفکریہ للمناھج السلفیہ عند شیخ الاِسلام مولفہ: شیخ خالد عبدالرحمن العک)

خدانے جو کتاب اتاری ہے وہ عقول کی تشفی بھی ہے اور صدور کی راحت بھی!

"اے انسانو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک بڑی ہی پتے کی بات آئی ہے اور جو کہ سینوں کو لگ جانے والے جو روگ ہیں، ان کیلئے شفا ہے اور جو کہ راہنما ہے اور سراسر رحمت، ان لوگوں کیلئے جو ایمان لے آئیں۔

"کہو: خدا کا (یہ) فضل اور رحمت ہی تو وہ چیز ہے کہ جس پر یہ خوشی منائیں۔ یہ بہت بہتر ہے اس سے جس کو یہ سمیٹتے رہتے ہیں"۔

بشکریہ ایقاظ

عقل و نقل کے درمیان ٹکراؤ کا آغاز کیسے ہوا؟

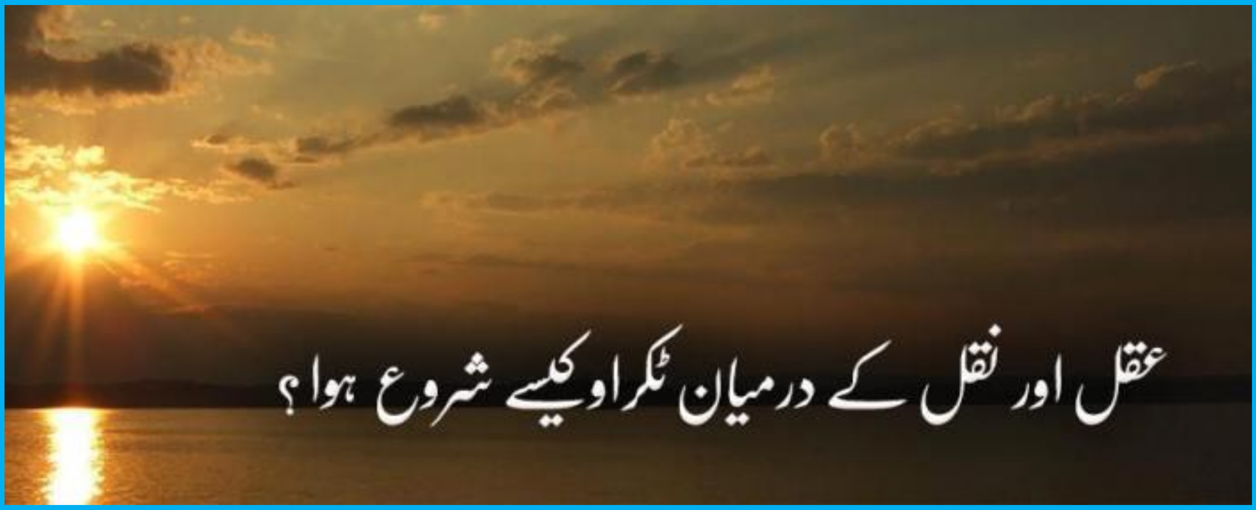

عقل اور نقل کا معرکہ اسلامی عقائد کی تاریخ کا ایک مشہور معرکہ ہے۔

بنیادی طور پر یہ ایک خوامخواہ کا معرکہ تھا۔ اس کی ضرورت غیر ادیان کو ضرور رہی ہے۔ اسلام کے اندر نہ صرف یہ درست نہیں، سرے سے غیر ضروری ہے اور خدا کی ایک بڑی نعمت کا کفران۔

عقل خدا کی تخلیق اور نقل خدا کی تنزیل۔ دونوں ہی خدا کی بے بہا نعمتیں، جو کہ انسان کو دراصل انسان بنانے کیلئے پائی گئیں، تاآنکہ انسان زندگی کے اس بحر ظلمات کے پار لگے اور دُنیا و آخرت کی تاریکیوں سے نجات پائے، ان دونوں کی ضرورت مسلم ہے۔

معتزلہ بطور فرقہ ضرور ایک خاص دور کا واقعہ ہوں گے البتہ بطورِ ذہنیت ہر دور اور ہر جگہ پائے گئے۔ یہ ذہنیت ہمیشہ اس بات کی آرزومند رہی کہ عقل اور نقل میں کسی طرح ٹھن جائے اور پھر یہ لوگ 'عقل' کے لشکر میں شامل ہو کر 'نقل' پر چڑھائی کریں جہاں یہ خود چونکہ 'لشکرِ عقل' کے شہسوار نظر آئیں گے لٰہذا ان کے مدمقابل وہ لوگ جو نقل (نصوصِ شریعت) کو عقل پر ترجیح دیں گے یہ ان کو خودبخود 'عقل کے دشمن' قرار دے لیا کریں گے !!!

بلاشبہہ فکر اعتزال کے شروع کردہ اس معرکہ نے ایک دوسری انتہا کو جنم دیا بھی جس نے کہ 'عقل پرستوں' کو واقعتاً پھر وہ موقعہ دیا جس کا فائدہ اٹھا کر یہ لوگ اپنے مخالفین کو 'عقل' اور 'خرد' کے ہی مخالف ثابت کر لیا کریں۔

عقل کی 'تقدیس' ایک انتہا تھی تو عقل کی 'تحقیر' ایک دوسری انتہا۔

اللہ تعالیٰ نے جو دین اتارا وہ انسان کے قلب اور عقل کو ہی خطاب کرتا تھا۔ اس میں اللہ کے ساتھ اور رسولوں کے ساتھ ایمان لے آنے کا 'حکم' بھی تھا مگر ساتھ میں اس کی 'توجیہ' بھی تھی۔ اس دین کا ایک بڑا حصہ اس دین کی معقولیت ((Rationale ہی بیان کرنے اترا تھا۔ یہ خالی 'منوانا' نہ تھا۔ یہ قلب اور ذہن کی تسکین تھی۔ یہ فوجی احکامات نہ تھے بلکہ حکمت کے اصول تھے جو کہ حق پر مبنی تھے اور ان کا حق پر مبنی ہونا اس کا واضح ترین خاصہ تھا۔

جس دن خدا نے اپنا دین اتارا اور اپنے نبی ﷺ کو اسے دے کر مبعوث کیا اس دن کرۂ ارض پر کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس پر ایمان پر لے آنے کو محض خدا کا حکم جانے اور قائل ہوئے بغیر ہی اس کو تسلیم کرنا اپنا مذہب مانے۔ اس کو 'خدا کا حکم' ماننے سے پہلے لوگوں کو عقلی شواہد درکار تھے جو ان پر واضح کر سکیں کہ واقعتاً یہ خدا کی تنزیل ہے اور یہ کہ واقعی یہ خدا کا رسول ہے۔

قرآنی مقدمات پس سب کے سب عقلی مقدمات ہیں۔ یہ محض عذاب کا ڈراوا نہیں یہ حقیقت کا بہترین اثبات ہے اور یہ آیاتِ آفاق اور آیاتِ انفس سے ایمان کشید کرنے کا ایک زبردست انداز۔ یہ حق اور باطل کا بہترین موازنہ ہے اور ضلالت کا مدلل ترین رد۔

قرآن سے یہ سب خوبصورت اسباق لینا اس مسلمان کیلئے بھی ہے جو اس پر پیشگی ایمان رکھتا ہو۔ عقل اور نقل کا یہ تفاعل جو کہ اصل 'اسلامی ذہن' کو جنم دیتا ہے، کسی وقت رکنے کا نہیں۔ دین میں نقل کی حیثیت مسلم ہے تو عقل کا کردار کسی وقت بھی حاشیائی ہو جانے والا نہیں۔

البتہ عقل اور نقل کے تفاعل کا وہی نسبت تناسب درست ہو سکتا ہے جو کہ ہر حال میں انسان کیلئے ایمان اور بصیرت ہی برآمد کرے بلکہ ایمان اور بصیرت کی بہتر سے بہتر افزائش ہی کرتا رہے۔اب یہ نسبت تناسب کیاہے ؟اس بات سے لاعلم رہنا یا اس سے صرف نظر کرر کھنا ہی وہ اصل بحران ہے جو ہمیں تاریخ اسلام کے اندر، عقل' اور، نقل' کے مابین ایک خواہ مخواہ کھڑا کر دیئے گئے معرکہ کی صورت میں نظر آتا ہے۔

عقل اور نقل کے تفاعل کا یہ بہترین اور صحت مند ترین نسبت تناسب ہمیں جہاں ملتا ہے وہ سلف کا منہج ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ایک خاص انداز سے قرآن پڑھنا سکھایا تھا۔قرآنی حقائق سے تعامل کرنا اور قرآنی مقدمات کو بہترین انداز میں ایمان، اذعان، تسلیم، یقین اور بصیرت کے اندر ڈھال دینا اور یہاں سے ایک اور ہی انداز کا انسان برآمد کرلانا جو دنیا کی تمام روایتی انداز کی دیندارانہ روشوں سے مختلف اور مذہبی جکڑ بندیوں سے یکسر منفرد انداز تفکیر رکھتا ہے، ایک جدا طرز استدلال رکھتا ہے ایک اسی منہج کا خاصہ ہے جہاں ایک منفرد انداز میں خدا کو، خدا کے حقوق کو، خدا کے پیغام اور پیغام بر کو ایک حقیقتِ واقعہ دکھایا جاتا ہے اور خدا سے ملاقات کے دن کو انسان کے قلب وذہن میں جا گزیں کرایا جاتا ہے۔اور اس سے پھر، عمل' کا جو ایک تصور اس انسان کے اندر ابھرتا ہے اور بندگی اور جہاد کا جو ایک مفہوم اس کی شخصیت کا حصہ بنتا ہے یہ بھی قدیم اور جدید میں پائی جانے والی سب 'مذہبی' روشوں سے یکسر جداگانہ ہے۔

اس منہج کی بنیاد دراصل یہی وحی کا،انسان کی فطرت اور اس کی عقل اور اس کے خیالات واحساسات سے، ایک سادہ مگر گہرے انداز کا تفاعل کرنا تھا۔۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ضرورت ہر دور میں ہے اور اس کی ضرورت ہر انسان کو ہے۔

سلف کے اس منہج کو جس سے عقل اور نقل دو متحارب عناصر نہیں رہتے بلکہ کمال خوبصورتی سے یکجا ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ انسان کے حق میں دو آنکھیں بن جاتی ہیں جن سے پھر وہ صحیح دیکھتا ہے اور بہت دور تک دیکھتا ہے اور پورے اعتماد سے دیکھتا ہے۔۔۔۔۔۔ سلف کے اس منہج کو جس میں عقل اور نقل دونوں کا کردار بے حد اہم ہے اور جس کی رو سے عقل، نقل کے بغیر درماندہ و بے نور ہے اور نقل عقل کے بغیر کام دینے سے معطل رہتی ہے۔۔۔۔۔۔ سلف کے اس منہج کو منہج وسط کہا گیا ہے۔ منہج وسط جس میں کہ اعتدال پایا جاتا ہے اور جس کی ہر چیز اپنی جگہ پر پائی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ لہٰذا ہر چیز یہاں وہ کام دیتی ہے جس کیلئے کہ وہ ہے۔

بعدازاں لوگ اگر اسی سلف کے منہج پر چلتے تو وہ بھی قرآن سے اسی طرح ایمان اور بصیرت اور یقین کا ثمر لیتے اور اس ثمر سے اپنی جھولیاں بھر بھر کر اس دُنیا سے جاتے مگر وہ اس درست اور متوازن نسبت تناسب سے غافل ہو گئے جو کہ عقل اور نقل سے استفادہ کے معاملہ میں برقرار رکھا جانا تھا۔ اس توازن کا ہاتھ سے جانا تھا کہ معاملہ ایک بڑے خلجان کا شکار ہوا۔ جس کے ہاتھ میں جو تھا وہی رہ گیا البتہ 'ترازو' ہاتھ سے جاتا رہا۔ اب لازمی تھا کہ کسی کا معاملہ ایک طرف کو لڑھک جاتا تو کسی کا دوسری طرف کو۔۔۔۔۔۔ سوائے ان کے جو سلف کے منہج پر واقعتاً قائم ہوں۔

اس معرکہ کی مختصر تاریخ ہم کسی اور موقعہ پر ذکر کریں گے البتہ اس معاملہ کا ایک افسوسناک پہلو یہ رہا ہے کہ چونکہ خدا کی اتاری ہوئی تنزیل کا درجہ انسان کی عقل و تفکیر پر مقدم ہے اور چونکہ اس وجہ سے مذہب سلف پہ چلنے والوں کو فکر اعتزال کے اس عقل پرست منہج کے آڑے آنا تھا جو عقل کو نقل پر مقدم ٹھہراتا ہے۔۔۔۔۔۔ تو اس کے باعث مذہب سلف سے منسوب بعض حلقوں کے اندر وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ ایک 'رد عمل' کا انداز پروان چڑھا۔ یوں اس سے ایک دوسری انتہا سامنے آئی اور وہ، 'عقل' کو حقیر جاننے، شریعت کی تلقی کے معاملہ میں عقل کو بڑی حد تک معطل کر دینے اور یوں دین کے معاملہ میں 'عقل' کو کسی شمار قطار میں ہی نہ لانے سے عبارت تھا۔ اس سے لازم تھا کہ، نصوص کے فہم میں ایک جمود آتا۔ یہ انداز فکر ایک طرف فقہی معاملات میں اجتہاد کو معطل کر دینے پر منتج ہوا تو دوسری طرف عقیدہ کی ایک خشک انداز کی ترجمانی کرنے لگا اور تیسری طرف دعوت میں ایک فوجداری کی سی صورت اپنانے لگا اور دین کے حقائق کی بجائے دین کے مظاہر پر ہی زیادہ تر زور اور توجہ صرف کرنے لگا اور چوتھی طرف شریعت اور سماج میں ایک خلیج پیدا کر دینے کا باعث بنا۔

اس صورتحال کا سبب یہی تھا کہ عقل کا وہ کردار جو اس کو شریعت کی اپنی ہی جانب سے عطا ہوا تھا۔۔۔۔۔ عقل کا وہ کردار جو اس کو شریعت کی نصوص کے ساتھ ایک فطری تفاعل کی صورت میں ادا کرنا تھا اور ایک بھرپور انداز میں ادا کرنا تھا۔۔۔۔۔ عقل کے اس کردار کو معطل کر دیا گیا اور یہ باور کر لیا گیا کہ عقل کا خدا کے دین میں بس یہی مقام ہے جو یہ حضرات اسے دے رہے ہیں۔

بنیادی طور پر، جیسا کہ ہم نے کہا، یہ ایک رد عمل تھا جو کچھ طبقوں کے ہاں اس انداز کے تشدد کو ایک منہج کے طور پر اپنا لینے کا آخر کار سبب بنا۔

البتہ معاملہ یہ ہو گیا، اور اسی وجہ سے ہم نے اسے بد قسمتی کہا ہے، کہ یہ طرز فکر اور یہ اسلوب یہاں اب منہج سلف کی پہچان سمجھا جانے لگا ہے۔ جبکہ اس کا منہج سلف سے کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔

اس کا آپ سے آپ نتیجہ یہ ہوتا کہ فکر و فہم، سوچ اور تفکیر اور طرز تعامل میں آدمی کا انتہائی پرانی وضع کا نظر آنا اور اپنے دور سے اور اپنے دور کے فکری رجحانات سے یکسر بیگانہ رہنا بلکہ کسی حد تک ان سے آزردہ خاطر رہنا، انسان کے 'سلفی' ہونے کا ایک لازمی حصہ سمجھا جانے لگے!!

یہ ایک بڑا ظلم تھا جو کہ یہاں سلف کے منہج کے ساتھ ہوا۔ اس سے بڑی زیادتی ہمارے خیال میں دین اسلام کی اس سچی اور خالص تعبیر کے ساتھ اس دور میں کوئی نہ ہو سکی تھی۔ البتہ اس تاثر کے بن جانے میں طرفین کو کچھ نہ کچھ دخل حاصل رہا ہے۔

اس کا پھر یہ نتیجہ بھی لازمی تھا کہ 'سلف کی دعوت' کچھ خاص موضوعات میں محصور ہو جاتی اور اپنے دور کے موضوعات سے پہلو تہی برتتی۔ اور یہ کہ اپنے دور کے ساتھ بھی ہمیشہ وہی پرانے موضوعات ہی چھیڑتی۔ اپنے دور میں اترتی تو یہ اپنے دور کو اپنے روایتی موضوعات پہ لے آنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ یہ کرتی کہ اپنے دور کو ایک عمومی معنی میں 'دیندار' بنا لینے کیلئے کوشاں ہوتی۔ البتہ ہر دور کے افکار کا جو ایک 'آپریشن' کیا جانا ہوتا ہے اور ہر دور کے علمی و فکری و ثقافتی رجحانات کے عین بیچ سے گزر کر حق کیلئے جو ایک راستہ بنانا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وہ فرض بالکل متروک ہو رہا کیونکہ اس کی یہی ایک صورت ہے کہ ہر دور کی عقل اور ہر دور کا فکر خدا کی اس ازلی وحی کے ساتھ ایک بہترین انداز کا تفاعل کرے اور اس عمل سے عین وہ چیز برآمد ہو جو کہ اس دور کی ایک صحیح شرعی ضرورت ہے اور جو کہ اس دور کے انسان کی درماندگی کا اصل مداوا ہے۔

چنانچہ 'عقل' کو حساب سے خارج کر دینا سلف کا منہج نہ تھا۔ خود قرآنی استدلالات بھی سب سے پہلے اس مفروضہ کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ البتہ عقل کو خدا کی تنزیل پر ____ جو کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہے ____ حکم arbiter بھی نہیں بننا۔ یہ اس کا غلط مقام ہے اور ایک غلط مقام پر رہنا خود اس کا یعنی عقل کا اپنا بھی تقاضا نہیں۔

مگر چونکہ عقل پرست رجحانات نے شروع میں اس توازن کو خراب کیا جو کہ منہج سلف میں نقل اور عقل کے مابین ایک بہترین انداز میں قائم کروادیا گیا تھا۔۔۔۔۔ اور چونکہ یہ عقل پرست رجحانات آج تک اس تاک میں ہیں کہ 'حقیقت' کے ادراک کے ان دو ذرائع کو ____ جو کہ انسان پر خدا کی عظیم ترین نعمت ہیں ____ کسی نہ کسی طرح آپس میں بھڑوادیں اور ان دونوں کی اس فرضی جنگ میں خود یہ 'عقل' کے خودساختہ ترجمان اور 'خرد' کے من مانے حمایتی بن بیٹھیں۔۔۔۔۔ لہٰذا ان لوگوں کے اس توازن کو خراب کر دینے نے بالواسطہ طور پر اپنے مدمقابل کچھ اور طبقوں کو بھی اس توازن سے دور کر دیا۔ یہ ایک تنگ نظر ردعمل تھا جس نے عقل پرستوں کو اپنی گمراہی میں پھر اور بھی آگے بڑھتا رہنے اور اپنی اس گمراہی کو معاشرے کے اندر ____ خصوصاً پڑھے لکھے طبقے کے ہاں ____ ایک معقول روپ دے لینے کا موقعہ دیا۔

اب چونکہ نقل کو عقل پر مقدم جاننے کا عقیدہ سلف کا متفقہ عقیدہ ہے اور جس کے حق ہونے کی شہادت خود 'عقل' بھی دیتی ہے لہٰذا اس معرکہ میں جو کہ 'عقل' اور 'نقل' کے مابین فرضی طور پر کئی صدیوں تک کروایا گیا کچھ لوگ ایک دوسری انتہا پر بھی چلے گئے جو کہ دینی حقیقت کے ادراک کے معاملہ میں عقل کا کردار تقریباً ختم کر دیتی تھی۔۔۔۔۔ اور جو کہ سلف کے منہج کی ہرگز کوئی ترجمانی نہ تھی مگر دونوں میں

(سلف کے منہج اورِاس جامد منہج کے مابین) مشترک بات یہ تھی کہ سلف کا منہج بھی نقل کو عقل پر مقدم ٹھہراتا تھا اور اس انتہا پر چلے جانے والوں کا منہج بھی۔۔۔۔۔ لہٰذا محض اس 'قدرِ مشترک' کے باعث ان دونوں کو ایک ہی شمار کر لیا گیا جس سے سارا نقصان منہج سلف کو پہنچا اور جس کا سارا فائدہ اس 'عقل پرست' منہج کو گیا جو کہ دراصل 'ھویٰ پرستی' کا ایک پر تو تھا۔

اس معاملہ میں پورا اُترنے کا درست طریقہ جو ہو سکتا تھا اور جو کہ ہمیں ترجمانِ اہلسنت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے منہج میں جلی طور پر نظر آتا ہے۔۔۔۔۔ وہ یہ کہ عقل اور نقل کی جنگ میں خوامخواہ کود پڑنے کی بجائے خود اس جنگ کو ہی عقل پرستوں کا ایک وہم قرار دیا جاتا اور یوں اس جنگ کا فرضی اور وہمی ہونا ہی سب سے پہلے لوگوں پر واضح کیا جاتا۔ اس کے بعد پھر اس جنگ کی طرف آیا جاتا جو کہ عقل پرستوں نے عقل کے نام پر شریعت کے بعض حقائق کے خلاف شروع کر رکھی تھی۔ جب عقلِ صریح اور نقلِ صحیح کے مابین سرے سے کوئی تعارض نہیں تو پھر اس جنگ کا عنوان یوں ٹھہرایا جاتا کہ یہ جنگ عقل اور نقل کے مابین نہیں بلکہ اس جنگ میں خود عقل بھی دراصل نقل ہی کے ساتھ ہے اور وہ ہمیشہ نقل ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے لہٰذا یہ دراصل 'نقل' کے خلاف 'عقل' کی جنگ نہیں بلکہ یہ 'نقل' کے خلاف 'بے عقلی' کی جنگ ہے!

یہ عین وہ کام ہے جو اللہ تعالیٰ نے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں کرایا۔ آپ نے اس موضوع پر تاریخِ اہلسنت کی ایک یادگار ترین کتاب "درء التعارض بین صریح المعقول و صحیح المنقول" تصنیف کی اور اس جنگ کا سارا نقشہ ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اس کتاب نے دین کے اندر لائے جانے والے عقل پرست رجحانات کو عین وہاں کھڑا کر دیا جہاں عقل بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہوئی نظر آئے۔ اب جو میدان جنگ

کی صورت بدلی تو عقل عین شریعت کے پہلو میں کھڑی نظر آئی اور عقل پرست اس جنگ میں تنہارہ گئے ! ان کا اپنا معبود بھی ان کا ساتھ چھوڑ گیا!

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب فکر اہلسنت کی توضیح اور منہج سلف کی ترجمانی کے موضوع پر ایک مستند ترین کتاب مانی گئی ہے۔

'عقل پسندی' ایک چیز ہے اور جو کہ ہمارے دین میں بدرجۂ اتم موجود ہے البتہ 'عقل پرستی' ایک اور چیز ہے۔ اس کو بہرحال ہم ایک فتنہ جانتے ہیں۔ جس طرح خدا کی ہر مخلوق خدا کے مقابلہ میں اپنی پرستش کرانے سے بیزاری کرتی ہے اسی طرح 'عقل' بھی خدا کا ہمسر بننے سے صاف بیزار ہے۔ یہ صرف کچھ نادان انسان ہیں جو خدا کی کسی مخلوق کو خدا کی ہمسری کے مرتبہ پر فائز کر آتے ہیں۔

یہ ہے وہ طرز عمل جو ہمیں اس موضوع پر مذہبِ سلف کے حقیقی ترجمانوں کے ہاں ملتا ہے۔ اس منہج پر آجانے سے آج بھی اس جنگ کا نقشہ تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ سلف کے نام لیوا کئی ایک طبقوں کو بھی ہمارے خیال میں، ایک بڑی تبدیلی سے گزرنا ہے۔ اس سے وہ تبدیلی خود بخود آئے گی جو ہمارے اس ماحول میں لائی جانا ہے۔

تحریر حامد کمال الدین

عقلی توجیہہ کو پیش آنے والے فریب

شریعت اور عقل کا مسئلہ امت کی تاریخ میں بڑی مدت سے باعث نزاع رہا ہے۔ اس مسئلے میں ایک انتہا یہ رہی ہے کہ شرعی احکامات میں کسی حکمت کا قطعاً کوئی عمل دخل نہیں ہے اور یہ صرف ایک اضافی چیز ہے۔ جبکہ دوسرا طبقہ اس نظریہ کا حامل ہے کہ شریعت کا ہر ہر حکم واضح طور پر انسان کی جسمانی اور نفسیاتی فطرت اور اس کی عقل سے نہ صرف مطابقت رکھتا ہے بلکہ ایسا ثابت کر کے بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ جبکہ ہم اہل علم کو بھی عمومی طور پر یہی کہتا ہوا پاتے ہیں کہ شرعی احکامات صرف آزمائش کے لیے ہی نہیں ہیں بلکہ اس پر عمل کرنے میں دنیاوی اعتبار سے بھی بہت بڑی خیر موجود ہے۔ تو پھر اس موضوع پر میانہ روی کا منہج ہے کیا؟

موجودہ دور ایک اعتبار سے ذہنی آزادی کا دور ہے اور اطلاعات اور مواصلات کے ذرائع کی ارزانی و فراوانی کی وجہ سے یہ ذہنی آزادی ایک طرح قابو سے باہر ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ایک بار کسی شخص نے محمد ﷺ کو اللہ کا رسول مان لیا تو پھر اس کے لیے اسلام کے ہر ہر منصوص حکم کو بلا عقلی دلیل کے تسلیم کرتے چلے جانا

لازمی ہے اور عین تقاضائے ایمان۔ لیکن دعوت کے سلسلے میں ایک چیلنج اس وقت نبی ﷺ کی نبوت کو ثابت کرنا بھی ہے۔ نبوت کو ثابت کرنے کے لیے ایک طریقہ کار یہ اختیار کیا گیا ہے کہ شریعت کو عین انسانی فطرت اور عقل کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ بہ الفاظ دیگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ اسلام اور موجودہ دور کی سائنسی دریافتوں میں کمال کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ امت کے کچھ قابل قدر مبلغین نے قرآن کے بیان کردہ کائناتی حقائق اور جدید سائنسی دریافتوں کے درمیان مطابقت ثابت کرنے کی کافی حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔ اصولی طور پر یہ بات غلط بھی نہیں ہے۔ اگرچہ سائنس قرآن کا اصل موضوع نہیں ہے لیکن جب خالق کائنات کے بیان میں کوئی چیز ضمناً ہی آجائے تو وہ مطلق حق ہے جس میں غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ البتہ اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ یہاں پر ہمارا مقصود ان کوششوں کو دیکھنا ہے جن میں شریعت کے احکامات کو انسانی عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دکھایا گیا ہے؛ جن کے اندر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شرعی احکامات پر عمل کرنے سے دنیاوی زندگی میں انسان کو کیا کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام ذہنی عمل کے معاملے میں۔ مخصوص حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ انسانی آزادی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ غور و فکر کر کے اسلام کو شعوری طور پر قبول کریں۔ نیز یہی چیز ایک غیر مسلم کے اسلام کو قبول کرنے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اسلام شعوری طور پر قبول کرنے میں اور اسلام ورثے میں پانے میں بڑا فرق ہے۔

اس سلسلے میں اس سے بھی بڑی پیچیدگی ایک اور ہے جو کہ دراصل اس وقت ہمارا موضوع ہے۔ اس طرزِ تحقیق میں یہ مان کر چلا جاتا ہے کہ گویا پورا کا پورا انسانی فہم بس حیاتیات، علم طب، علم کیمیا یا فزکس تک محصور ہے، بلکہ یہ کہ پوری حقیقت ہی انسانی فہم و تحقیق کے اِن میدانوں کے اندر محصور ہے لہٰذا نماز کے

فوائد بھی ہوں تو ان کی تلاش یا تو حیاتیات کے علم کے معیار پر ہو، یا کیمیا یا فیزکس یا ایسے ہی کسی اور میدان کے اندر... وہ چیزیں جو عبادات اور مناسک سے متعلق ہیں ان کی تحقیق کے لیے بھی نظریں انہی علوم کی طرف اٹھتی ہیں اور جو اس سلسلے میں اطمینان قلب کے حصول کا طالب ہے وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ اس سلسلے میں اطمینان قلب کے لیے اس کو طبّی طور پر ثابت ہونا ضروری ہے۔ آئے روز اس طرح کے مضامین نظروں سے گزرتے رہتے ہیں کہ نماز، روزہ، وضو وغیرہ سے کیا کیا طبّی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ یہ تحقیق کتنی صحیح ہے۔ اس طرح کی تحقیق میں بعض اوقات بڑی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی کچھ مثالیں یہاں پر دی جا رہی ہیں۔

(ا) انٹرنیٹ سے ایس ایم ایس تک ایسے چرچے سنے جائیں گے کہ مثلاً اسلامی طریقے پر ذبح کرنے سے جانور کا گوشت خون سے بالکل پاک اور صحت کے لیے انتہائی مفید ہوتا ہے، جس میں بین السطور کہا گیا ہوتا ہے کہ: تو پھر اب تو طب نے بھی ثابت کر دیا کہ اسلام برحق ہے...!

ہمارے خیال میں یہ دعویٰ کہ اسلامی طریقے پر ذبح کرنے سے جانور کا گوشت خون سے بالکل پاک اور صحت کے لیے انتہائی مفید ہوتا ہے اگرچہ نہایت قرین صواب ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ سوالات ضرور پیدا ہوتے ہیں جس کا خالص طبّی یا حیاتیاتی جواب ممکن نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ذبح کرنے کے لیے پوری کی پوری ٹیکنیک اسلامی اختیار کرے لیکن اللہ کے نام کے بغیر کسی اور نام پر ذبح کرے تو پھر وہ گوشت کیوں حرام ہو جاتا ہے؟ اگر فیصلہ علم طب سے اور طبّی معیاروں پر لیا جانا ہے تو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جانے والے جانور کے حرام ہونے کی کچھ "طبّی" وجوہات کا بھی تو ذکر ہو...!

اس کی ایک مثال وضو کے ''طبّی فوائد'' بیان کرنے سے بھی دی جاسکتی ہے۔اگر صحیح طریقے پر وضو کرنے کے طبّی فوائد ہیں تو پھر ہر نماز کے لیے علیحدہ وضو کرنا کیوں ضروری ہے؟ یہ کیوں ہے کہ بیت الخلاء جاکر آنے سے وضوٹوٹ جاتاہے؟ایسا کیاہے کہ جو طبّی فائدہ موجود تھاوہ بیت الخلاء ہو کر آنے سے یاہوا کے خارج ہو جانے سے ایک دم مفقود ہو گیا؟

یہ پورامسئلہ اس لیے کھڑاہواہے کہ کسی چیز کی ''عقلی توجیہ''کامطلب ہی غلط سمجھ لیاگیاہے۔چونکہ موجودہ دور میں عقلی توجیہات کا علم ایجاد ہی اس لیے کیاگیاہے کہ مغرب سے درآمد شدہ تنقید کاسامنا کیاجائےاس لیےاس طریقۂ تحقیق میں بھی وہی کمزوریاں درآئی ہیں جو مغربی طرز تنقید میں موجودہیں۔حقیقت یہ ہے کہ عبادات اور مناسک میں صرف طبّی توجیہات کی جستجو کرناانتہادرجے کی کم نظری اور سطحیت ہے۔کیا واقعی کسی چیز کی عقلی تائید کے لیے صرف علم طب میں اس کے فوائد ڈھونڈنا ایک صحیح معیار ہے؟حقیقت یہ ہے کہ سطحیت مغرب سے برآمد ہر چیز کی خاصیت ہے۔چاہے وہ جمہوریت ہو، آزادی رائے ہو یا نظامِ سرمایہ داری۔(مقصود مغرب کی تحقیق یاذہانت کی نفی نہیں ہے بلکہ مرادیہ ہے کہ عموماً جب کسی چیز کی اہمیت معلوم کی جاتی ہے تواس طرح کاانداز اختیار کیاجاتاہے کہ بس یہی ہےاور باقی کوئی بھی چیزاہمیت نہیں رکھتی۔مارکس نے انسانی اجتماعیت پر معاشی اثرات کامطالعہ کیاتو یہ نتیجہ اخذ کیاکہ ہر چیز حتیٰ کہ مذہب بھی معاشی کشمکش اور تغیر کا نتیجہ ہے۔گویاکہ معیشت کے علاوہ انسانی سماج پراثرانداز ہونے والااور کوئی عنصر ہے ہی نہیں۔یہی حشر فرائڈ نے انسانی طبیعت میں کارفرما''جنسی ترغیب''کے ساتھ کیا)۔

کچھ اسی طرح کی غلطی اسلام کے ابتدائی دور میں-علمائے سلف کی تنبیہات کے علی الرغم-اُن مسلمانوں سے ہوئی تھی جنھوں نے یونانی علوم کاعربی میں ترجمہ کرکے یورپ سے درآمد کرکے مسلم دنیامیں پھیلایا۔

ان علوم میں ایک طرف علم طبعیات، حیاتیات اور علم ریاضی کو برآمد کیا گیا تو دوسری طرف اِلٰہیات بھی اس کے ساتھ ساتھ آ گیا، جس کا ''اسلامی ورژن'' بالآخر ''علم الکلام'' کہلایا۔ اُن مسلمانوں سے جو سلف صالحین کے اصولوں کو نظرانداز کر بیٹھے تھے، اس وقت بھی وہی غلطی ہوئی جو اب ہو رہی ہے۔ البتہ اُس وقت محققین کا ہدف چونکہ اسلامی ایمانیات اور اللہ کی صفات کا تھا اس لیے معاملہ زیادہ سنگین تھا۔

طبعی علوم و سماجی علوم میں فرق:

ایک قسم کا علم وہ ہوتا ہے جس کی تحقیق تجربات اور مشاہدات کے ذریعے سے ممکن ہو اور دوسری قسم کا علم وہ ہے جس میں اصل حصہ ظن و تخمین کا ہی ہوتا ہے۔ ان دونوں قسم کے علوم میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے مسلمانوں میں عقل اور نقل کے سلسلے میں ایک معرکہ برپا ہو گیا۔ نتیجتاً مسلمانوں میں معتزلہ کا فرقہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے علمائے اہل سنّت کو طرح طرح کی ابتلاء و آزمائش سے گزرنا پڑا۔

یہاں پر یہ بات واضح رہے کہ موجودہ دور میں سائنس کا لفظ تقریباً تحقیق یا علم کے ہم معنی ہے۔ یہاں تک کہ انگریزی کے اسلامی لٹریچر میں جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے علم کو بھی سائنس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ مغرب میں یہ بات بہت پہلے ہی سمجھ لی گئی تھی کہ علمی تحقیق میں ہر چیز کا مطالعہ مشاہدات اور تجربات سے کرنا قطعاً ناممکن ہے اسی بنا پر سائنس کو دو انواع میں منقسم کیا گیا ہے:

1۔ طبعی سائنس (Natural science): اس سے مراد فطرت کے ان حقائق کا علم حاصل کرنا ہے جس کی تحقیق مشاہدات اور تجربات سے کی جا سکتی ہے۔ اس سائنس کا تعلق ان فطری قواعد اور کلیوں

سے ہے جس کے تحت مادہ(Matter) اور قوت(Energy) تعامل کرتے ہیں۔اس زمرے کے تحت طبعیات(Physics)،کیمیا(Chemistry)،حیاتیات(Biology) وغیرہ آتے ہیں۔

2۔سماجی سائنس(Social science): اس سے مراد علم و تحقیق کا وہ میدان ہے جس میں انسان کے انفرادی اور اجتماعی مزاج اور برتاؤ اور اُس سے منتج صورتحال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس قسم کی تحقیقات میں ظن و تخمین اور قیاسات کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔یہاں پر اگر آپ تجربات کرنا چاہیں تو کئی نسلوں کے بعد مشکل سے کوئی نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے۔ان علوم میں علم نفسیات (Psychology)، عمرانیات (Sociology)، معاشیات (Economy)، علم بشریات (Anthropology) وغیرہ آتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ سائنسی تحقیق کو ان دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مقصد یہی تو ہے کہ سماجی سائنس کے معاملے میں دو اور دو چار کے طرح اصول وضع کرنا ناممکن ہے۔یہ علوم ایک طرح سے سائنس میں استثناء کی حیثیت رکھتے ہیں۔اور یہ علوم ہیں بھی در حقیقت استثناء کے لیے۔ان علوم میں جو بھی اصول وضع کیے جائیں گے اس کی حیثیت بہر حال تجرباتی ہو گی۔ دراصل یہ علوم انسان کی کم علمی اور بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔انسانی فطرت انتہائی پیچیدہ ہے اور اس پیچیدہ فطرت کے انسان کے لیے خود اپنی فطرت کا مکمل ادراک کرنا قطعاً ممکن نہیں ہے۔موجودہ دور کی نسبت سے آپ یہ کہہ سکتے ہیں اس دنیا میں سرمایہ داری کا جو تجربہ کیا گیا تھا اب جا کر اس کا کچھ کچھ نتیجہ معلوم پڑ رہا ہے اور وہ بھی بالکل واضح نہیں ہے۔جو اس تجربے کو غلط کہہ رہے ہیں وہ بھی اس میں اصل غلطی کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہیں اور آ جا کر اس وحی کی حامل امت بچی جو اس سلسلے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں ہے لیکن یہ امت بھی اگر سنانے سے زیادہ سننے لگ گئی ہو

اور سننے بھی وحی کو نہیں (الذین یستمعون القول فیتبعون اَحسنہ) بلکہ وحی سے جاہل قوموں کو، تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہاں سنانے والے ہیں مگر سننے والوں نے اگر کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی ہوں تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔

شریعت میں جو اسلامی احکام دیے جاتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ انسانوں کے لیے ہی دیے جاتے ہیں اور انسان کوئی مشین یا بے جان چیز تو نہیں۔ جب کسی شرعی احکام کی حکمت معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ انسان صرف گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ایک روحانی مخلوق بھی ہے اور نفسیاتی لحاظ سے دنیا کی پیچیدہ ترین ہستی بھی۔

ان محققین کے سلسلے میں یہ ایک عجیب معمہ ہے کہ مغرب جس کو مطمئن کرنے کے لیے یہ سب تحقیق کی جاتی ہے وہ تو ہار مان کر سماجی سائنس (social science) کو کب کا منظوری دے چکا ہے بلکہ اس کا داعی بن چکا ہے اور ہمارے مسلمان محققین ابھی تک شرعی احکامات کی تشریح طبعی سائنس (Natural science) میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں!!!

شرعی احکامات کی درست عقلی توجیہہ:

اسلام میں شرعی احکامات کے کئی مقاصد ہیں جن کا مکمل احاطہ کرنا عقلِ انسانی کے دائرہ سے باہر ہے۔ اسلام صرف ایک عقیدہ و نظریہ ہی نہیں ہے جس سے صرف انفرادی عمل یا اصلاح مقصود ہو۔ اسلام کا مقصد صرف ایک انسان یا کئی انسانوں کو مسلمان بنانا ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایک امّت بنانا بھی اسلام کا ایک اہم مشن ہے۔ جن معنوں ہم مسلمانوں کو ایک امّت قرار دے رہے ہیں وہ موجودہ دور کی کسی بھی اصطلاح پر

بھاری ہے۔ اسلام ایک ایسی امت بنانا چاہتا ہے بلکہ بنا چکا ہے جس کا ہر اعتبار سے اپنا ایک نظریہ ہو، جو ایک قوم تو ہو لیکن اپنی مقامی تاریخ اور جغرافیائی قید سے آزاد ہو، جس کے اپنے مربوط اور منضبط اصول اور اقدار امت کے ہر اجتماعی اور انفرادی پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہوں۔ اس لیے حق یہ ہے کہ اسلام بحیثیت امت کے لیے تمدن (civilization) کا لفظ بھی ہلکا پڑ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک بڑی حقیقت کہ اسلام کا ایک تمدن کے طور پر بعثت محمدی ﷺ سے لے کر آج تک ایک تسلسل کے ساتھ ہونا کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اگرچہ اسلام جزوی طور پر مقامی روایات پر عمل کرنے کے معاملے میں کافی لچک رکھتا ہے لیکن یہ ایک قطعی الگ بحث ہے اور اس سے اسلام کے ایک مربوط، منظم، مسلسل، دائمی اور عالمی تمدن ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔

یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے تاکہ شرعی احکامات کو عقلی توجیہ کرتے ہوئے یہ بات بھی پیش نظر ہو کہ اسلام کو ایک امت بمعنی ایک دائمی تمدن کے بنانے میں ان کا کیا رول رہا ہے۔

اگرچہ شرعی احکامات کی حکمت معلوم کرنا سماجی سائنس کے ذیل میں ہی آتا ہے لیکن اس میں ہمیں دوسرے سماجی سائنس کے مقابلہ میں ایک سہولت حاصل ہے۔ کوئی ڈیڑھ ہزار سال سے جغرافیائی حدود سے آزاد اسلامی تمدن کا وجود تاریخ کی ایک روشن ترین حقیقت ہے۔ اس تمدن کا وجود کوئی مفروضہ، منصوبہ یا نظریہ نہیں ہے، بلکہ حال کے ساتھ ساتھ یہ اپنی ایک تاریخ بھی رکھتی ہے۔ یہ ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ ہمیں شریعت کی حکمتوں کو سمجھنے میں بہت کچھ معاون ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس امت بمعنی تمدن کی تشکیل اور بنیادیں استوار کرنے میں شرعی احکامات کا کیا رول رہا ہے اب اس کی تحقیق دوسرے سماجی علوم

کے مقابلے میں قدرے آسان ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ان احکامات کے اثرات کا ہم اتنا ہی ادراک کر سکتے ہیں جتنی کہ ہمارے ذہن کی پرواز ہے۔

معاشرے میں جو بھی عبادت عملاً نافذ ہوگی اس کا طویل المیعاد اثر(Long term implication)اس تمدن پر ہوگا جس کا ادراک صرف اس شرعی مسئلے کے سطحی سائنسی مطالعے سے نہیں ہوسکتا۔جب ایک حکم نافذ ہوتا ہے اس کی کئی سماجی، نفسیاتی اور روحانی جہتیں ہوتی ہیں جن کا مکمل ادراک انسان کے لیے تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔اس لیے اسلام کے ہر ہر احکام کی معنویت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس کے اثرات کو بہت گہرائیوں سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔کیا جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو بات صرف اس حکم پر عمل کرنے تک رہتی ہے؟اس خدائی حکم پر عمل کرنے کی عملی تدبیر بہر حال اس عمل کرنے والے خاکی انسان کو ہی طے کرنا پڑتی ہے۔پھر جب معاشرے کا ایک بڑا عنصر اس پر عمل کرتا ہے تو یہ معاشرتی قدروں کی شکل ڈھال لیتا ہے۔پھر اس پر عمل کرنے کے انسانی ذہن اور معاشرے میں کثیر الجہت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔یہ عمل جب معاشرے میں وجود پاتا ہے تو آپ سے آپ اپنے کچھ لوازمات بھی پیدا کرتا ہے جو کہ تمدن کے ہر ہر پہلو پر کسی نہ کسی طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اپنی اس بات کو ہم کچھ مثالوں سے سمجھاتے ہیں۔وضو کی حکمت معلوم کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ یہ پتہ کریں کہ روزانہ پانچ بار جسم کچھ اعضاء پر پانی بہانے سے انسانی صحت اور نشو نما پر کیا اثر پڑتا ہے۔اب ظاہر بات ہے کہ ایسا کوئی فائدہ اگر ثابت بھی کیا جائے تو وہ کتنا محدود ہوتا ہے اور اس پر کیا اعتراضات ہو سکتے ہیں۔اب اسی وضو کے حکم کو ذرا دوسرے زاویئے سے دیکھا جائے:

ایک شخص اپنے رب کے حضور حاضر ہو رہا ہے۔ وہ بے دھڑک مسجد میں جا کر نماز کے لیے کھڑا نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ پہلے تمام حاجتوں سے فارغ ہو کر ذہنی یک سوئی حاصل کرتا ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں اس کو روزانہ کئی بار اپنے آپ کو انتہائی احتیاط سے نجاست سے بچانے کی ضرورت پڑتی ہے جس کو وہ صرف اللہ کے لیے کرتا ہے لطف کی بات یہ ہے کہ مومن کا حالت طہارت میں ہونے کا راز وہ اور اُس کا خدا جانتا ہے جو بندگی کی اعلیٰ ترین کیفیت ہے۔ وضو کا عمل بھی صرف اس بات سے عبارت نہیں ہے کہ بدن کو گیلا کرنا ہے، نماز کی ادائیگی کے لیے مومن اپنے آپ کو پاک کرنے کی نیت سے کچھ اعضاء پر مخصوص انداز میں پانی بہاتا ہے۔ اس پانی کے بہانے میں اس بات کا خاص خیال کرتا ہے کہ کوئی بھی حصہ جس کو تر کرنا ضروری ہے وہ خشک نہ رہنے پائے۔ اس معاملے میں اس کو چوری کرنے کے کئی مواقع ملتے ہیں جس کو صرف اللہ کے خوف کی وجہ سے نظر انداز کر دیتا ہے۔ پھر جب وضوء اور نماز کا درمیانی وقفہ ہوتا ہے تو اس میں ایسے کسی بھی عمل سے اپنے کو آپ کو بچاتا ہے جس میں وضو ٹوٹ جائے۔ اس وضو کے ناقص ہونے اور نہ ہونے میں بھی صرف اللہ رب العزت اس کا راز دار ہوتا ہے۔ یہ وضو کا عمل ہی ہے جس سے مسلمانوں میں پاکی اور صفائی کی نہایت اعلیٰ قدریں کتنی گہرائی سے پائی جاتی ہیں۔ مسلمان اگر نماز کا پابند ہو تو وہ اپنے آپ کو نجاستوں اور آلائشوں سے پاک رکھنے کا کتنا اہتمام کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ مغربی تہذیب کی طرف نظر کریں، یہاں پر ناپاکی کا مطلب ہی ایسا کوئی داغ ہے جو نظر آتا ہو یا ایسی بدبو ہے جو محسوس کی جاتی ہو۔ باقی کوئی بھی چیز جو اندر ہی اندر ہو وہ پاکی ہی تصور کی جاتی ہے۔ ان کے یہاں کسی انسان کا جھوٹا تو ناپاک سمجھا جاتا ہے لیکن انسان کی غلاظت بلکہ کتے کی غلاظت بھی پاک ہی ہے جب تک کہ وہ کسی معیوب صورت میں سامنے نہ آئے!

اس مستقل عمل سے انسان کے اندر پاکی کا اور ناپاکی کا ایک تصور منقش ہو جاتا ہے۔ یہ ناپاکی اور پاکی کا تصور چونکہ ایک مقدس اور مقتدر ہستی کی عبادت سے جڑا ہوا ہے اس لیے انسان کی فطرت کے اندر جو تقدس کے معنی ودیعت ہیں ان کو جلا بخشتا ہے۔ اور جب نسلوں کی نسلیں اس عمل سے گذرتی ہیں تو اندازہ لگایئے کہ تقدس کا یہ احساس اس امّت کے اندر کس قدر مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہ عمل انسان کے اندر دین اور دین کے شعائر کا انتہائی احترام پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ دین کی کسی بھی علامت کو مذاق بنانا کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ یہ عمل نماز پڑھنے کے لیے خصوصی طور پر کیا جاتا ہے اس لیے نماز اور نماز کے متعلقات کا بھی انتہائی احترام پیدا کر دیتا ہے۔

اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے موجودہ دور کے مغربی تمدن کی طرف ایک نظر دوڑایئے، جب ان کے ہاں مذہب پر زوال آیا تو کیا کیا نہ کیا گیا؟ انہوں نے تو آزادی کا مطلب ہی یہ سمجھا کہ مذہبی شعائر کی توہین کی جائے اور اس کا مذاق اڑایا جائے۔ اور اب جبکہ انہوں نے ادراک کر لیا کہ اسلام ہی ان کے لیے ایک بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے تو ان سب کی افتراء اور بدگوئیوں کا رخ اسلام کی طرف ہو گیا ہے جس کی وجہ سے عیسائیت نے یک گونہ راحت کی سانس لی ہے۔ اس کے مقابلے میں دیکھیں کہ مسلمانوں پر بھی ایسا وقت گزرا ہے کہ ایک عام مسلمان اپنے دین کی عقلی توجیہہ کرنے سے قاصر رہا اس کے باوجود اس طرح کا وقت اسلام پر اپنے بدترین دورِ زوال میں بھی نہیں گزرا۔

اسی طرح پنج وقتہ نمازوں کے بارے میں غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ نماز کے اوقات کے ذریعے سے کس طرح سے مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو مربوط اور منضبط کیا گیا ہے۔ رمضان کے روزوں کے بارے میں غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ہر سال مخصوص انداز میں ایک بے ساختہ اور غیر محسوس طریقے سے

جس طرح ایک دینی ماحول قائم کیا جاتا ہے اسی سے دراصل یہ امت آج تک امت چلی آرہی ہے۔ اندازہ لگایئے کہ اگر ہر سال رمضان میں روزوں اور تراویح کی باد بہاری سے ہمارے ایمان کو تازگی بخشی نہ جاتی تو یہ روایتی مسلمان زوال کے اس دور میں کیا اپنی شناخت باقی رکھ سکتا تھا؟ اگر ہر سال امت کے انفرادی اور اجتماعی انداز میں ایمان اور امت کے ساتھ وابستگی کے احساس کا احیاء نہ ہوتا تو پھر پتہ نہیں یہ امّت کیسے ہوتی۔ یہ ایک ایسی عبادت ہے جو نہ صرف اپنا ایک خاص بیرونی اثر رکھتی ہے بلکہ ایک مومن کے اندر بھی اپنا ایک طاقتور وجود رکھتی ہے۔

اپنے عمل کرنے والے کو ایک ایسی آزمائش سے گذارتی ہے جس میں فیصد لوگ کامیاب بھی ہوتے ہیں اور اسکے روحانی اثرات سے فیضیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر یہی روزے پورے سال میں پھیلے ہوتے تو کیا یہ نتیجہ پیدا کر سکتے تھے؟ حقیقت یہ ہے مسلمانوں میں جب سے نماز کے معاملے میں غفلت آئی ہے یہ رمضان کے روزے ہی ہیں جس نے اس امّت کو ایک جٹ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک باطل نظام کے اندر رہتے ہوئے نماز کا اہتمام خصوصاً انتہائی مشکل کام ہے اس لیے امت کی پہلی سرحد نماز پر تو بہت رخنے پڑ گئے لیکن یہ رمضان کے روزے ہی ہیں جس نے امت کی حفاظت میں دوسری سرحد کا کردار ادا کیا۔

حج کے بارے میں غور کریں کہ ایک عالمی امت جو کہ جغرافیائی اعتبار سے پھیلی ہوئی اگر اس کا عالمی مرکز نہ ہوتا اور مسلمانوں میں اس مرکز کی طرف رجوع کرنے کا اتنا شدید داعیہ نہ ہوتا تو پھر یہ امّت کس طرح پراگندگی کا شکار ہو جاتی۔ ڈیڑھ ہزار سال سے رمضان اور حج کے اہتمام کی وجہ سے اسلامی تمدن پر کیا کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں؟ ہر سال رمضان کا آنا اور جانا، روزے اور اسکا اہتمام اور اس کے لوازمات کے

سماجی اثرات اور اس کو عالم اسلام میں بیک وقت منانا اپنے اعتبار سے کئی اثرات و جہتیں رکھتا ہے۔ آج اگر دنیا کے باطل نظام "عالم اسلام" کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں تو بھی یہ رمضان اور حج کی ہی وجہ سے۔

یہ جتنی بھی عبادات ہیں وہ جب معاشرے میں پائی جائیں تو وہ اپنے حد تک نہیں رہتیں بلکہ اپنے کئی لوازمات خود بخود پیدا کرتی چلی جاتی ہیں جس کی وجہ سے دین ایک محسوس اور زوردار انداز میں معاشرے میں اپنا وجود منواتا ہے۔ اور اسی وجہ سے آج یہ امّت ناقابل تردید انداز میں ایک عالمی امّت کے طور پر اپنا وجود رکھتی ہے۔

شرعی احکامات کی حکمتوں کو معلوم کرنے کا رواج آج ہی شروع نہیں ہوا ہے بلکہ بہت پہلے سے علماء اسلام اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے کہ اسلام اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک شعوری ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ علمائے متاخرین میں اس حوالے سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں نہایت قابل قدر کام کیا ہے۔ مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب ہر حکم کی توجیہ natural science کے ذریعے سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں عجیب قسم کی توجیہات سامنے آتی ہیں جس کا نقص بعد میں ظاہر ہو تو پھر غیر ضروری مایوسی بھی ہوسکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے ہم اس بات کا ادراک کرلیں کہ جدید ذہن کو ہر وہ چیز دینا ضروری نہیں ہے جس کا وہ مطالبہ کر رہا ہے۔ بلکہ ہمیں پہلے اس ذہن کو سمجھ کر اس کو صحیح رخ پر غور و فکر کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا۔

تحریر ابوزید

دینی احکامات کی عقلی حکمتوں کی بنیاد پر ردو قبول

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصر حاضر میں نوجوانوں کی دین سے دلچسپی بڑھی ہے اور وہ دینی امور کی جانب راغب ہونے لگے ہیں۔ کالج کے طلبہ اور اعلیٰ تعلیم پانے والے افراد دینی امور میں دلچسپی لیتے ہیں اور نماز ودیگر عبادات کو انجام دیتے ہیں۔اسی کے ساتھ یہ بات بھی بہت خوش آئند ہے کہ مذہبی احکام کے علاوہ لباس، وضع قطع میں بھی بہت سارے نوجوان مذہبی رنگ کو پسند کرنے بلکہ اختیار کرنے لگے ہیں لیکن اسی کے ساتھ تشویش کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہمارا وہ طبقہ جو روشن خیال ہے جس نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے وہ یہ

سوچتے ہیں کہ اسلام کے تمام احکام عقل اور فہم پر مبنی ہیں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عقل کے دائرے سے باہر ہو۔ اسی لیے وہ ہر حکم کی حکمت جاننا چاہتے ہیں، عقلی وجہ اور سبب معلوم کرنا چاہتے ہیں دوسرے لفظوں میں انکے ہاں عقل کو مذہب پر حاکم بنایا جاتا ہے۔یعنی اگر کوئی حکم عقل کے دائرہ میں آرہا ہے اس کی حکمت سمجھ میں آرہی ہے تو اسے تسلیم کریں گے ورنہ تسلیم نہیں کریں گے۔

اس بات میں دو رائے نہیں ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے اور اسکے احکام انسانی نیچر سے مطابقت رکھتے ہیں۔ عقل پسندی کو پسند کرتا ہے لیکن عقل پرستی کو نہیں ۔۔ عقل پرستی سے مراد یہ ہے کہ ہر حکم کو عقل پر پرکھنا۔ عقل کو ہر معاملے میں رد و قبول کا معیار بنالینا..

توازن اور اعتدال ہی اسلام کی خوبی ہے اور یہی اعتدال عقل کے معاملے میں بھی رکھا گیا ہے۔ شریعت کے عام ظاہری احکام کے متعلق عقل کے استعمال سے منع نہیں کیا گیا بلکہ حق تو یہ ہے کہ قرآن و سنت سے فقہی احکام عقل کو ہی استعمال کر کے ترتیب دیے گئے ہیں۔ لیکن احکام وحی اور وہ معلومات جن کو جاننے کے لیے عقل کام نہیں کر سکتی تھی اور انکو عقل کے ذریعے سمجھایا نہیں جا سکتا تھا، انکو خالق کائنات نے اپنے مخصوص نمائندوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا ان میں عقل کے استعمال سے منع کیا گیا ہے کیونکہ ان میں مشاہدہ کام نہیں کر سکتا ان پر اعتبار کے لیے سند اور نشانیاں کافی ہے۔۔!

یہ اک سمجھ آنے والی بات بھی ہے. اب دنیا میں ہر ایک کی عقل متفاوت ہے تو کیا کسی قانون کی حکمت اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ صرف اس لئے ماننے سے انکار کردے کہ اس کی حکمت اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ اگر کوئی ایسا کرے کہ ملک کے کسی قانون کی یہ کہہ کر خلاف ورزی کرے کہ اس قانون کی حکمت

اس کی سمجھ میں نہیں آئی لہذا وہ اس کے ماننے کا پابند نہیں تو اسے لوگ احمق اور دیوانہ قرار دیں گے لیکن اسی چیز کو مذہب کے باب میں ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا جاتا ہے اور اس مذہبی حکم کو تسلیم کرنے والوں پر طعنے کسے جاتے ہیں۔

یہ کیسی دوہری روش ہے کہ ملکی قانون جو ہم جیسے انسانوں نے بنایا ہے وہ اگر سمجھ میں نہ آئے پھر بھی اس کی تعمیل ضروری لیکن خدا جو قادر مطلق ہے اس کے قانون کو ہم اپنی عقل پر تولتے ہیں اور اگر ہماری عقل کی حدود سے وہ قانون باہر ہوا تو پھر ہم انکار کرنے میں دیر نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں کہیں تو گویا ہم اپنی عقل کو اللہ میاں پر نافذ کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ میاں وہی قانون بنائیں جو ہماری عقل میں سماتی ہو، یہ کتنی بڑی گستاخی ہے۔

ہم اپنی ناقص اور محدود عقل کی بنیاد پر اللہ کے احکام کی حکمت متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ہماری ناقص عقل میں حکمت سمجھ میں نہیں آتی تو لازمی نہیں کہ وہ غلط بھی ہو۔ پھر جس چیز کی جو حد ہو اس حد سے اس کو آگے بڑھانا اس کی تکریم نہیں بلکہ توہین ہے۔ ابن خلدون نے اچھی مثال دی ہے کہ جس ترازو میں سونے اور چاندے تولے جاتے ہوں اس میں پہاڑ نہیں تولے جا سکتے، جس عقل میں ابھی ہم نے روز مرہ کی چیزوں کی حقیقت و ماہیت دریافت نہیں کی ہے اس عقل سے احکام الٰہی کی حکمت جاننے اور نہ جاننے پر ماننے سے انکار کرنے لگیں تو کیا یہ عقل کی بات ہے؟

ہو سکتا ہے کہ آپ یہ کہیں کہ یہ تو مذہبی ملا کی بات ہے اس کی تو دن رات کی گردان ہی یہی ہے لیکن یہ صرف مذہبی دیوانے کی بات نہیں ہے ادیبوں نے بھی اسی کو تسلیم کیا ہے۔ اقبال کا حوالہ دوں تو آپ کہیں

کہ وہ توخود نیم ملانے تھے اس لئے ہم دوسرے ادیب ممتاز مفتی کا حوالہ دے رہے ہیں۔ ممتاز مفتی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر عفت سے ایک غیر ملکی کرنل نے پوچھا''آپ کے مذہب میں سور کھانا کیوں حرام ہے''؟ڈاکٹر عفت نے کہا یہ ایک حکم ہے میرا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ کرنل صاحب، حکم کی وجہ جاننا ضروری نہیں، اسے ماننا ضروری ہے۔

کرنل ہنسا اور بولا جس حکم کو آپ سمجھتی نہیں، اس پر عمل کرنے کا مقصد

ڈاکٹر عفت ہنسیں، بولیں حیرت ہے کرنل صاحب کہ آپ فوجی افسر ہوتے ہوئے حکم کے مفہوم سے واقف نہیں، کرنل کھسیانا ہو گیا۔

عفت بولیں کرنل صاحب، ہر کلب کے اصول ہوتے ہیں جن کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ مذہب بھی ایک کلب ہے یا تو آپ کلب کے ممبر بنیں یا نہ بنیں یہ آپ کی مرضی پر موقوف ہے لیکن رکن بن جائیں تو پھر چوں وچرا کی گنجائش نہیں رہتی۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ مغرب کے زیر اثر ہم عقل کے اس قدر دیوانے بنے بیٹھے ہیں کہ کچھ حد نہیں، حالانکہ ہر فرد جسے تھوڑی سے سوجھ بوجھ بھی حاصل ہے اس حقیقت کو جانتا ہے کہ زندگی میں بہت کم باتیں ایسی ہیں جن پر عقل حاوی ہے اور بہت زیادہ باتیں ایسی ہیں جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ عقل کو ہم نے بت بنا رکھا ہے اس حد تک کہ یہ مانتے ہوئے کہ اللہ قدر مطلق ہے ہم عقل کے معیار کو اللہ تعالیٰ پر بھی عائد کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ہم سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یوں نہیں کرنا چاہئے تھا اللہ تعالیٰ کے

حکم کے پیچھے ضرور کوئی ایسی حکمت ہو گی جو ہم عقل کے زور پر سمجھ سکتے ہیں اس لئے ہم اس کی تلاش کرنے لگتے ہیں اور اگر کامیاب نہ ہوں تو حکم پر شک کرنے لگتے ہیں"۔

(رام دین، ممتاز مفتی، جلد اول صفحہ 14)

سوچنا یہ چاہئے کہ کیا اسلامی شریعت کے کسی حکم میں صرف وہی حکمت کارفرما ہے جو ہماری سمجھ میں آئی ہے اس کے علاوہ دوسری حکمتیں کارفرما نہیں ہیں۔ایک انسان ایک کام کرتا ہے تو ایک مقصد پیش نظر رہتا ہے اس سے زیادہ عقل مند شخص ایک کام کرتا ہے اور ایک پنتھ دو کاج اس کے پیش نظر رہتے ہیں اس سے بھی زیادہ عقل مند شخص ایک کام کرتا ہے اور کئی مقاصد اس کے پیش نظر رہتے ہیں تو پھر وہ ذات جو حکیم، علیم اور خبیر ہے اپنے بندوں کے تمام مصالح اور فوائد کو بخوبی جانتا ہے، وہ ذات جو حکمت کا سرچشمہ ہے اور عقل کا خالق ہے تو کیا اس کے حکم میں صرف اتنی ہی مصلحت ہو گی جو ہماری سمجھ میں آرہی ہے؟

جب ایک انسان کے کسی کام میں کئی حکمتیں پوشیدہ ہو سکتی ہیں اور سبھی کا ذہن اس جانب نہیں جا سکتا تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی حکمتوں کا انسانی عقل کیسے احاطہ کر سکتی ہے جب کہ انسانی عقل روزمرہ پیش آنے والے حالات اور معاملات کا ہی احاطہ نہیں کر سکتی۔حد تو یہ ہے کہ اس نے ابھی جو کچھ جانا ہے سمجھا ہے وہ اس کے مقابلے میں کچھ نہیں جو اس نے نہیں جانا ہے اور چیزوں کے بارے میں ظاہری اور سطحی معلومات ہی حاصل کی گئی ہیں۔ حقیقت تک رسائی کسی چیز میں بھی نہیں ہو سکی ہے۔کرنٹ سے ہم کام لیتے ہیں لیکن کرنٹ کی حقیقت کیا ہے یہ معلوم نہیں،انسانی جسم میں روح کی حقیقت کو تسلیم کرتے

ہیں لیکن روح کیا ہے ہم نہیں جانتے، دماغ کے بے شمار خانے ایسے ہیں جہاں تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی ہے کہ اس کا کام کیا ہے اور وہ کیسے کام کرتا ہے۔

وہ لوگ جو بزعم خود کسی حکم الہی کی حکمت سمجھتے ہیں اور پھر خود ہی موجودہ دور میں اس کی ضرورت کے نہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں ان کی روش نہایت خطرناک ہے۔ان کا حال اسی نادان لڑکے جیسا ہوگا جس کی مثال شیخ شرف الدین منیری نے بیان کی ہے۔

"اس کو ایسا سمجھو کہ ایک شخص نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر محل تعمیر کیا، وہاں انواع واقسام کی نعمتیں جمع کیں جب اس کا اخیر وقت ہوا تو اس نے لڑکے کو وصیت کی کہ اس محل میں جو تم مہم وتصرف چاہنا کرنا لیکن ایک خوشبودار گھاس کا ایک حصہ جو میں چھوڑ کر جا رہا ہوں وہ چاہے خشک ہو جائے اس کو باہر نہ کرنا، جب پہاڑ کی چوٹی پر بہار آئی تو پہاڑ ومیدان سب سرسبز ہو گئے، بہت سی تازہ اور خوشبودار گھانس پیدا ہو گئی جو اس پرانی گھانس سے زیادہ تروتازہ تھی، اس میں بہت سی گھانس اور پھول اس محل میں آئے جن کی خوشبو نے سارے محل کو معطر کر دیا اور ان کے سامنے اس پرانی سوکھی گھانس کی خوشبو دب گئی، لڑکے نے سوچا کہ میرے والد نے یہ پرانی گھانس اس محل میں اس لئے رکھی تھی کہ اس کی خوشبو پھیلے اور یہ جگہ اس سے معطر ہو، اب یہ سوکھی گھاس کام آئے گی اس نے حکم دیا کہ اس گھاس کو باہر پھینک دیا جائے، جس وقت محل اس گھاس سے خالی ہو گیا، ایک کالے سانپ نے سوراخ سے سر نکالا اور لڑکے کو ڈس لیا اور اس کا کام تمام ہو گیا، سبب اس کا یہ تھا کہ اس گھاس کے دو فائدے تھے ایک یہ کہ وہ خوشبو دے اور دوسرے اس میں خاصیت تھی کہ وہ جہاں ہوتی ہے سانپ اس کے قریب نہیں جا سکتا گویا وہ سانپ کا تریاق تھی یہ خاصیت کسی کو معلوم نہیں تھی۔لڑکے کو اپنی ذہانت پر ناز تھا، وہ سمجھا کہ جو اس کے معلومات کے دائرہ میں نہ ہو گویا کہ

قدرت خداوندی کے خزانہ میں موجود نہیں،اس کو اس آیت کا مفہوم نہیں معلوم تھاوماواوتیتم من العلم الاقلیلاوہ اپنی ذہانت کے غرہ میں مارا گیا۔“(تاریخ دعوت وعزیمت صفحہ 155/3)

اسی لیے قرآن کریم نے کوئی بھی حکم دیا ہے تو یہ نہیں کہا ہے کہ اس کو جانو اور سمجھو بلکہ صرف اتنا ہے کہ اس کو مانو،ہر جگہ قرآن کریم کا یہی انداز تخاطب ہے اے لوگوں جنہوں نے مانااور تسلیم کیاہے(یاایھاالذین آمنو)لیکن بدقسمتی یہ رہی ہے کہ بعض لوگوں نے جاننے اور ماننے کا یہ فرق نظروں سے اوجھل کردیا۔قرآن یہ کہتاہے کہ یہ حکم ہے اسے مانو اور تسلیم کرو(یاایھاالذین آمنوآمنو)لیکن ہمارااصرار اور مطالبہ ہوتاہے کہ ہم سمجھیں گے تومانیں گے ہم جانیں گے تومانیں گے۔مولانامناظراحسن گیلانی اسی تعلق سے لکھتے ہیں

مذہب اور مذہبی حقائق وامور کے متعلق مذکورہ بالااصول ایک ایسی جانی پہچانی بات ہے کہ مختلف مذاہب کے مقابلہ وموازنہ میں عموماًدنیااسی اصول سے کام لیتی رہی ہے۔پچھلے دنوں یورپ کے ارباب فکرونظرنے اسی سلسلے میں غلو سے کام لیتے ہوئے مذہبی حلقوں میں کچھ ایسی باتیں پھیلادیں کہ جاننے اور ماننے کافرق خام کاروں کے سامنے سے کچھ ہٹ ساگیااور مذہب جس کی طرف سے ہمیشہ آمنویعنی ماننے کا مطالبہ پیش ہوتارہایعنی دنیا سے کہاجاتاتھاکہ مانو لیکن سننے والے کہنے لگے کہ ہم توان چیزوں کو نہیں جانتے،گویاگلاب کے پھول کو پیش کرکے کہاجائے کہ اس کو سونگھواور جواب میں کہہ دیاجائے کہ گلاب کی خوشبو کوہم سن نہیں رہے ہیں۔پچھلے دنوں مغربی خیالات سے متاثرذہنیتوں میں الملائکۃ،الجنۃ،النار،البرزخ،یہ اوراسی قسم کے مذہبی حقائق کے متعلق تذبذب اور شک کی جو کیفیت پیداکی گئی اس کی بنیاد جاننے اور ماننے کے اس خلط مبحث ہی پر قائم تھی،مذہب توکہتاتھاکہ فرشتوں کو مانو

لیکن خواہ مخواہ کی عقلیت کے مدعیوں کی طرف سے کچھ ایسی باتیں پیش ہونے لگیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم فرشتوں کو دیکھ نہیں رہے ہیں حالانکہ ان سے دیکھنے کا مطالبہ ہی کب کیا گیا تھا۔

(دجال کا فتنہ اور اس کے خدوخال، مولانا مناظر احسن گیلانی)

آخر میں ایک بات جو نہایت ضروری ہے وہ بتانا ضروری ہے کہ پوری دنیا میں قانون کا یہی انداز ہے کہ قانون کی بنیاد علت پر ہے حکم پر نہیں ہے۔ یعنی قانون کی وجہ کیا ہے اگر وہ وجہ پائی جائے گی تو حکم بھی پایا جائے گا۔ حکمت پر دنیا میں کہیں بھی قانون کی بنیاد نہیں رکھی جاتی ہے۔ اور یہی اسلامی شریعت میں بھی ہے۔ مثلاً سفر کے دوران نماز میں قصر یعنی چار رکعت کی جگہ دو رکعت پڑھا جانا، تو قصر کی علت سفر ہے۔ سفر پایا جائے گا تو قصر بھی ہوگا، اگر سفر نہیں ہوگا تو قصر بھی نہیں ہوگا۔ اب اگر کوئی کہے کہ چونکہ اب سفر آسان ہو گیا ہے اس لئے قصر ختم کر دینا چاہیئے تو اس کی بات غیر معقول ہوگی، کیونکہ حکمت مقصود نہیں تھی۔۔!! اسی طرح وضو کیلیئے نماز ضروری ہے تو وضو کی علت نماز ہوئی جب نماز کا وقت ہوگا اور انسان بے وضو ہوگا تو اس کیلیئے وضو کرنا لازمی ہوگا۔ اب کوئی کہے کہ پہلے بندے پاک صاف نہیں رہتے تھے اب پاک صاف رہتے ہیں اس لئے وضو کی ضرورت نہیں تو یہ بات غیر معقول ہوگی کیونکہ صرف صفائی کی حکمت ہی مقصود نہیں۔۔

ابن جمال

جدیدیت دین کے بارے میں تین رویے رکھتی ہے: انکار، تشکیل اور لاتعلقی۔ ایک رویہ اور ہے، لاادریت Agnosticism۔ لیکن یہ اصل میں لاتعلقی کا حصہ ہے۔ جدیدیت کی تشکیک Classical Skepticism نہیں ہے بلکہ انکار کو مکمل اور مدلل کرنے کا عمل ہے اور اس کے جو مظاہر ہیں وہ یوں لگتا ہے کہ انکار کی تبلیغ کے ذرائع ہیں۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ تشکیک بھی دراصل انکار ہی ہے جس پر اس لیے باریک سا پردہ ڈالا گیا ہے تاکہ دین کے ماننے والوں کے ذہن کو بے بس کر کے انکار پر مجبور کر دیا جائے۔ ان تمام رویوں کے پیچھے ایک ایسا Rationalism کارفرما ہے جس میں عقل، علم، حقائق وغیرہ کی تعبیر کلاسیکی فلسفے کی طرح آزادانہ انداز سے نہیں کی گئی بلکہ ایک خاص تصورِ حقیقت اور مقصدِ زندگی کے تحت انہیں define کیا گیا ہے اور ان کے کردار کو محدود بھی کیا گیا ہے۔ گویا جدیدیت میں علم کی تشکیل کا عمل شے کو مرکز بنا کر نہیں بلکہ ذہن کو غالب کر کے ہوتا ہے۔ یعنی عمومی تصورِ علم کے مطابق علم، معلوم یعنی شے کے تابع نہیں ہے بلکہ عالم یعنی Subject کے پابند ہے۔

اب مسئلہ یہ نہیں ہے کہ شے کیا ہے؟ بلکہ یہ ہے کہ شے کو کیسا ہونا چاہیئے؟ اس مجموعی فضا میں کم از کم بیسیوں صدی تک دین کے بارے میں جدیدیت کا مؤقف یہ رہا ہے کہ اسے مطابقِ عقل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انسان مجبور ہے کہ صحیح و غلط کا فیصلہ عقل کی روشنی میں یا کم از کم عقلی اطمینان کے ساتھ کرے۔ بظاہر اس بات کا دوسرا حصہ یعنی عقلی اطمینان، کچھ ایسا غلط نہیں نظر آتا، لیکن اس میں چالاکی یہ ہے کہ جس عقل کے اطمینان کو شرطِ ردو قبول بنایا جا رہا ہے خود اس عقل کی تعریف یک طرفہ، مصنوعی اور جبری ہے۔ مثلاً اسی بات کو دیکھ لیجیے کہ دین کو معقول ہونا چاہیئے۔ اس میں ایک بنیادی ترین بات، زور زبردستی

کے ساتھ چھپائی گئی ہے اور وہ یہ کہ خود عقل کو کیا ہونا چاہیئے ؟ عقل کو بھی تو مطابقِ دین ہونا چاہیئے۔ کیونکہ عقل اپنی ماہیت میں محتاج الی الغیر ہے اور یہ غیر اس کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ واقعی اور آزادانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں معقول، عقل ہر مقدم ہے۔ عقل کی ساری سرگرمیاں اور اس کا ہر کردار کچھ شرائط سے مشروط ہے جنہیں اس نے خود سے اپنے اوپر نافذ نہیں کیا۔ تو اگر اہلِ دین یہ کہیں کہ وہ binding شرط دین ہے یا وحی ہے تو اس میں کوئی عقلی اور منطقی غلطی نہیں ہے۔ یعنی دین وہ شرط ہے جو عقل کے مادۂ تعقل، اندازِ فہم، مزاجِ علم اور حدودِ کار کا حتمی تعین کرتی ہے۔ جیسے کہ مثال کے طور پر جدیدیت کیلیے یہ حیثیت ان کے نظریے یا دنیا کو حاصل ہے۔ عام طور پر مذہبی لوگ اس چال کو سمجھ نہیں پاتے، اس لیے اس طرح کی باتوں کے مقابلے میں غیر مطلوب رویے اختیار کر لیتے ہیں۔ جدیدیت کے ہر سوال کو ایک الزامی جواب کے ساتھ face کرنا چاہیئے۔ اس بات میں کیا غلطی ہے بلکہ کیا شبہہ ہے کہ عقل ایک ماقبلِ تعقل تناظر میں رہ کر کام کرتی ہے۔ جدیدیت نے اس کو ارادی تناظر بنادیا ہے۔ یہ بہت بھیانک کاروائی ہے، لیکن اس میں غلطی کی نشان دہی کیے بغیر ہم جدید لوگوں سے کہ سکتے ہیں کہ تم بھی تو عقل کیلیے ایک binding perspective مانتے ہو۔

عقل و نقل کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے کہ :

۱) نقل حجت ہے عقل پر۔

۲) وحی ایک واقعہ ہے اور اگر اس کی نقل تواتر کے ساتھ ثابت ہے تو عقل اس کی مخاطب کی حیثیت سے محض ایک کردار رکھتی ہے اور وہ ہے، ثابت شدہ نقل کے محتویات contents کو نقل ہی کی شرائطِ

صحت پر سمجھنا اور سمجھنے کے بعد اسے تعقل کی تمام سرگرمیوں پر حاکم بنانا۔ یعنی ثابت شدہ نقل اگر عقل کے کچھ مسلمات کے خلاف ہو تو معقولیت کا اٹل تقاضہ یہی ہے کہ ان مسلمات کو ترک کر دیا جائے، اور سب جانتے ہیں کہ عقل اپنے مسلمات کو کسی حجت تک پہنچ جانے کے بعد رد کرتی رہتی ہے۔ بعض مرتبہ یہ تردید حسی تجربے کی وجہ سے ہوتی ہے، بعض مرتبہ کسی نئی منطق کو قبول کرنے کی بدولت ہوتی ہے۔ یعنی محرکِ تردید خارج میں ہوتا ہے۔ اب وحی سے بڑا واقعہ کیا ہو سکتا ہے۔ اگر تجربے اور مشاہدے سے مسلمات کو چھوڑا جاسکتا ہے تو وحی سے تو بدرجہ اُولی ترک کیا جاسکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ عقل بھی اللہ کی مخلوق ہے، اور اس کے ذمے دو کام ہیں: ایک اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو سمجھنا اور ایک اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کرنا۔ فطرت کی سمجھ میں عقل تقریباً آزاد اور خود مختار ہے اور ہدایت کے قبول میں قبلِ قبول آزاد ہے بعد از قبول منفعل passive۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ عقل کی کامل تعریف ہے جسے عقل کی تحقیق و تجزیہ کرنے والے ہر علم کیلیے بآسانی واجب التسلیم بنایا جاسکتا ہے۔ عقل کیلیے وحی میں مشمول حقائق کو ماننا ازروئے عقل واجب ہے اور جاننا محال۔ اس کا ماننا چونکہ وحی پر منحصر ہے اور اس کی ہدایت یابی کے اقتضا کی تکمیل کرتا ہے لہذا عقل کی مجموعی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ماننے، یعنی ایمان کو، جاننے، یعنی علم کی صحت اور افادیت کی بنیاد بنائے۔ اس طرح عقل، وحی سے سند پا کر اپنے تمام کاموں کو بھی، جو خواہ ہدایت سے متعلق ہوں یا فطرت سے، مستند بنا لیتی ہے اور اگر عقل وحی سے استناد نہ پاسکے تو تعقل کا نتیجہ اس صحت و افادیت سے محروم رہے گا جو ہدایت اور فطرت دونوں میں مشترک ہے۔ عقل ہدایت کے مقولے category ہی میں اپنی تعریف پوری کرتی ہے۔ فطرت کے دائرے میں اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ہمارا تصورِ عقل یہ ہے کہ عقل، ہدایت اور افادیت کا تالیفی ملکہ ہے اور اس کا کام ہدایت رسانی اور افادیت رسانی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ واضح رہے کہ افادیت چاہے عارضی ہو یا دائمی، ہدایت کے تابع ہے، کیونکہ حقیقی افادیت کا شعور ہدایت یابی ہی سے میسر آتا ہے۔اس کی سب سے بڑی دلیل خود شعورِ انسانی ہے۔ شعور کو چاہے جس عینک سے دیکھا جائے اس کا قوامِ وجود، ہدایت ہی ہے جو ہمارے نزدیک وحی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

محمد رشید ارشد، شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

مذہب اور سائنس کے اختلاف کی بحث

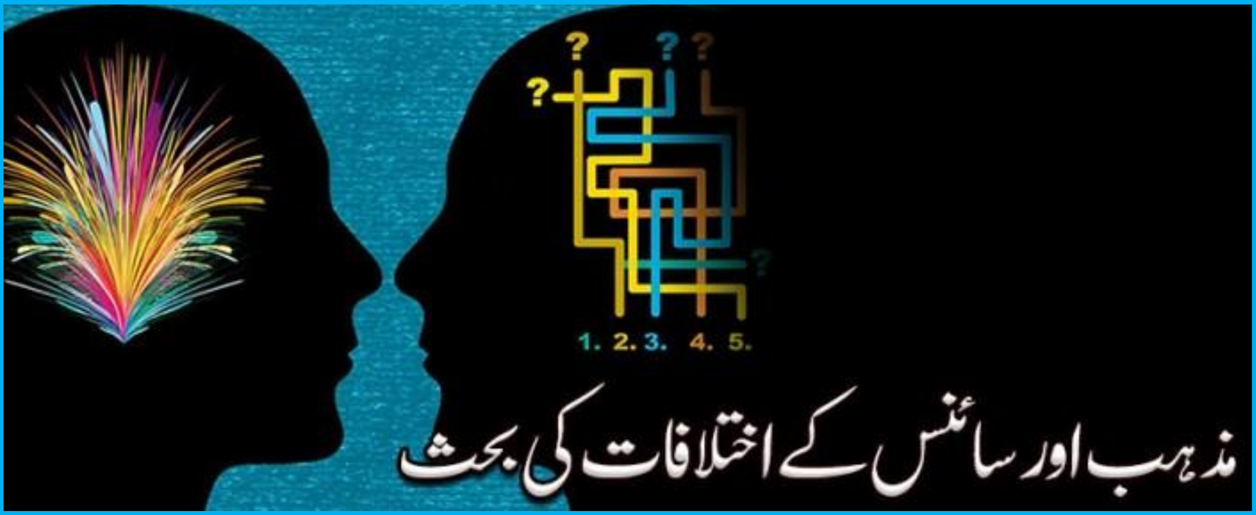

مجھے ایک بات جو کبھی سمجھ میں نہیں آئی وہ سائنس اور مذہب کا تقابل ہے۔ اس نکتہ پر میں بارہاں اپنی مختلف تحاریر میں اشارہ کرتا رہا ہوں اور سوال یہ ہے کہ سائنس اور مذہب کو آمنے سامنے لا کر کس لیے کھڑا کیا جائے؟ جواب میں بہت ساری باتیں کی جاتی ہیں لیکن آج تک مکمل طور پر یہ طے نہیں کیا جاسکا ہے کہ سائنس اور مذہب کا اختلاف کیا ہے؟ میں فی الحال سائنس کے یا مذہب کے کسی خاص نظریہ یا عقیدہ پر نہیں بلکہ ان دونوں کے اجمالی مقاصد کے حوالے سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔

کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ان کے عقائد کو ایک اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کسی مذہب کے خدا، اس کے پیغمبر اور ان کے نظریات (جب تک کہ دوسرے مذہب کے لوگوں کو ان کی وجہ سے جانی اور مالی یا کسی اخلاقی قسم کا نقصان نہ پہنچے تب تک) کسی خطرے اور کشیدگی کا باعث نہیں ہوتے۔ درمیان مذاہب البتہ اونچ نیچ اور گرمی و سردی کے موسم آتے رہتے ہیں۔

یہ بات اہم ہے کہ مذاہب کا مقدمہ بنیادی طور مندرجہ ذیل نکات پر مبنی ہوتا ہے:

۱۔اخلاقی اقدار، معاشرت کے قوانین اور ان کے نفاذ کی کوشش۔

۲۔مقصودِ کائنات اور انسان کی زندگی کا مقصد۔

۳۔الہیات کی گتھیوں کا حل۔

اپنے اپنے ادوار میں مختلف فلاسفہ نے مذاہب سے مطابقت اور مخالفت میں ان تینوں نکات پر اپنی آراء دنیا کے سامنے رکھی ہیں۔ لیکن یہ تینوں ہی نکات ہمیشہ سے متنازع رہے ہیں اور رہیں گے۔ کیونکہ ان میں رفعِ تنازع کے لیے کوئی حتمی کسوٹی آج تک میسر نہیں آسکی جو ہر ایک کے لیے حجت بن سکے۔

اس کے برعکس سائنس کا موضوع ''فطرت کے قوانین کی تفہیم ہے''۔ کائنات میں ظہور پذیر ہونے والے مظاہر کے مادی اسباب کا استقرائی بنیادوں پر تلاش کرنا اور ان اسباب کا استعمال انسانی فلاح و بہبود کے لیے ممکن بنانا سائنس کا کام ہے۔

اب ایک بات تو یہ طے ہوگئی کہ مذہب اور سائنس دونوں کا موضوع مختلف ہے۔اور جب موضوع مختلف ہے تو تنازع ''مذہب اور سائنس'' میں تو ہر گز نہیں ہوسکتا۔ ہاں بالواسطہ اگر کوئی سائنسی علوم کو مذہب کے خلاف ہتھیار بناتا ہے اور چند ایک نظریات کو ڈھال بنا کر مذاہب کا پورا مقدمہ دریا برد کرنا چاہتا ہے تو ہم ایسی صورت میں سائنس کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ درحقیقت وہ لوگ جو مذاہب کے خلاف سائنس کو ڈھال یا ہتھیار بنا کر استعمال کررہے ہیں وہ نہ تو سائنس کے نفسِ مضمون سے واقف ہیں نہ مذہب کے مقدمہ کا انہیں دماغ ہے۔ ایسے لوگوں کو سلام کرکے ان سے رخصت چاہنا مناسب ہے۔

دوسری طرف اگر کوئی مذہب کو بنیاد بنا کر سائنس کو مردود جانتا ہے تو وہ بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہے کہ سائنس کو صرف اسی کے مذہب سے دشمنی ہے۔

سائنس ایک ایسا علم ہے جس کی تدوین اور ترقی کے لیے تمام مذاہب بشمول ملحدین کے، انسانوں نے صدیوں محنت اور لگن کے ساتھ کام کیا ہے۔اسی طرح اس کے فوائد سے بھی تمام مذہبی اور لامذہب غرض ہر قسم کے افراد بہرہ ور ہوئے۔ تو پھر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ سائنس کسی خاص مذہب یا اعتقاد رکھنے والوں کی جاگیر نہیں جن سے اسے منسوب کیا جاسکے۔ ایسے میں سائنس کے چند ایک نظریات کو صرف اس بنیاد پر مردود جاننا کہ ان سے ہمارے مخالف کو جلا ملتی ہے، یا پھر یہ کہنا کہ سائنس مذہب کے مخالف کوئی چیز ہے، یا یہ کہ سائنسی نظریات ان لوگوں سے مخصوص ہیں جو مذہب کو نہیں مانتے، یہ ساری باتیں مناسب نہیں ہیں۔

ہم جب یہ مان لیتے ہیں کہ سائنس کا کام صرف اور صرف مظاہر کے مادی اسباب تلاش کرنا ہے تو پھر اس تلاش میں جو بھی منطقی نظریات وجود میں آئیں گے انہیں غیر جانب دار ہو کر تسلیم کرنا پڑے گا۔اس سے نہ تو کسی مذہب کے نفسِ مضمون کو نقصان پہنچتا ہے نہ کسی مخالفِ مذہب کو اس سے مذہب کی مخالفت میں بولنے کا کوئی جواز ملتا ہے. کوئی بھی نظریہ جو سائنس سے تعلق رکھتا ہے وہ چونکہ مظاہر کے ظہور پذیر ہونے کی مادی توجیہہ ہوتی ہے اور ایسی تمام توجیہات عقل اور استقراء کی مطابقت سے کشید کردہ ایک لازم نتیجہ ہوتی ہیں. اس لیے اسے انہی حدود میں رہتے ہوئے تسلیم کرنا چاہیے۔

یہاں تک آنے میں ہم نے اس بات کو سمجھا ہے کہ سائنس اپنے موضوع میں ایک ایسا علم ہے جس کے بنیادی مقاصد سے کسی مذہب کو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہ سائنس مذہب اور الحاد کی بحث سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

اب جو حضرات مذہب کی حمایت کو بنیاد بنا کر سائنسی نظریات کو رد کرتے ہیں وہ بے شک رد کریں۔ لیکن کم از کم اس کی ماہیت کو ضرور سمجھیں تاکہ رفعِ تعارض کی کوئی راہ نکل سکے۔ جب بات مادی توجیہہ کی آئے گی تو سائنس کو حرفِ آخر ماننا پڑے گا۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ زمین پر چیزیں اس لیے گرتی ہیں کیونکہ کشش ثقل انہیں اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اب اس کے برعکس اگر کوئی یہ بحث کرے کہ نہیں صاحب، زمین پر چیزیں خدا کے حکم سے گرتی ہیں۔ اور کشش ثقل کا کوئی وجود نہیں۔ تو ایسا کرنے والا دراصل سائنس کے مقدمے کو سمجھ نہیں پا رہا۔ جب بات ہی مادی اسباب کی ہے تو مجرد اسباب پر زبردستی کرنا ایک غیر اصولی بات ہے۔

اسی طرح سائنس کے کسی نظریہ کو بنیاد بنا کر مذاہب کے مخالف بولنے والے دراصل مذہب کے نفس مضمون اور سائنسی مقاصد کے درمیان کا فرق ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے۔ اور اپنے نظریات کا پرچار کرنے کی خاطر سائنس کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ سائنس کا موضوع نہ تو الٰہیات کے معاملات میں ٹانگ اڑانا ہے، نہ اخلاقیات اور معاشرت کے قوانین بنانا۔ اب اسی کو مدِ نظر رکھ کر اگر نظریۂ ارتقا کی بحثوں کو دیکھا جائے تو وہاں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔

نظریۂ ارتقا کو اس طرح سے زیرِ بحث لانے کی روایت دراصل عیسائی انتہا پسندوں کے بعد سے شروع ہوئی ہے۔ اور اس طرح کی بحث ہم نے عوامی فورمز اور ان لوگوں میں تو دیکھی ہے جو اکیڈیمکلی نظریۂ ارتقا کو

نہیں پڑھ چکے۔ تاہم جب ہم کلاس روم میں اس نظریہ کو پڑھتے ہیں یا کوئی بھی گریجویٹ یا پوسٹ گریجویٹ طالب علم اسے پڑھتا ہے تو اس کا موضوع مذہب یا صرف انسان نہیں ہوتا۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان کو پڑھا نہیں جاتا۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس طرح نہیں پڑھا جاتا جس طرح عوامی فورمز میں ہم اسے ارتقا کی حیثیت سے بلا واسطہ مباحث میں لایا کرتے ہیں۔ ہم بلا واسطہ یہ نہیں پڑھتے کہ انسان کا ارتقا کیسے ہوا؟ بلکہ یہ پڑھا جاتا ہے کہ ٹیکزونومکل حیثیت سے کیا کیا تبدیلیاں جانوروں کے مختلف فائلمز میں آرہی ہیں۔ مثلاً گیسٹرو ویسکیولر کیویٹی کن مراحل سے گزر کر ''ہائڈرا'' سے انسان تک پہنچ کر گیسٹرو انٹیسٹائنل ٹریکٹ بناتی ہے۔ اسی طرح نان ویسکیولر سے ویسکیولر پلانٹس کس طرح ایک سیکوینس میں رکھے جارہے ہیں۔ پودے کی جڑ کی ابتدائی اور انتہائی صورتوں میں کیا تبدیلیاں آئی ہیں۔

کوئی مستند بائیولاجسٹ کبھی اس طرح بحث کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا کہ وہ سارا زور انسان کے ارتقا پر لگا کر اسے منوانے کی کوشش کر رہا ہو۔ جبکہ اسے بطور سائنس پڑھنے والے ہر قسم کے مذہب اور لامذہب لوگ بھی ہیں۔ اس بحث کو بڑھاوا دینے والے دو ہی قسم کے لوگ دیکھے گئے ہیں۔ ایک تو مذہبی شدت پسند عیسائی اور مسلمان یا دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے جارح قسم کے افراد۔ اور دوسرے وہ شدت پسند دہریے یا ملحد جو کسی بھی صورت میں نظریۂ ارتقا کی کسی کمزوری کو ماننے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے۔

میری ناقص رائے میں دونوں ہی ایک لاحاصل بحث میں مبتلا ہیں۔ ایسی بحث سے نہ سائنس کو کوئی فرق پڑتا ہے نہ اس کے مقاصد میں کوئی کمی یا زیادتی ہوتی ہے۔ کام کرنے والے اپنے کاموں میں ہمیشہ سے مصروف ہیں۔ وہ مصروف رہیں گے۔ ہاں اپنے نظریات میں جارحیت پسند لوگ ہمیشہ ان چیزوں میں بھی اختلافات

کے اسباب تلاش کرتے رہے ہیں جن میں اختلاف تھا ہی نہیں۔اور یہی بات سائنس کے لیے مذہب کو اور مذہب کے لیے سائنس کو شجرِ ممنوعہ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ڈاکٹر مزمل شیخ بسمل

مذہب اور سائنس کے اختلافات کا پس منظر

انسانی زندگی کے کچھ خواص ہیں، اور ان خواص کے اعتبار سے کچھ لوازم بھی۔ انسانی زندگی کا مادّی وجود جہاں اس سے بہت سی چیزوں کا تقاضا کرتا ہے، اسی طرح اس کا ایک روحانی وجود بھی ہے، جو اس سے 'مذہب' مانگتا ہے۔ انسان مادّی اعتبار سے خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے، اس کا روحانی وجود اسے سکونِ قلب کی طلب پیدا کر کے، اسے اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ بلکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ مادّیت کی دوڑ میں انسان جس قدر آج بڑھتا جاتا ہے، اتنی ہی اس کی روحانی تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے، یہ پیاس ہی مذہب کے وجود کی سب سے بڑی، سب سے وقیع، سب سے وزنی اور عالمگیر دلیل ہے!

سائنس دورِ جدید کے انسان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔ یہ بات بھی درست ہو گی کہ سائنس سے سائنسی ایجادات مراد لی جائیں، لیکن سائنس بذاتِ خود ایک طرزِ فکر کا نام ہے، جو گزشتہ زمانے میں بد قسمتی سے، چند خارجی و داخلی وجود کے سبب، اور ابتدائی سطح پر ملنے والی کامیابیوں سے حاصل ہونے والی سرخوشی کے زعم میں مذہب اور خدا کے وجود سے ٹکرا گئی تھی، لیکن اب ہر سطح پر اس کا احساس

پیدا ہو چلا ہے کہ سائنس کا میدان اور ہے اور مذہب کے فرائض اور۔ سائنس کا مذہبی اُمور میں کوئی دخل نہیں ہے، البتہ مذہب کا سائنسی معاملات میں دخل ضرور ہے، جو کہ برس ہا برس کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن یہ دخل تعمیری اور مثبت نوعیت کا ہے، منفی اور تخریبی نہیں۔ لہٰذا دونوں میں ٹکراؤ اور تضاد کی کیفیت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا جب دونوں کے مفادات مشترک ہوتے، اور جب دونوں کا میدانِ عمل ایک ہوتا۔ منطق کی زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کے مابین 'عموم و خصوص مطلق' کی نسبت ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی حوالے سے اسلام کی تعلیمات کے تناظر میں گفتگو کی گئی ہے، اور مقصد اس غلط فہمی کا ازالہ ہے کہ کیا مذہب سائنس کا مخالف ہے؟ یا اہل مذہب اور اہل سائنس میں حقیقتاً کسی ٹکراؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے؟

سائنس اور مذہب کے اختلافات کا پس منظر:

سائنس اور مذہب کا یہ ٹکراؤ اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کی پیداوار ہے، اور یہی وہ دور ہے جب جدید سائنس کا ظہور ہوا، اور دنیا نے اسے کسی علم بلکہ مکتبِ فکر کے طور پر پہچانا۔ سائنسی دریافتوں میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لئے بڑی کشش تھی، پھر اس کا دار و مدار مکمل طور پر مشاہدے اور تجربے پر تھا۔ یہ چیزیں انسانی شعور اور عقل کو براہِ راست متاثر کرتی ہیں اور انسان ظاہر میں نظر آنے والی چیزوں کا اثر زیادہ تیزی سے اور شدت کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ پھر ایک اور بات بھی ہے، عربی محاورے 'کل جدید لذیذ' کے مطابق ہر نئی چیز لذیذ ہوتی ہے۔ سائنس مذہب کے مقابلے میں ایک نئی چیز تھی، ان اسباب و عوامل کی بنا پر لوگوں کا اس کے اثرات تیزی سے قبول کرنا ایک فطری عمل تھا، مگر خرابی یہاں سے شروع ہوئی کہ سائنسی دریافتوں سے جو ماحول بنا، اس میں لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب خدا کی کوئی ضرورت نہیں رہی، اور مذہب

ایک فرسودہ روایت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ان کے نزدیک خدا کو ماننا اس لئے ضروری تھا کہ اس کو مانے بغیر کائنات کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی، اب جدید سائنس نے یہ عقدہ حل کر دیا ہے۔ اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کائنات اور اس میں واقع ہونے والا ہر امر ایک سبب کی وجہ سے ہے، اور وہ سبب معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ یہ سب کچھ قانون فطری ہے، Law of Nature کے لگے بندھے اُصولوں کے تحت وقوع پذیر ہو رہا ہے۔

دوسری جانب یوں ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں، جو وحی الٰہی پر مبنی تھیں، وقت کے ساتھ ساتھ تغیر اور تحریف نے جگہ پکڑلی اور یونانی فلسفے نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا، اور رفتہ رفتہ فلسفیانہ مباحث مذہب کا جز بن کر تقدس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ فلسفہ بہت سے زمینی حقائق اور معروضی حالات کے خلاف تھا، اور اس میں خیالی اور تصوراتی مفروضوں کی بہتات تھی۔ جب سائنس کی مشاہدے اور تجربات پر مشتمل دریافتیں اور انکشافات سامنے آنا شروع ہوئے تو مذہب کا حصہ بن جانے والے ان مفروضوں میں دراڑیں پڑنے لگیں، جس سے اہل مذہب (کلیسا) نے اپنے وجود کو خطرہ سمجھا، اور یوں اہل سائنس اور اہل مذہب (عیسائیت) کے مابین ایک کشمکش کا آغاز ہو گیا، جس کے نتیجے میں پوپ کے خاص حکم کے تحت احتساب عدالت قائم ہوئی، جس میں تقریباً تین لاکھ افراد کو حاضری دینا پڑی۔ ان کو سخت سزائیں دی گئیں، اور تقریباً ۳۰ ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان سزا یافتگان میں گلیلیو اور برونو جیسے افراد بھی شامل تھے، یہ مذہب اور سائنس کی علیحدگی اور ان کے مابین چپقلش کا نقطہ عروج تھا، اور یہیں سے وہ جنگ شروع ہوئی، جو بالآخر علم اور مذہب کی جنگ بن گئی۔ (۱)

جن باتوں نے مذہب (عیسائیت) اور سائنس کے مابین ان سنگین اختلافات کو جنم دیا، ان میں سے بات کو سمجھنے کے لئے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ ارسطو نے مرکزیتِ زمین کا نقطہ نظر پیش کیا تھا، یہ خالصتاً یونانی فکر تھی جس کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں تھا، مگر چونکہ یہ نظریہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مسیحی مذہب کا حصہ بن چکا تھا، اس لئے جب کوپرنیکس (۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ئ) نے مرکزیتِ آفتاب کا تصور پیش کیا تو عیسائی پیشواؤں کے ہاں کھلبلی سی مچ گئی، اور انہوں نے کوپرنیکس کی زبان بندی کردی۔ کیونکہ یورپ میں اس وقت مسیحی پیشواؤں کو اقتدار حاصل تھا، جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ (۲)

اس 'جنگ' اور محاذ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ مشاہداتی علم (سائنس) اور مذہب دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور ایک کی ترقی دوسرے کے لئے موت کا درجہ رکھتی ہے، حالانکہ یہ خیال واضح طور پر سراسر غلط تھا۔

مگر ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم (سائنس) لوگوں کو خدا اور مذہب سے دور کرنے والا بن گیا۔ سائنس اور مذہب کا یورپ میں ہونے والا یہ تصادم کوئی دو صدی تک جاری رہا، حتیٰ کہ ۱۸۵۹ء میں ڈارون نے اپنی کتاب Origin of species شائع کی۔ چرچ کی جانب سے اس کی بھرپور مخالفت کی گئی، مگر اب چرچ کی طاقت کمزور پڑ چکی تھی، اس لئے رفتہ رفتہ صلح کے امکانات پیدا ہونے لگے، اور بالآخر دونوں کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا، جو دراصل سیکولرازم ((Secularism کی صورت میں تھا، اب مذہب اور سائنس کے درمیان حدود کار متعین کردی گئیں اور دونوں کے دائرے الگ الگ ہو گئے۔ (۴)

یوں کلیسا اور اہل سائنس کے مابین جاری جنگ کا تو خاتمہ ہو گیا، مگر در حقیقت مذہب اور سائنس دونوں نے وہ راستہ اختیار کیا، جو فطرت کے سراسر خلاف تھا، اس لئے رفتہ رفتہ حالات سدھرنے کی بجائے مائل بہ انحطاط ہوتے چلے گئے اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ مذہب اور خدا ہر اعتبار سے (بزعم خود و بزعم غلط) ان کی زندگیوں سے نکل گیا۔ لیکن یہ ایک غیر فطری رویہ تھا، نتیجۃً خدا پھر بھی موجود رہا، اور مذہب کی ضرورت پھر بھی باقی رہی۔ آخر کمرے میں اپنے آپ کو بند کر کے، اور روشنی کی گزر گاہوں کو ختم کر کے، دن کے وقت میں انسان اپنے آپ کو رات ہو جانے کا تو غلط اطمینان دلا سکتا ہے، مگر سورج کی موجودگی کو تو ختم نہیں کر سکتا۔ یہ تھا سائنس اور مذہب کے اختلافات کا اصل پس منظر، اور جب ہم سائنس، مذہب تعلقات کی بات کرتے ہیں، تو اس پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

انکارِ مذہب کا سبب

اب تک کی بحث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کے وجود کا انکار قطعاً سائنس کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ مذہب اور مذہبی تعلیمات سے روگردانی اور ان سے لاعلمی کا نتیجہ ہے، لیکن آج کے دور میں انکارِ مذہب کا ایک اہم سبب اور بھی ہے، اور اسے بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ سبب مغرب کے ہاں پھیلتا اور بڑھتا ہوا تصورِ آزادی ہے، جس کو ہم 'مادر پدر آزادی' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ آزادی رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے اب اس مقام انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ اب ان کو ہر اس معقول چیز سے بھی خوف آنے لگا ہے، جو ان کی اس خود ساختہ آزادی کو ذرا بھی قدغن لگاتی ہو۔ خدا اور مذہب کے انکار کے پیچھے بھی یہی تصور کارفرما

ہے، یہی وہ بنیادی خوف ہے، جو انہیں انکارِ مذہب کے لایعنی فعل پر اُکسا رہا ہے۔ ایک امریکی ماہر طبیعات جارج ہاربرٹ (George Herbert Blovnt) ان چند لوگوں میں سے ہیں، جنہیں اس امر کا اعتراف ہے، وہ کہتے ہیں:

"مذہب (خدا پرستی) کو ماننے کی معقولیت، اور خدا سے انکار کی غیر معقولیت بذاتِ خود ایک آدمی کے لئے عملاً خدا پرستی اختیار کرنے کا سبب نہیں بن سکتی۔ لوگوں کے دلوں میں یہ خوف چھپا ہوا ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ اہل علم جو ذہنی آزادی کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں، ان کے لئے اس آزادی میں کمی یا محدودیت کا کوئی بھی تصور بڑا تشویشناک ہے۔" (۵)

اللہ کا پیغام کسی نہ کسی نبی ہی کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے، اور اس نبی کا پیغام تسلیم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی بات کو خدا کی بات تسلیم کیا جائے، اس لئے جب وہ کوئی بات کہے تو تمام لوگوں کیلئے اس کو تسلیم کرنا ضروری ہو گا، اور یہ بات ان لوگوں کیلئے قابل قبول نہیں ہو سکتی، جو عقل کو بلکہ صرف اپنی ہی عقل کو سب کچھ تصور کر کے اس کی پیروی کو ضروری سمجھتے ہیں۔

سائنس اور مذہب—افراط و تفریط کا جائزہ

جب تک اس امر کی وضاحت نہ ہو جائے کہ سائنس اور مذہب کے درمیان کس نوع کا اختلاف ہے؟ اس وقت تک ہمارا یہ دعویٰ صحیح صورت میں سامنے نہیں آسکتا کہ سائنس اور مذہب کے مابین دراصل میدانوں کا فرق ہے۔ دونوں کے میدان الگ الگ ہیں، اس لئے ان دونوں کی خدمات کو گڈمڈ نہیں

کیا جا سکتا، اور جو خرابی بھی پیدا ہوئی ہے، اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ہم نے دونوں کے دائرہ کار کو باہم گڈمڈ کر دیا ہے۔ اگر یہ بات واضح ہو جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ سائنس کو مانتے ہوئے، اس پر عمل کرتے ہوئے اور اس سے متمتع ہوتے ہوئے بھی مذہب کو خصوصاً مذہبِ اسلام کو تسلیم کیا جا سکتا ہے، اور اس کے مطالبات پورے کئے جا سکتے ہیں، دونوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے...!!

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہ اختلاف اس وقت پیدا ہوا، جب اہل سائنس نے یہ جان لیا کہ دنیا کا نظام قانونِ فطرت پر چل رہا ہے، اور کائنات میں پیش آنے والے واقعات ایک متعین قانونِ فطرت کے مطابق رونما ہو رہے ہیں، اس لئے ان کی توجیہ کرنے کے لئے کسی نامعلوم اور غیر موجود خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضرورت اس وقت تھی، جب تک ان واقعات کی توجیہ ہمارے سامنے نہیں آئی تھی۔ حالانکہ ذرا سا غور و فکر کرنے والے پر بھی اس استدلال کی غیر معروضیت اور سطحیت واضح ہو سکتی ہے۔ سوال تو یہ تھا کہ اس کائنات کے نظام کو برقرار اور مثبت طریقوں پر قائم رکھنے والی ایک اتھارٹی ناگزیر ہے، اور اس ذات کی ناگزیریت اب بھی علیٰ حالہٖ قائم ہے، کیونکہ اب تک کی تگ و دو سے سائنس نے جو کچھ معلوم کیا ہے، وہ قانونِ فطرت کی صورت میں صرف اس سوال کا جواب ہے کہ یہ کائنات کیا ہے؟ مگر مذہب جس سوال کا جواب دے رہا ہے، وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس طرح طے شدہ پروگرام اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ اپنے اپنے مقررہ وقت اور مدت پر پیش آ رہا ہے، وہ کیوں ہو رہا ہے؟

مذہب ان واقعات کے اصل اسباب و محرکات پر گفتگو کرتا ہے، لہٰذا سائنس کی دریافتوں کے باوجود مذہب کی ضرورت موجود و برقرار ہے، بلکہ اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے، جب سائنسی توجیہات پر غور و فکر کرنے

والا شخص ڈور کا اصل سرا نہیں پاتا، اور یوں اسے اپنی زندگی میں خلا محسوس ہونے لگتا ہے۔ایک امریکی ماہر حیاتیات سی سیل بوائس ہمن (Cecilboyce Hamann) اس بارے میں کہتا ہے:

”غذا ہضم ہونے اور اس کے جزوِ بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، اب جدید مشاہدے میں وہ کیمیائی ردّ عمل کا نتیجہ نظر آتا ہے، مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہو گئی؟ آخر وہ کون سی طاقت ہے، جس نے کیمیائی اجزا کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردّ عمل ظاہر کریں، غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب و غریب خودکار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آ گیا، حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدے کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعے عمل کرتا ہے، جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔“(٦)

در حقیقت سائنسی تگ ودو نے ہمیں واقعے کی صحیح تصویر تو دکھا دی ہے، مگر یہ واقعہ درست طور پر کیونکر پیش آتا ہے؟ اس تک سائنس رسائی حاصل نہیں کر سکتی، قوانین فطرت کیسے وجود پذیر ہوئے؟ ان کو درست نہج پر کس نے استوار کیا؟ اور پوری کائنات کا یہ ڈھانچہ، جس سے یہ کائنات متمتع ہو رہی ہے، کس طرح اس قدر صحت و توازن کے ساتھ قائم ہے کہ اس کو دیکھ کر سائنسی قوانین اخذ و ترتیب دیے جا رہے ہیں؟ ان سوالات کا جواب سائنس نہیں دے سکتی، اور اس لئے نہیں دے سکتی کہ یہ اس کے دائرۂ اختیار میں ہی نہیں آتے، اس کے لئے مذہب کی جانب رجوع کرنا ہو گا، اور یہی وہ ذریعہ ہے جو انسان کی تشنگی بجھا سکتا ہے۔

سائنس اور مذہب کے مابین مفاہمت کا درست اور قابل عمل طریقہ کار یہی ہے کہ اس ضمن میں پھیلی ہوئی غلط آرا، غلط خیالات و تصورات اور فضا کو پراگندہ کرنے والی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، خصوصاً اسلام کے حوالے سے یہ بات واضح کردی جائے کہ سائنسی ایجادات اور اسلامی تعلیمات میں کوئی تباین نہیں، کوئی تضاد نہیں ہے۔ اور اگر کسی مقام پر ایسا نظر بھی آتا ہے، تو وہ عارضی ہے، اور اسلامی تعلیمات کی کنہ اور حقیقت تک رسائی حاصل نہ ہو سکنے کا نتیجہ ہے یا سائنسی تجربے اور مشاہدے کا نقص ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ "سائنس علت و معلول کی ہر کڑی میں غایت ((Purpose کو ضرور شامل کرے، اگر اس نے سلسلہ واقعات کی ہر کڑی میں مقصدیت کو تسلیم کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے خدا کے وجود کو تسلیم کر لیا، اس کے ضابطہ اخلاق کو تسلیم کر لیا۔ یومِ حساب کو تسلیم کر لیا، اور سائنس کی سرکشی نے خدا کے وجود کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔(۷)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ شرط کوئی نئی نہیں، نہ پہلی بار پیش کی گئی ہے، نہ سائنس اس سے ناآشنا ہے، بلکہ اس شرط کے ذریعے سائنس کو اس کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد کرایا جا رہا ہے اور اسے اس بات کی دعوت دی جا رہی ہے جس پر وہ اس سے پہلے خود قائم تھی۔ برٹرینڈ رسل کہتا ہے

"سائنس کے دائرۂ کار میں یہ بات پہلے بھی شامل رہی ہے، لامذہبیت اختیار کرنے سے پہلے تک سائنس واقعات کے ہر سلسلے کو مذہب کی طرح علت، معلول اور غایت پر منحصر سمجھا کرتی تھی۔"(۸)

پھر اہم بات یہ ہے کہ غایت/مقصدیت کو اگر سائنس میں شامل کر لیا جائے تو مطالعہ سائنس میں زیادہ معنویت پیدا ہو سکتی ہے، ایک فاضل محقق کے بقول: "مقصدیت کو سائنس میں شامل کر لینے سے ہر

مضمون میں علت اور معلول کی حکمتوں تک انسان کی رسائی ہو سکے گی، اس کے بعد سائنس کا مطالعہ زیادہ بامعنی ہو جائے گا۔ اس کام میں مسلمان سائنس دانوں پر بہت اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم اس اُصولِ مفاہمت کے مذہبی سطح پر پہلے ہی سے قائل ہیں، اس لئے ہمیں چاہئے کہ اس اُصول کو سائنس کی آئیڈیالوجی بنائیں، اور اس آئیڈیالوجی سے عالمی سائنس کو روشناس کرائیں۔"(۹)

یہ گفتگو اس اعتبار سے تھی کہ سائنس مذہب کا انکار کر کے جن خطرات سے دوچار ہو رہی ہے، ان سے بچنے کا محفوظ طریقہ مذہب کے زیر سایہ آجانے کے سوا کچھ نہیں ہے، یہی فطرت کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن ایک اور پہلو سے بھی سائنس کو مذہب کی چھتری درکار ہے، سائنس نے انکشافات و اکتشافات کے میدان میں تو یقیناً بے حد ترقی کر لی ہے، مگر وہ اخلاقیات اور نفسیات کے میدان میں بہت پیچھے ہے، ان میدانوں میں اس کے انحطاط پر یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ سائنس جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، اخلاقیات کے میدان میں اس کا تنزل اور انحطاط اسی رفتار سے زیادہ ہو رہا ہے۔(۱۰)

ان حالات میں خصوصاً کسی ایسی رکاوٹ کی ضرورت ہے، جو سائنس کو ان تنزلیوں کا شکار ہونے سے روک سکے، اور اسے ایک ایسا مربی درکار ہے، جو اسے بتا سکے کہ اسے کیا کرنا ہے، اور کن اُمور سے اپنے آپ کو باز رکھنا ہے؟ مختصر لفظوں میں یہ کہ اس کی حدودِ کار کیا ہیں؟ جدید سائنسی تحقیقات و ایجادات کے بعد اس کی ضرورت یوں بھی بڑھ گئی ہے کہ ان کے نتیجے میں ایسے عوامل سامنے آرہے ہیں، جن کی موجودگی پوری انسانیت کے لئے خطرہ بن رہی ہے۔ ان کی مثال میں دو چیزوں: مہلک ایٹمی و جراثیمی ہتھیار اور سائنسی ایجادات سے متاثر ہونے والے عالمی ماحول کو پیش کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے پوری دنیا میں موجود امن پسند اور دردِ دل رکھنے والے اصحابِ علم اور اصحابِ فکر و نظر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

اس خطرے کو بھی مذہب اور بالخصوص اسلام ہی ٹال سکتا ہے جو اس سمت میں بھی واضح اور دو ٹوک رہنمائی کرتا ہے۔اس کا سادہ اور واضح اُصول یہ ہے کہ جو چیزیں انسانیت کے لئے مفید ہیں، وہ اختیار کرنا ضروری ہیں۔اور جن سے انسانوں بلکہ کائنات کو کسی بھی قسم کے ضرر پہنچنے کا خدشہ ہو تو اس سے احتراز ضروری ہے، اور اگر اس سے فوائد بھی وابستہ ہوں تو ایسی تدابیر اختیار کی جائیں، جن سے اس کی مضرت ختم ہو جائے... یہ ہے اسلامی نقطہ نظر کا خلاصہ !

یہ صورتِ حال عرصے سے اہل علم کو مضطرب کئے ہوئے ہے اور اس کا احساس غیر مسلم مفکرین کو بھی ہے، اور غور و فکر کے بعد وہ بھی اِسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس مشکل سے نکلنے کا واحد حل مذہب ہے۔ریان اپیل یارڈ (Reyenaple Yard) اپنی کتاب عصر حاضر کی تفہیم (Understanding the Present) میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''سائنس کی کوئی اخلاقیات یا ایمان نہیں ہے، اور وہ ہمیں ہماری حیات کے معنی، مقصد اور اہمیت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی، لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ سائنس کی فیضاتی کارکردگی ثابت کرتی ہے کہ وہ سب چیزیں مہیا کر سکتی ہے۔لوگوں میں اس غلط خیال کو مستحکم کرنے میں سائنسی لٹریچر پیدا کرنے والوں کا بڑا ہاتھ ہے، جو عموماً ناقص بلند آہنگ اور اکثر غلط ملط مقبولِ عام لٹریچر لکھتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کو واپس کھینچ کر ثقافت و تہذیب کے دائرے میں لایا جائے، تاکہ اس کے بدترین استعمالات اور بھیانک دعوؤں کو لگام دی جاسکے۔''(۱۱)

ایک اور دانشور جو خود بھی فزکس کے پروفیسر ہیں، فرٹ جوف کیپر نے سائنس کے فروغ اور سائنسی رجحانات میں اضافے سے پیدا ہونے والی صورتحال پر تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''ہماری صدی، یعنی

بیسویں صدی کے گذشتہ دو دہے کے آغاز میں ہم اپنے آپ کو گھرے عالمگیر بحران کی حالت میں پاتے ہیں، یہ مختلف الجہات بحرانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے اثرات ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں یعنی صحت اور سامان زندگی، ماحول کی کیفیت، سماجی تعلقات، معیشت، صنعت اور سیاست کو چھوتے ہیں۔ یہ بحران، ذہنی، اخلاقی اور روحانی سمت کا ہے۔ یہ بحران ہے میزان اور ضرورت کا، جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، پہلی مرتبہ ہمیں نسل انسانی اور اس کے کرۂ ارض کے تمام جانداروں کو ہلاکت کی حقیقی دھمکی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔" (۱۲)

آگے چل کر کیپر، نیوٹن کے نظریۂ حرکت کے طبیعاتی دنیا میں انقلابی اثرات پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مطلق عالمگیر مشین کی اس تصویر میں ایک خارجی خالق مضمر ہے، یعنی ایک شہنشاہ خدا، جس نے دنیا میں اپنے آسمانی قوانین کے نفاذ کے ذریعے حکومت کی ہے، طبیعاتی مظاہر کو کسی بھی معنی میں بجائے خود آسمانی نہیں سمجھا گیا، اور سائنس نے ایسے کسی خدا پر یقین کو زیادہ سے زیادہ مشکل بنا دیا اور تقدس سائنس کے عالمی نظریے سے مکمل طور پر غائب ہو گیا، جس کے نتیجے میں روحانی خلا پیدا ہوا، جو ہمارے تہذیبی دھارے کی خصوصیت بن گیا ہے۔" (۱۳)

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دو وجوہ کی بنا پر، جن میں پہلی وجہ سائنس کے فروغ سے روحانی دنیا میں پیدا ہونے والا خلا ہے، اور دوسری وجہ اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی بحران ہے، سائنس کے لئے مذہب کو قبول کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ پھر اہم بات یہ ہے کہ اسلام سائنس کو نہ صرف قبول کرتا ہے، بلکہ وہ خود تجربے اور مشاہدے نیز غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، البتہ اس کا مدعا اس سے یہ ہوتا ہے کہ انسان اس تدبر اور غور و فکر

کے ذریعے اس کائنات کے ربّ تک پہنچ سکے، اور پھر بعد کے اقدام کے طور پر وہ اس کے احکامات کی بھی بجاآوری کر سکے، یہی انسانیت کی معراج ہے اور یہی اسلام کا مطالبہ ہے!!

حواشی و حوالہ جات

۱۔ مولانا وحیدالدین خان، اسلام اور عصر حاضر، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۳، کسی قدر اضافے اور ترمیم کے ساتھ یہ تفصیل اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

۲۔ نفس مصدر، ص ۱۱۲، نیز دیکھئے: سائنس اور مذہب میں مفاہمت، حفیظ الرحمن صدیقی، مشمولہ سہ اشاعتی آیات، مدیر ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی، مرکز الدراسات العلمیہ، علی گڑھ، ج سوم، ش اوّل، جنوری تا اپریل ۱۹۹۲ء ص ۷۔۳ــــــ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ کوپر نیکس کے نظریے کے بعد گلیلیو (۱۶۲۴ تا ۱۵۶۲ئ) نے بھی اس کی تائید کر دی، اور یوں ان کے ہاں ایک تقدس پا جانے والا نظریہ غلط ٹھہرا، اس کی یہ تغلیط خالصتاً ایک علمی بحث تھی، جیسا کہ آگے چل کر بیان ہو گا کہ مسلم دنیا نے اسے ایک علمی بحث کے طور پر ہی لیا۔ مگر ایک غلط نظریے کی تغلیط بد قسمتی سے عیسائیت کی تغلیط سمجھ لی گئی، جس کے نتیجے میں بعد میں افسوسناک واقعات رونما ہوئے۔

۳۔ القرآن، سورۂ فاطر، آیت ۲۸ ۴۔ اسلام اور عصر حاضر، ص ۱۱۴ ۵۔ Georee Herbert Blount, The Evidence of God, p.130 ۶۔ Cecil Boyce Hamann, The Evidence of God in an Expanding Universe.

۷۔حفیظ الرحمن صدیقی، سائنس اور مذہب میں مفاہمت، مشمولہ سہ اشاعتی آیات، مدیر ڈاکٹر p.221 محمد ریاض کرمانی، مرکز الدراسات العلمیہ، علی گڑھ، ج سوم، ش اوّل، جنوری، اپریل ۱۹۹۲ئ، ص ۴۱

۸۔ Bertrand Rusel, The Impact of Science on Society, London, 1952, P.18-19

۹۔حفیظ الرحمن صدیقی، محولہ بالا۔ ۱۰۔ملاحظہ کیجئے راقم کا مضمون 'مغرب کا سائنسی و نفسیاتی زاویۂ فکر، تدریج وارتقا، سہ ماہی منہاج، مدیر حافظ سعد اللہ، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، ستمبر ۲۰۰۲ء

۱۱۔سائنس اور آج کی دنیا، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، دسمبر ۱۹۹۴ء

۱۲۔دیکھئے فرٹ جوف کیپر کی کتاب ٹرننگ پوائنٹ (The Turning Poing, p.21)

۱۳۔ محولہ بالا

۱۔مولانا وحید الدین خان، اسلام اور عصر حاضر، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۳، کسی قدر اضافے اور ترمیم کے ساتھ یہ تفصیل اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

۲۔نفس مصدر، ص ۱۱۲، نیز دیکھئے: سائنس اور مذہب میں مفاہمت، حفیظ الرحمن صدیقی، مشمولہ سہ اشاعتی آیات، مدیر ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی، مرکز الدراسات العلمیہ، علی گڑھ، ج سوم، ش اوّل، جنوری تا اپریل

۱۹۹۲ء ص ۳۷ ـــــــ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ کوپرنیکس کے نظریے کے بعد گلیلیو (۱۶۲۴ تا ۱۵۶۲ئ) نے بھی اس کی تائید کر دی، اور یوں ان کے ہاں ایک تقدس پا جانے والا نظریہ غلط ٹھہرا، اس کی یہ تغلیط خالصتاً ایک علمی بحث تھی، جیسا کہ آگے چل کر بیان ہو گا کہ مسلم دنیا نے اسے ایک علمی بحث کے طور پر ہی لیا۔ مگر ایک غلط نظریے کی تغلیط بدقسمتی سے عیسائیت کی تغلیط سمجھ لی گئی، جس کے نتیجے میں بعد میں افسوسناک واقعات رونما ہوئے۔

۳۔القرآن، سورۂ فاطر، آیت ۲۸ ۴۔اسلام اور عصر حاضر، ص ۱۱۴ ۵۔ Georee Herbert

Cecil Boyce ۔۶Blount, The Evidence of God, p.130

Hamann,The Evidence of God in an Expanding Universe.

p.221 ۷۔حفیظ الرحمن صدیقی، سائنس اور مذہب میں مفاہمت، مشمولہ سہ اشاعتی آیات، مدیر ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی، مرکز الدراسات العلمیہ، علی گڑھ، ج سوم، ش اوّل، جنوری، اپریل ۱۹۹۲ئ، ص ۴۱

۸ ۔ Bertrand Rusel, The Impact of Science on Society, London, 1952, P.18-19

۹۔حفیظ الرحمن صدیقی، محولہ بالا۔ ۱۰۔ملاحظہ کیجئے راقم کا مضمون 'مغرب کا سائنسی و نفسیاتی زاویۂ فکر، تدریج وارتقا، سہ ماہی منہاج، مدیر حافظ سعد اللہ، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، ستمبر ۲۰۰۲ء

۱۱۔سائنس اور آج کی دنیا، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، دسمبر ۱۹۹۴ء

۱۲۔دیکھئے فرٹ جوف کیپر کی کتاب ٹرننگ پوائنٹ (The Turning Poing, p.21)

۱۳۔ محولہ بالا

یہ حقیقت سے فرار نہیں ہو سکتا۔۔!

اس نے پوچھا، قران کریم میں جو آفاق و انفس کی نشانیاں اور براہین، وجود و قدرت باری تعالی کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ دل کو اپیل کرتے ہیں. ذہن کی گتھیاں بھی سلجھتی ہیں اور دل میں اطمینان بھی سرایت کرتا ہے.... مگر یہ جو آخرت کے تذکرے ہیں، ہمیشگی کی زندگی اور نعمتوں بھری جنتوں میں کبھی نہ ختم ہونے والے عیش و آرام کے بیان ہیں، یہ عقل انسانی کو کیسے سمجھ آئیں؟

ایک مسکراہٹ تھی جو دل میں اٹھنے والی بیقرار لہر کا پیغام بر بن گئی. وہ جو دل کے نہاں خانوں میں چھپکے سے پلتے پلتے ایک سوچ گھنا درخت بن گئی ہے، کیا اس کی ایک جھلک دکھلا دی جاے؟

انسانی عقل ہو سکتا ہے کہ اس کو سمجھ نہ پائے مگر انسانی ذھن اور روح کی بیکراں وسعتوں میں ہمیشہ سے پرفیکشن کی مضطرب جستجو موجود رہی ہے، اور انسانی تخلیقات میں اسی جستجو کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے.

ہماری یہ زندگی نقائص اور مجبوریوں کی زنجیروں میں بندھی رہی ہے، مگر انسانی لاشعور نے ان پر کبھی تکیہ یا سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ اپنی تخلیقی اور تخیلاتی صلاحیتوں کو کام میں لا کر محدود کر دینے والے افق کے اس پار پرواز کی ہمیشہ کوشش کی ہے.

انسان کہانی کہنا اور سننا پسند کرتا ہے. اور کہانی کیا ہے؟

کہانی جس کا انسان سے ازل کا ساتھ ہے. یہ کہانی انسان کی قوت تخلیق، تخیلاتی پرواز، ان دیکھے کی جستجو اور اپنی مرضی کا جہاں خود تعمیر کرنے کی چھپی خواہش کا خوبصورت اظہار نہیں تو اور کیا ہے.

انسانی ذھن نے ایسی دنیائیں تخلیق کیں، جہاں حسین و جمیل لوگ رہتے ہیں، چاندنی راتوں میں گھنے درختوں سے پریاں اتر کراتی ہیں اور پھولوں سے لدی جھاڑیوں تلے اگنے والی کھمبیوں میں چھپے بونوں اور بکرے اور گھوڑے نما انسانوں کے ساتھ رقص کرتی ہیں. نارنجی صدری پہنے رابن کے سینے میں ظالم جادو گرنی کا تیر لگ بھی جاے، تو درویش کے معجزاتی عرق کے چند قطروں سے وہ مرنے کے بعد بھی جی اٹھتا ہے. جہاں درختوں پر ایسے لذیذ پھل لگتے ہیں جن کو کھانے سے کبھی بھوک نہیں لگتی، پلک جھپکتے لذیذ ترین کھانوں سے سجے خوان ظاہر ہو جاتے ہیں. جہاں محبت اور اخلاص کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور ظالم اور جابر محبت سے محروم ہو کر مایوسی سے مر جاتا ہے. جہاں کہانی کے اختتام پر سب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں.

یہ زندگی کی محدودیت اور مجبوری کی طرف سے عدم اطمینان اور کمال کے حصول کی چھپی خواہش نہیں تو اور کیا تھا جس نے میرے بابا اور ماما کو شجر ممنوعہ کھانے پر اکسایا تھا.

یہی خواہش تھی جس نے انسان سے کہیں متوازی دنیائیں اور کہیں ہائی فنتیسی کی صورت بالکل نئے جہاں تعمیر کروایے. اسی خواہش نے انسان سے لازوال کتھائیں کہلوائیں، اسی نے دیومالائیں لکھوائیں. آج اس عقل و خرد اور ،،حقیقت پرستی،، کی دنیا میں بھی ہیری پوٹر، لارڈ آف دا رنگز اور ڈزنی کی کہانیاں بیسٹ سیلرز ھیں. اور یہی ہے جو عقل پرستوں سے ،،سائنس فکشن،، کے نام پر اسی قسم کے دوسرے جہاں تعمیر کرواتا ہے.

انسانی داستانوں ، دیومالاؤں اور کتھاؤں اور شاعری کی صورت ''مبالغہ آرائیوں'' کا یہ سارا مجموعہ نرا ''حقیقت سے فرار'' نہیں ہو سکتا. جبکہ حقیقت خود کیا ہے؟ ڈبے میں بند شرودن گر کی بے چاری بلی.

ہمارے خیال میں انسانی تخلیقات کا یہ پورا حیرت کدہ گواہ ہے کہ انسان کو کسی اور جہاں کی جستجو ہے. جو اس کے لاشعور میں بسی اسی حسین دنیا کی جھلک یا ذائقہ ہے، جہاں چند روزہ قیام کے بعد اسے اذن سفر ملا تھا.

ایسے میں اس کے ساتھ اس سے بڑی زیادتی کیا ہو گی کہ بالآخر اسے معلوم ہو کہ یہی دنیا اول و آخر ہے. اور تم کو اپنی ساری حسرتیں اور خواہشات لے کر یہیں مر کھپ جانا ہے.

اور اگر میرے جیسی، آنکھیں میچ کر خرگوش کے بل سے ایلس کے حیرت کدہ میں گھس جانے کے خواب دیکھنے والی کو آنکھیں کھولنے پر یہ معلوم ہو کہ جھلملاتے ستاروں سے سجی ایک مکمل اور حسین دنیا اس بے پناہ عجیب اور خود فرشتوں کو حیران کر دینے والے انسان کی حقیقی منزل ہے، تو کیسا ہو؟

تحریر جویریہ سعید

ٹیکنالوجی اور قیامت کی نشانیاں

موجودہ دور میں ٹیکنالوجی کا وجود اپنی جگہ پر ماننا پڑتا ہے اور اسکے ظاہری فوائد و نقصانات نہ صرف سامنے ہیں بلکہ غیر محسوس اور امکانی فوائد و نقصانات پر بھی اکثر اوقات ماہرین کے مباحث ہوتے رہتے ہیں، جو کہ اپنی جگہ درست اور وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ لیکن اسی طرح اکثر محققین و ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ

سب سائنس اور ٹیکنالوجی کوئی ایسی شے نہیں کہ جو ایک دفعہ وجود میں آگئی تو بس اب ہمیشہ رہے گی۔اور اسکی مثال قرآن سے بھی مل جاتی ہے جہاں اللہ تعالی مختلف اقوام کا تذکرہ کرتے ہیں جن میں سے کچھ کے پاس بڑے وسیع ڈیم بنانے کی ٹیکنالوجی موجود تھی، کچھ قومیں بلڈنگز اور عمارات بنانے میں ماہر تھیں۔

اور کچھ آثار تو اب بھی ایسی ٹیکنالوجی کے اس دنیا میں موجود ہیں۔ماہرین اور محققین ابھی تک مصر میں موجود تکونی عمارتوں کے وجود انکی بناوٹ اور مقصد پر مباحث اور تحقیق کر کے انکے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ غرضیکہ ٹیکنالوجی کے بارے میں یہ سمجھ لینا کہ بس یہ اب آگئی اور ہمیشہ ہمیشہ رہے گی نہ صرف ایک احمقانہ رویہ ہے بلکہ ایک مسلمان کو کسی طور زیب نہیں دیتا۔خاص کر جب اسی ٹیکنالوجی کی مدد سے انسان نے ایسے خطرناک ہتھیار بنا لئے ہیں جو پوری دنیا کی تباہی کا سامان ہیں۔

ابھی کل ہی بات ہے روسی صدر ولادی میر پوٹن نئے روسی ساختہ نیوکلیر ہتھیاروں کے بارے خوشخبریاں سنا رہے تھے۔ لہذا انہی چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے جہاں مغربی ماہرین یہ ان مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں کہ آیا وہ دور کب اور کیسے آئے گا جب انسان ایک دوسرے پر ایسے مہلک ہتھیاروں سے حملہ کر کے دنیا تباہ کریں گے۔اور اسکی ایک مثال موجودہ دور میں عراق، شام، لیبیا وغیرہ کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے کہ دنیا میں اتنی ترقی اور ٹیکنالوجی موجود ہونے کے باعث وہ معاشرے کچھ ہی دنوں میں post apocalyptic ناولوں اور فلموں کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں۔

لیکن عجیب بات ہے کہ نگاہوں کے سامنے ایسے مشاہدات موجود ہونے کے باوجود کچھ دوست آجکل دجال کی سواری پر، دجال کے ایک شخص کو مار کر صرف ایک ہی مرتبہ زندہ کر سکنے پر، دجال کی نیزے سے موت پر، اور زمین سے دابہ العرض کے نکلنے پر عجیب و غریب غیر موجود سائنسی تاویلات پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ بھئی حیرت ہوتی ہے کہ کیا آپ کا اللہ کی قدرت پر ایمان اتنا کمزور ہے کہ آپ کے لئے یہ یقین کرنا محال ہے کہ اللہ تعالی زمین سے ایک بولنے والا جانور نکال سکتا ہے؟ اگر اللہ صالح علیہ السلام کی قوم کے لئے پہاڑ سے اونٹنی نکال سکتا ہے تو زمین سے قرب قیامت میں ایک بولنے والا جانور نکالنا کونسا محال ہے؟ پھر اس پر آرٹی فشل انٹیلیجنس والی تاویلات کو اتنے یقنی طریقے سے بیان کرنا کہ جیسے پوری دنیا اسی کے کنٹرول میں ہوگی۔ حالانکہ موجودہ عالمی حالات کو دیکھ کر واضح ہوتا جارہا ہے کہ بہت سے علاقے جنگ وجدل کے بعد ایک post apocalyptic مناظر بن کر off grid ہو جائیں گے۔ اور جس طرز پر جنگ مشرق وسطی میں پھیلتی جارہی ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ سعودی جہاں یہ جانور نکلے گا، ان حالات کا شکار نہ ہو ایسی صورت میں جب وہ فلحال بھی یمن کے علاقے میں کسی قسم کی جنگ میں بہر حال ملوث ہے۔

لہذا ایسی تاویلات کو صرف ایک امکان سمجھ کر تو موضوع گفتگو بنایا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا شروع کر دینا کہ چونکہ پرانے دور کے لوگوں کے پاس وہ ٹیکنالوجی میسر نہیں تھیں جواب ہیں لہذا انکو سمجھانے کے واسطے یہ اسلوب اپنایا گیا۔ جو کہ نہایت غیر منطقی اور سطحی اپروچ ہے۔ حالانکہ اس دور میں ہوائی جہاز اور راکٹ کی

ٹیکنالوجی میسر نہیں تھی اسکے باوجود وہ لوگ اسرا اور معراج پر براق کی سواری پر ایمان لے آئے، انگلی کے ایک اشارے پر چاند کے حصوں میں بٹ جانے کو انہوں نے تسلیم کر لیا۔ لیکن موجودہ دور میں اس سب ٹیکنالوجی کے باوجود اور سائنس فکشن میں دکھائی جانی والی سپیس شپ اور ہائپر ڈرائیو کی قوت کے باوجود موجودہ دور کا انسان براق کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ اور قرب قیامت پر ظاہر ہونے والی اللہ کی نشانیوں پر سطحی تاویلات گھڑتا ہے۔

غظیم فلسفی ودانشور انکل ٹام

خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق

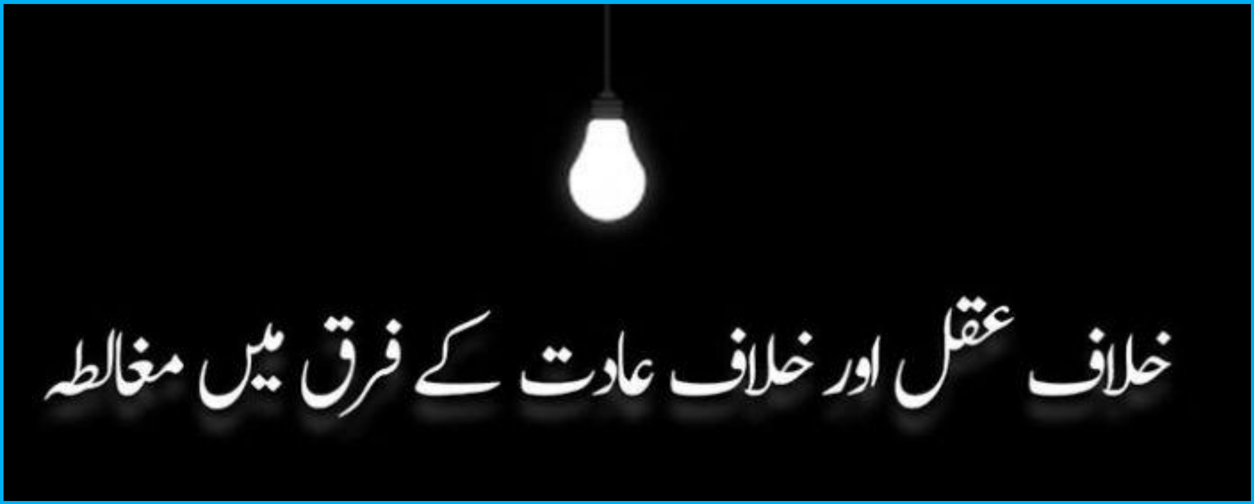

آجکل خلافِ عقل کا لفظ نئے تعلیم یافتہ اور سیکولر لبرل حضرات کی زبانوں پر ایسا چڑھا ہے کہ شریعت کی اکثر باتوں پر بے دھڑک یہ لفظ بول اُٹھتے ہیں۔ نہ اُن کی حقیقت اور مفہوم سمجھتے ہیں نہ اُس کا موقع استعمال۔

عام پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے وجود ملائکہ وجود جنات وغیرہ اور دہریہ مزاج لوگوں کے سامنے وجود باری تعالیٰ ، جنت ، جہنم وغیرہ کا جب تذکرہ آتا ہے تو فورًا یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ خلاف عقل باتیں ہیں۔

پچھلے زمانے میں تعلیم نہ تھی لوگ سیدھے اور بھولے تھے وہ لوگ اپنی کم علمی کو تسلیم کرتے تھے اور جیسا کوئی اہل علم کہے مان لیتے تھے۔ آجکل علم نہ ہونے کے باوجود بات کی کھال نکالی جاتی ہے دلیل کسے کہتے ہیں ،اور دلیل کی سمجھ نہ ہونے کے باوجود ہر بات کی دلیل مانگی جاتی ہے۔اب ایسی باتیں نہیں چل سکتی.

وضاحت سے پہلے دو لفظوں محال اور مستبعد میں فرق سمجھ لیں.

محال وہ ہے جس کے وجود کو عقل تسلیم نہ کرے یعنی انسان کو اسکا وجود غیر منطقی یا خلاف عقل لگے۔.

مستبعد وہ ہے جس کے وقوع کو عقل تسلیم کرے مگر اس کا وقوع کبھی دیکھا نہیں دیکھنے والوں نے اور بکثرت سُنا نہیں گیا، مطلب یہ خلاف عادت ہے.ان دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے. محال کبھی واقعہ نہیں ہو سکتا مستبعد واقع ہو سکتا ہے

ان لوگوں سے غلطی یہاں ہی ہوئی کہ یہ لوگ خلاف عادت کو خلافِ عقل کہہ رہے اور سمجھ بیٹھے ہیں.

وضاحت؛:-

خلاف عقل اسکو کہتے ہے جس کے وجود کے ناممکن ہونے پر دلیل عقلی موجود ہو،ایسی چیز کے اگر کوئی موجود ہونے کی کوئی خبر دے تو اس کو جھٹلایا جا سکتا ہو بلکہ جھٹلانا ضروری ہو۔ مثلاّ کوئی کہے کہ ہم نے فلاں مقام پر رات اور دن دونوں کو ایک وقت می جمع دیکھا ہے.اب چونکہ دو ضدوں (دو مخالف چیزوں) کا جمع ہونا عقلاّ ناممکن ہے اس وجہ سے اس کو فوڑا جھٹلا دیا جائے گا اور اس کو سچا سمجھنا غلطی ہو گی یا کوئی کہے کہ

'ایک ' برابر ہے' دو' کے تو چونکہ اس کے ناممکن ہونے پر دلیل عقلی موجود ہے اس لیے اسے بھی جھٹلا دی جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ خلاف عقل ہے.

خلاف عادت اس کو کہتے ہے کہ کوئی بات عجیب لگے لیکن کوئی دلیل عقلی ایسی موجود نہ ہو جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ ایسا ہونا ناممکن اور عقلی طور پر محال ہے. خلافِ عادت چیز دیکھنے یا سُننے سے شروع شروع میں تعجب اور حیرت ہوتی ہے لیکن بار بار دیکھنے اور سُننے سے وہ بھی داخلِ عادت ہو جاتی ہے پھر وہ تعجب جاتا رہتا ہے۔

مثلاً عادت یہ ہے کہ آدمی کا قد چھ سات فٹ کا ہوتا ہے۔ اگر کوئی خبر دے کہ اک آدمی سو فٹ کا بھی موجود تھا یا ہے تو بڑی حیرت اور تعجب ہوگا یہ فطری امر ہے لیکن کوئی صاحب عقل یہ نہیں کہے گا کہ یہ خبر غلط ہے یہ ناممکن ہے۔ اگر کوئی ایسا کہے کہ اتنا لمبا قد ہونا خلافِ عقل ہے تو اس سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ دلیل بیان کرو جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے. ایسی دلیل عقلی کبھی نہیں مل سکتی۔

اسی طرح اک شخص جس نے ہمیشہ گاڑی کو بزریعہ بیلوں گھوڑوں کے چلتے دیکھا ہو یہ کہنا کہ ریل ایک گاڑی ہے جو بلا بیلوں کے چلتی ہے

یا اسے کہا جائے کہ کچھ گاڑیاں (ہوائی جہاز) ہوا میں بھی اڑتی ہیں. اس کے لیے یہ تعجب اور حیرت کا باعث ضرور ہوگا لیکن وہ یہ نہیں کہے گا کہ یہ غلط اور خلاف عقل ہے کیونکہ کوئی عقلی دلیل ایسی اس کے پاس نہیں ہے جس سے ایسا ہونا محال ثابت ہو جائے۔ یہی حال تعلیم یافتہ اصحاب کی غلطی کا ہے کہ خلاف عادت کا نام خلاف عقل رکھا ہے اور ہر سمجھ اور تجربے میں نہ آنے بات پر خلاف عقل کا لفظ بول اُٹھتے ہیں۔

خدا اور کوئی کیوں نہیں ہو سکتا؟

کچھ ملحدین یہ آرگومنٹ کرتے ہیں کہ ہم کسی اور کو خدا کیوں نہیں کہہ سکتے ؟ معروف عظیم کدو(GREAT PUMPKIN)اور سپیگیٹی شیطان (SPAGHETTI MONSTER)کو خدا کیوں نہیں قرار دیا جاسکتا؟

تبصرہ:

خدا کا موجود ہونا ایک واضح سچائی ہے جسے اجماع کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے۔ واضح سچائیاں، مسلمہ حقیقتیں اور بنیادی عقیدے ثقافت کے پابند نہیں ہوتے ' فطری ہوتے ہیں اور کسی معلومات سے حاصل نہیں کیے گئے۔ جبکہ کوئی شیطان یا خود ساختہ خدا ان سے محروم ہوتا ہے۔

1۔ خدا ایک بین ثقافتی عقیدہ [A Cross Cultural Belief]

عظیم کدو اور سپیگیٹی شیطان پر یقین کا وسیع فطری رجحان نہیں پایا جاتا، مزید یہ ثقافتی طور پر پابند ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک سپیگیٹی شیطان پر ایمان رکھتا ہوں تو مجھے ایک ایسی ثقافت کو لانا ہو گا جہاں سپیگیٹی اور شیطانوں کو تعلیم دی جاتی ہو۔ تاہم خدا کا تصور پوری دنیا میں ایک فوق الفطرت اور ملکوتی خالق کا بین ثقافتی تصور ہے

2۔ایک فطری عقیدہ[[An Innate Belief

مسلمہ عقائد اور خود سے واضح سچائیوں کو معلومات کی منتقلی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مجھے یہ سمجھنے کے لیے کہ سپیگیٹی شیطان کیا ہے، معلومات کی ضرورت ہے جو مجھ تک منتقل کی جائیں۔ ہمارے بہت سے قارئین نے سپیگیٹی کا لفظ ہی پہلی دفعہ سنا ہو گا بجائے اسکے کہ اسکو خدا مان لیں۔ لیکن جہاں بات خدا کے وجود کی ہو جو کہ کائنات کا خالق ہے، آپ کو کسی معلومات کی منتقلی کی ضرورت نہیں خواہ وہ ثقافت ہو یا تعلیم۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین سماجیات اور بشریات کا یہ ماننا ہے کہ اگر ملحد بچے کسی ویران ریتلے جزیرے میں پھنس جائیں تو ان کو یہ یقین ہو جائے گا کسی نے اس ریتلے جزیرے کو تخلیق کیا ہے۔

یہ بہت نازک نقطہ ہے کیونکہ ہم بارہا سنتے ہیں" کہ خدا اور سپیگیٹی شیطان میں کوئی فرق نہیں ہے"۔ یہ سچ نہیں ہے۔ اگر آپ خود واضح سچائیوں، مسلمہ اور بنیادی عقائد کو سمجھتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ کسی بھی معلومات کی منتقلی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ خدا کے وجود کا بنیادی تصور معلومات کی منتقلی کا محتاج نہیں ہے۔ جبکہ کسی خود ساختہ خدا اور سپیگیٹی کے وجود کا خیال معلومات کی منتقلی کا محتاج ہے۔ اس لیے سپیگیٹی شیطان ایک خود واضح سچائی نہیں ہے۔

3۔ایک بنیادی عقیدہ[[A Foundational Belief

تیسرا نقطہ یہ کہ بنیادی اور مسلمہ عقائد ایک مربوط دنیا کے نقطہ نظر کے لیے ایک بنیاد فراہم کرتے ہیں اور لاینحل سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر خدا کا وجود، اس آگاہی کے ظہور کی تفصیل ہے کہ ہمیں

اس مادی دنیا کے اندر شعور حاصل ہے۔ یہ ان سوالات کے جواب دیتا ہے جن کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ یہ اخلاقی سچائیوں کے مقصد کے وجود کی وضاحت کرتا ہے اور ایک بنیاد فراہم کرتا ہے کہ انسان اور کائنات کا مقصد کیا ہے؟ خدا کے وجود، ایک مربوط دنیا کی توجیہہ کے لئے ایک بنیاد فراہم کرتا ہے، اہم بنیادی سوالات کا جواب ہے۔ سپیگٹی شیطان یا عظیم کدو پر اعتقاد کسی علم اور اخلاق کی تعلیم کا سبب بننے سے محروم ہیں.

اعتراض: زمین ہموار ہے یہ بھی ایک خود سے واضح سچائی تھی، یہ ایک بنیادی عقیدہ تھا۔ جیسے جیسے سائنس نے ترقی کر چکی ہے، ہمیں پتہ چلا کہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ اب ہم یہ جانتے ہیں کہ دنیا گول ہے۔!

تبصرہ: یہ استدلال خدا کے وجود پر لاگو نہیں ہوتا۔ خدا کی تعریف ایک غیر مشاہداتی ہستی ہے جو اس کائنات سے باہر ہے۔ مثال کے طور پر، اگر میں ایک کرسی بناتا ہوں تو یقینی طور پر میں کرسی سے منفرد اور جدا رہوں گا۔ میں کرسی سے الگ ہوں۔ اسی طرح خالق بھی اس کائنات سے منفرد اور بیرونی ہے۔ اسی لیے خالق کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا اس نقطہ نظر سے یہ اعتراض لاگو نہیں ہوتا: یہ صرف ان چیزوں پر لاگو ہوتا ہے جن کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہو۔

سائنس علم کے ایک اصول پر مبنی ہے جس کو تجربیت کہتے ہیں۔ آپ کو تجربیت کا علم بلواسطہ یا بلا واسطہ مشاہدے پر مبنی تجربات سے حاصل ہو سکتا ہے۔ تجرباتی طور پر خدا کو مسترد کرنا ناممکن ہے کیونکہ مشاہدات سے نتائج تک اسے ثبوت کی ضرورت ہے۔ کسی ایسی چیز کا انکار کرنا جس کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا یا علم کے

ایک اصول کو استعمال کرتے ہوئے جو صرف مشاہدات پر مبنی ہو، نتیجہ نکال لینا مضحکہ خیز ہے۔ سائنسی دنیا خدا کے وجود سے کبھی انکار نہیں کر سکتی کیونکہ سائنس صرف ایسی چیزوں سے معاملہ کرتی ہے جن کا آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کے فلسفی ایلیٹ سوبر نے اپنے مضمون تجربیت میں اس بات پر زور دیا کہ سائنس ان سوالات کی پابند ہے جن کا جواب مشاہدات ہی دے سکتے ہیں۔ ''ہر صورت میں سائنسدان ان مشاہدات پر محدود ہیں جو ان کے ہاتھ میں ہیں۔ حدود یہ ہیں کہ سائنس اپنی توجہ صرف ان مسائل پر رکھنے پر مجبور ہے جو مشاہدات سے حل ہوتے ہیں۔'' جب خدا کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ایک مشاہداتی دنیا کا استعمال کرتے ہوئے اسکا انکار کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں جو عمومی رد عمل یہ ہے کہ 'اگر اس کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا، تو پھر اس پر اعتقاد بھی نہیں کیا جا سکتا'۔ یہ ایک غلط دعوی ہے کیونکہ مشاہدے تمام مظاہر کا احاطہ نہیں کرتے۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا کہ ہم مشاہدہ نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی اُن پر یقین رکھتے ہیں۔ فلسفی جان کوٹنگھم نے اپنی کتاب عقلیت میں اس مسئلہ کو اجاگر کیا ہے: ''ایک اضافی اور شاید اس سے بھی زیادہ پریشان کن مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم سائنس کی اعلی سطح تک پہنچتے ہیں تو ہم ڈھانچے اور اداروں کے کسی بھی براہ راست معنوں میں مشاہدہ کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ ایٹمز، مالیکیولز، الیکٹرانز، فوٹانز اور ان جیسے بہت سے اور انتہائی پیچیدہ نظریاتی تشکیل ہیں۔ یہاں ہمیں لگ رہا ہے کہ ہم بہت دور براہ راست 'تجربیت و مشاہدے' کی دنیا سے ہٹا دیے گئے ہوں''۔

چنانچہ وقت کیساتھ کسی مشاہداتی سچائی کے بدل جانے سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی ابدی اور غیر مشاہداتی سچائی بھی بدل جائے گی۔

اعتراض: خدا کا عقیدہ کیسے واضح سچائی ہے جبکہ دنیا میں لاکھوں ملحدین موجود ہیں؟

1۔ خود سے واضح سچائیوں کا ہر صورت عالمگیری ہونا ضروری نہیں ہوتا:

ان کو انفرادی طور پر بھی رکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنی والدہ کو لیجیے؛ آپ کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ وہ عورت جس نے آپ کو جنم دیا وہ آپ کی ماں ہے۔ اس کے لیے آپ کو گھر میں ڈی۔این۔اے۔ ٹیسٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور آپ اس حقیقت کو قبول کرتے ہیں کہ وہ آپ کی ماں ہے کیونکہ یہ ایک خود واضح سچائی ہے۔ جبکہ کسی اور کے لیے یہی عورت جس کو آپ ماں بلاتے ہیں وہ چچی، سوتیلی ماں یا گود لینے والی عورت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بنیادی عقائد اور خود واضح سچائی کا عالمگیری ہونا ضروری نہیں۔ یہ انفرادی طور پر بھی ہو سکتے ہیں۔

2۔ خدا پر ایمان عالمگیری ہے

دنیا میں ملحدوں کی ایک کثیر تعداد کے باوجود، خدا پر ایمان عالمگیری ہے۔ ایک عالمگیری عقیدے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سیارے پر موجود ہر شخص اس عقیدے پر ایمان لائے۔ خدا کے وجود پر بین ثقافتی اجماع یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ خدا عالمگیری ہے۔ دنیا میں ملحدوں کے مقابلے میں توحید پرست زیادہ

ہیں۔اور تاریخ کی ابتدا سے یہی معاملہ رہا ہے۔ ملحدین کو جواب میں یہ وضاحت کرنا ہوگی کہ خدا خود واضح سچائی نہیں ہے۔ان کو یہ وضاحت دینا ہوگی کہ خدا ابتدائی اعتقاد نہیں ہے بلکہ ثقافتی طور پر پابند ہے اور صرف معلومات کی منتقلی سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

استفادہ و ترجمہ تحریر حمزہ اینڈر ئیس:

خدا ایک سے زائد کیوں نہیں ہو سکتے

'توحید' کے عقلی دلائل—سورۃ الفاتحہ کی روشنی میں

۱۔ دلیلِ کبریائی:

اگر خدا ایک سے زائد ہیں تو لازماً یہ سوال پیدا ہو گا کہ وہ طاقت و قوت، اقتدار تصرف اور تدبیر و انتظام کے لحاظ سے چھوٹے بڑے ہیں یا سب کا درجہ برابر ہے؟ اگر وہ چھوٹے بڑے ہیں تو خالق کائنات کے لئے چھوٹا ہونا عیب ہے، کمال نہیں اور عقل سلیم کا کسی دلیل کا تقاضا کئے بغیر بدیہی فیصلہ یہ ہے کہ خدا کو ہر عیب سے پاک ہونا چاہئے اور ہر کمال کا اسے مالک ہونا چاہئے۔ اگر ایک سے زائد یہ مفروضہ خدا درجے میں برابر ہیں تو برابری بھی عیب ہے، کیوں کہ اس صورت میں ایک خدا دوسرے کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ دوسرے کو مغلوب نہ کر سکنا عاجزی اور بے بسی ہے، کمال نہیں۔ بالفرض ان مفروضہ خداؤں میں باہم تصادم نہ بھی ہو تو بھی یہی سمجھا جائے گا کہ انہوں نے ایک دوسرے کو مجبوراً برداشت کر کے ایک دوسرے پر غالب نہ آسکنے کی اپنی کمزوری کو چھپا لیا ہے۔ عیب چھپا لیا جائے یا چھپا رہے تو بھی بہ رحال عیب ہی رہے گا، کمال میں نہیں بدل جائے گا۔ پس خدا ایک ہے جس کی شان یہ ہے الحمدللہ رب العالمین کہ اللہ ہی تمام کمالات اور تعریفوں کا مالک ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

۲۔ دلیل حفظِ اسرار:

حفظِ اسرار سے مراد رازوں اور بھیدوں کی حفاظت ہے کہ دوسرے ان پر مطلع نہ ہوں۔ اگر خدا ایک سے زائد ہیں تو وہ اپنے اسرار اور بھیدوں کو ایک دوسرے سے مخفی رکھ سکتے ہوں گے یا نہیں۔ اگر مخفی رکھ سکتے ہیں تو جن مفروضہ خداؤں سے یہ اسرار مخفی رہے وہ جاہل ہوئے۔ جہل اور لاعلمی خدا کے لئے عیب ہے لہٰذا یہ خدائی سے نکل گئے اور اگر مخفی نہیں رکھ سکتے تو مخفی نہ رکھ سکنے والے مفروضہ خدا عاجز و بے بس ہوئے۔ عاجزی اور بے بسی بھی خدا کے لئے عیب ہے۔ پس خدا ایک ہی جو تمام کمالات کا مالک ہے اور جس

کی شان یہ ہے ولا یحیطون بشئی من علمہ الا بما شاء (البقرہ ۲۵۵) ''اور وہ (لوگ) اس کے علم میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر یہ کہ وہ جو (خود بتانا) چاہے''۔

۳۔ دلیل تدبیر وانتظام:

اگر خدا ایک سے زائد ہیں تو کائنات کا نظم ونسق چلانے اور سنبھالنے میں ایک دوسرے کے محتاج ہوں گے یا نہیں۔ اگر محتاج ہیں تو ان میں سے کوئی بھی خدا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ محتاج ہونا خالق کے لئے عیب ہے۔ اگر وہ ایک دوسرے کے محتاج نہیں بل کہ سب اپنی اپنی جگہ پر مختار ہیں تو ایک کے سوا باقی خداؤں کا وجود سرے سے فالتو اور غیر ضروری ہوگا، جس کی مخلوق کو ضرورت نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ خدا بے نیاز اور باقی سب اس کے محتاج ہیں عقل سلیم کے اس فطری فیصلے کے عین مطابق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یایھا الناس انتم الفقرآء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید (فاطر ۱۵) ''اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی بے پرواہ (اور) تعریف کے لائق ہے۔'' نیز مختارِ کل عقلاً ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اگر مفروضہ متعدد خدا اپنی اپنی جگہ پر مختارِ کل ہیں تو اگر وہ ایک دوسرے کے برابر ہیں، تو برابری عیب ہے، مختارِ کل اگر عیب کا ازالہ نہ کر سکے تو وہ عاجز ہوا۔ عاجزی اور اختیارِ کلی ایک دوسرے کے منافی ہیں اگر یہ مفروضہ مختارانِ کل (خدا) بڑے چھوٹے ہیں تو چھوٹا ہونا بھی عیب ہے، جو مختارِ کل ہوگا وہ ابتدا ہی سے عیب کو اپنے سے دور رکھے گا ورنہ وہ عاجز و بے بس سمجھا جائے گا، عاجزی و بے بسی خدا کے لئے عیب ہے، کمال نہیں حال آں کہ الحمد للہ رب العالمین، اللہ تمام کمالات کا مالک ہے، جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

۴۔ دلیل وصفِ امتیازی:

اگر خدا ایک سے زائد ہیں، مثلاً الف، ب اور ج تین خدا ہیں تو ان سب میں کم از کم ایک امتیازی وصف ایسا ضرور ہو گا جس سے وہ ایک دوسرے سے ممتاز ہو سکیں اور مخلوق کے لئے ان کی شناخت ممکن ہو۔ اب اگر یہ امتیازی وصف کمال والا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان تینوں میں کم از کم ایک وصفِ کمال کی کمی ہے حال آں کہ خدا کو تو تمام کمالات کا مالک ہونا چاہئے اور اگر یہ امتیازی وصف نقص والا ہے، مثلاً ایک نابینا، دوسرا بہرہ، اور تیسرا گونگا ہے تو اس صورت میں بھی تینوں میں سے کوئی بھی خدا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ خدا کو ہر نقص سے پاک ہونا چاہئے، پس خدا ایک ہی ہے جو تمام کمالات کا مالک ہے الحمد للہ رب العالمین، تمام کمالات اللہ ہی کے لئے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

۵۔ بُرہانِ تمانع:

اگر خدا ایک سے زائد ہیں تو وہ ایک دوسرے کے کام میں مداخلت کر سکتے ہوں گے یا نہیں۔ اگر ایک خدا دوسرے (مفروضہ) خدا کے کام میں مداخلت کرے اور دوسرا اسے روک نہ سکے تو دوسرا خدا عاجز ہوا۔ اگر پہلا (مفروضہ) خدا دوسرے کے کام میں دخل دینے کی سکت ہی نہ رکھتا ہو تو پہلا خدا عاجز ہوا، حال آں کہ خدا کو ہر عیب سے پاک ہونا چاہئے۔ قبل ازیں دلیل کبریائی میں یہ مذکور ہو چکا ہے کہ اگر برابر مدارج اور مراتب کے مفروضہ خداؤں میں تصادم نہ بھی ہو تو بھی برابر درجے والے یہ خدا در اصل خدا ہیں ہی نہیں۔ لیکن یہ تصادم اور ٹکراؤ ناگزیر ہے کیوں کہ خدا کو تمام صفات و کمالات کا مالک ہونے کی حیثیت سے تکبّر (بڑائی) (جتانے) کا حق بھی ہو گا چناں چہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ''متکبّر'' بھی شامل ہے۔ ایک سے زائد ایک ہی مرتبے کے متعدد متکبر موجود ہوں تو ان میں تصادم کا نہ ہونا عقلاً محال ہے، چناں چہ اس تصادم کے نتیجے میں کائنات سرے سے وجود پذیر ہی نہ ہو گی، مثلاً ایک خدا زید کو پیدا کرنا چاہے اور دوسرا

پیدا نہ کرنا چاہے تو برابر کے ان خداؤں کے ارادے تو جمع ہو سکتے ہیں لیکن ان کی مرادیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر دونوں زید کو زندہ کرنا یا دونوں مارنا چاہیں اور دونوں اس کے لئے ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہوں تو ان میں سے کوئی بھی خدا نہ ہو گا اور اگر محتاج نہ ہوں تو ان میں سے ایک کی ضرورت ہی نہیں جو غیر ضروری ہو گا اسے مخلوق کی اور مخلوق کو اس کی ضرورت نہ ہو گی حال آں کہ خدا تو وہ ہو سکتا ہے کہ سب مخلوق اس کی محتاج ہو اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو پس خدا ایک ہی جس کی شان یہ ہے الحمد للہ رب العالمین، کہ تمام کمالات اللہ ہی کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

۶۔آفاقی دلیل:

چونکہ مشاہداتی دلائل کا سمجھنا لوگوں کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے اس لئے کلمات ''رب العالمین'' میں ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ رب کا معنی ہے ہر چیز کو بتدریج نشوونما دے کر اسے درجۂ کمال تک پہنچانے والا۔ کائنات اس قدر وسیع و عریض ہے کہ اس کے تصور ہی سے سر چکرانے لگتا ہے۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ اس حساب سے ایک منٹ، پھر ایک گھنٹے، پھر ایک دن اور بعد ازاں ایک سال کی مدت میں روشنی کی رفتار کا اندازہ لگانا کس قدر تعجب خیز ہے! اس کائنات کی وسعت کی پیمائش نوری سالوں میں بھی آسان نہیں۔ سورج اور اس کے گرد گھومنے والے سیارے ایک نظام شمسی کو تشکیل دیتے ہیں۔ کئی نظام ہائے شمسی ملیں تو ایک کہکشاں (Galaxy) بنتی ہے۔ کئی کہکشاؤں سے جھرمٹ وجود پذیر ہوتا ہے یہ کائنات بے شمار جھرمٹوں کا مجموعہ ہے۔ ہمارا نظام شمسی جس جھرمٹ سے وابستہ ہے وہ بہت چھوٹا ہے اور اس میں کل چودہ کہکشائیں ہیں۔ کائنات کی اس وسعت کو سورہ فاتحہ میں دو لفظوں ''رب العالمین'' میں سمیٹ دیا گیا ہے کہ تم اس کائنات کو ایک جہاں نہ سمجھو بل کہ یہ تو کئی جہانوں

کا مجموعہ ہے۔ جمع میں افراد کا محدود و متعین ہونا ضروری نہیں لہٰذا کائنات کے خارجی مظاہر کا پورا احاطہ عقل کے بس میں نہیں، اور نہیں تو صرف زمین ہی کو لیجئے اس میں موجود موالیدِ ثلٰثہ (حیوانات، نباتات اور جمادات) اور زمین کے اندر چھپی اشیا کا احاطہ کر لینا اور انہیں ہر حیثیت سے پوری طرح سمجھ پانا ہمارے بس میں نہیں۔ جب مخلوقات کا یہ حال ہے تو خالق کی عظمت کا کیا کہنا! سارے جہانوں کو بہ تدریج نشو و نما دینا اور ان کی تمام ضروریات کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہے۔ انسانی مشاہدہ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ اس ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں وہی رب العالمین ہے۔

اللہ کی پیدا کی ہوئی اس کائنات اور اس میں موجود جان دار اور بے جان اشیا پر اللہ تعالیٰ کا جو نظام ربوبیت جاری ہے اس کا احاطہ کرنا تو دور کی بات ہے، انسان صرف ایک لقمے پر ہی غور کرے جو وہ اپنے منہ میں ڈالتا ہے تو اس کے پیچھے لاتعداد اسباب و مُسبّبات کا سلسلہ کار فرما نظر آئے گا۔ اس وسیع اور محیر العقول نظام ربوبیت کو دو لفظوں "رب العالمین" میں سمیٹ کر واضح کر دیا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ ہی رب العالمین ہے تو اس کی ذات و صفات میں شرک کی کوئی گنجائش نہیں۔ سورہ فاتحہ کے بعد باقی سارا قرآن اس ہی سورت کی توضیح و تشریح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت پر دلالت کرنے والے آفاقی مظاہرِ فطرت کی طرف قرآن کریم میں بارہا توجہ دلائی گئی ہے، مثلاً سورہ بقرہ میں ہے کہ بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور کشتیوں کے لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں (سامان تجارت وغیرہ) کو لئے ہوئے سمندروں میں چلنے میں اور جو اللہ نے آسمان سے (بارش کا) پانی اتارا ہے اس کے ذریعے مردہ (بنجر) زمین کو زندہ (تروتازہ اور شاداب) کر دینے میں اور آسمان اور زمین کے درمیان مسخر بادل میں عقل مندوں کے لئے (اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کی) نشانیاں موجود ہیں۔ (البقرہ ۱۶۴) ان مظاہر فطرت

پر غور کیجئے کہ اگر خدا ایک سے زائد ہیں اور یہ فرض کر لیا جائے کہ کائنات کی تخلیق کے موقع پر ان میں کوئی تصادم نہیں ہوا تھا تو یقیناً ہر ایک کی مخلوق الگ الگ ہو گی اور خدا چوں کہ متکبر بھی ہیں لہٰذا زود یا بدیر ان میں تصادم نا گزیر ہے، چناں چہ اس کو (مثلاً) سورۂ مومنون میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے لئے کوئی اولاد اختیار نہیں کی اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ورنہ ہر معبود (خدا) اپنی اپنی مخلوق کو الگ الگ لئے پھرتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔ یہ (مشرکین اللہ کے متعلق) جو کچھ بتاتے ہیں وہ اس سے پاک ہے (المومنون ۹۱) اور مثلاً سورۂ انبیاء میں ہے کہ اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود بھی ہوتے تو یہ دونوں (آسمان وزمین) درہم برہم ہو جاتے پس اللہ عرش کا رب ہر اس چیز (عیب اور نقص) سے پاک ہے جو یہ (مشرکین اس کے متعلق) بیان کر رہے ہیں۔ (اس کی خود مختاری کا تو یہ حال ہے کہ) وہ اپنے کاموں کے لئے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں ہے اور وہ (سب کے سب اس کے آگے) جواب دہ ہیں۔ (الانبیاء ۲۳)

اب دیکھئے کائنات ایک خارجی حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ یہ خارجی کائنات ایک ہی ہے اور اس کے تکوینی قوانین باہم مربوط ہیں۔ کائنات اضداد کے باوجود رواں دواں ہے اور اس کے انتظام میں کوئی خلل نہیں، مثلاً اجرام فلکی ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں لیکن اس کشش میں ایسا توازن ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے بھی ہیں یعنی ان میں قوتِ جذب بھی ہے اور قوت طرد بھی ہے۔ ان دونوں متضاد قوتوں میں ایسا توازن ہے کہ یہ نہ تو آپس میں ٹکراتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے سے دور جا نکلتے ہیں۔ اس وسیع کائنات میں حسن ہے۔ قوانین فطرت لگے بندھے ہیں جس کی وجہ سے کائنات میں نظم و ترتیب ہے۔ اگر برابر کے اختیارات والے کئی منتظم ہوں تو لازماً بد نظمی اور بد ترتیبی پیدا ہو گی اس لئے اگر خدا ایک سے زائد ہوتے اور

بالفرض تخلیق کائنات کے موقع پر ان میں اختلاف نہ بھی پیدا ہوا ہوتا تو بھی بعد کے مراحل میں کائنات کا حسن اور باہم مربوط ہونا تو ایک طرف رہا یہ تباہ اور خستہ حال ہوتی۔ قوانین فطرت میں نہ باہم موافقت ہوتی اور نہ ہی یہ قوانین ایک ہی بالائی قوت کے سامنے مسخر نظر آتے۔ سورۂ ملک میں ہے کہ تو رحمن (اللہ تعالیٰ) کی تخلیق میں کوئی بے ضابطگی نہیں پائے گا تو دوبارہ نظر ڈال کر دیکھ لے کیا تجھے کوئی شگاف نظر آرہا ہے؟ پھر دہرا کر دو دو بار نظر ڈالے، تیری آنکھ تیری طرف ذلیل (عاجز) ہو کر تھکی ہوئی لوٹ آئے گی (الملک ۳۔۴) اور مثلاً سورۂ یٰس میں ہے کہ سورج کے لئے یہ روا نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے اور یہ سب (اجرام سماوی) فلک میں تیر رہے ہیں۔ (یسین ۴۰) پس یہ مشاہداتی اور آفاقی دلائل بھی ثابت کر رہے ہیں کہ اللہ ایک ہی ہے۔

کس مذہب کا خدا مانیں؟

وجود باری تعالی پر بحث کے دوران وہ لمحہ آتا ہے جب ملحد یہ سوال کرتا ہے: ''اچھا چلو ہم خدا کو مان لیتے ہیں، اب بتاؤ کونسے خدا کو مانیں، مسلمانوں کے، عیسائیوں کے یا پھر ھندووں کے؟ ان میں سے ہر کوئی اپنے مذہب کو سچ کہتا ہے''ان کا یہ سوال ''کیوں'' کے بعد ہے، یعنی اگر انہیں اس پر راضی کر لیا جائے کہ خدا کو ماننا لازم ہے تب وہ یہ سوال کھڑا کرتے ہیں۔ان کا اس سوال کو کھڑا کرنے کا مقصد دراصل یہ ہوتا ہے کہ چلو اگر خدا کو ماننا لازم ہے تو وہ کونسا خدا ہے جسے مانیں، اور انکی امید یہ ہوتی ہے کہ اب یہ مذھبی لوگ آپس میں ایک دوسرے کا رد کر کے خود ہی کیوں کو مشکوک بنادیں گے۔

اس سوال کو دیکھنے کے متعدد زاویے ہو سکتے ہیں، ایک الزامی اور دوسرا اصولی۔ الزامی (یعنی ''منہ بند کراؤ'') پہلو سے گفتگو کرنا یہاں مقصود نہیں، فی الوقت دوسرے پہلو پر کچھ کہنا ہے۔

اس سلسلے میں پہلے اس سوال کا جواب دینا ہوتا ہے کہ اتنے خدا کیسے وجود میں آ گئے۔ مختصر جواب یہ ہے کہ خدا نے اپنی طرف بلانے کے لیے الگ الگ زمانوں میں انبیاء و رسل بھیجے۔ان انبیاء و رسل کی تعلیمات و تصور خدا امتداد زمانہ سے آلودہ ہوتا گیا، پھر اس بگاڑ کو دور کرنے کے لیے نئے نبی اور رسول بھیجے جاتے رہے، محمد ﷺ اسی سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ چنانچہ خدا ایک ہی ہے مسئلہ وقت کیساتھ تصور خدا میں در آنے والے بگاڑ اور تحریف و تبدل کا ہے۔اس کو جانچنے کا ایک طریقہ تو ہے کہ ہر مذہب کی تعلیمات کی سچائی و سند کو پرکھا جائے کہ کونسی اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔اس کے لیے وقت وذوق تحقیق چاہیے، دوسرا طریقہ آسان ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے یہ دیکھیں کہ خدا کے بغیر کائنات اور انسان کے مختلف پہلوؤں کی توجیہہ کیوں نہیں ہو سکتی۔؟ جب یہ واضح ہو جائے تو یقیناً خدا کو ان صفات کیساتھ ہی ماننا پڑے گا جو ان توجیہات کا جواب دیتی ہوں۔ مثلا خالق، مثلا رحمن، مثلا رحیم، الاحد، الواحد، اسی طرح البدیع، الفاطر،

الرب، المصور، الباری، الروف وغیرہ وغیرہ۔ ورنہ ہم ان صفات کی ضرورت کو کائنات اور انسان میں سے بتا کر معترض سے پوچھیں گے کہ اس فعل کا فاعل کون ہے؟

چنانچہ جب وجہ مان لی کہ خدا کا ماننا اس وجہ سے لازم ہے تو خدا کی صفات اس وجہ کے بعد خود سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً خدا کو ماننا اس لیے لازم ہے کہ مجھے ہر دم اس کی ضرورت ہے۔ تو اب ایسا خدا جو ایک مخلوق کی طرح ہی ہو، میری نہ سنے، یا سننے کے بعد میری مدد پر قادر نہ ہو، میری ضرورت کیسے پورا کرے گا؟ اس طرح اس مذہب کا تصور خدا درست ہو گا جو توحید پر قائم ہے کیونکہ کائنات کی ساخت بتاتی ہے کہ یہ سب ایک ہی منصوبے کا حصہ ہے. اس کی ایک ہی ماخذ سے تدبیر ہو رہی ہے۔ وہ جو الحکیم والعلیم ہے کائنات کی مسلسل نگرانی اور تدبیر کر رہا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کائنات ہر لمحہ وقوع ہو رہی ہے. جو میتھمیٹکس کی انتہا پر قائم ہے، کیونکہ ہمارے آس پاس ہر چیز نہایت نپے تلے پیمانے پر ہو رہی ہے.... مختصراً کائنات کی جس جس آیت/نشانی سے متاثر ہو کر خدا کے وجود کا اقرار کیا جاتا ہے ان تمام صفات کے حامل خدا کا تصور جو نسا مذہب پیش کرتا ہے اسکو مانا جائے گا۔ یہ تصور دین اسلام ہی میں خالص حالت میں موجود ہے۔ یہ خدا کے وجود کے اقرار کے بعد تصور خدا کی درستگی کو جانچنے کا ایک عقلی نقطہ ہے۔

خدا کی واحدانیت [Divine Singularity] – وحی کی مناسبت سے بحث

خدا کی وحدانیت کا ثبوت فراہم کرنے کا ایک سادہ سا طریقہ تو یہ ہے کہ وحی (الہامی کتب) کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس آرگومنٹ کی بنیاد یہ ہے کہ اگر خدا نے خود کو انسانیت سے متعارف کروایا ہے، اور وحی کے

متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ خدا کی طرف سے آئی ہے تو جو بھی وہ اپنے بارے میں کہتا ہے وہ بھی درست ہو گا۔ تاہم، ایک باریک بین اس دلیل میں استعمال شدہ کچھ مفروضات پر سوال اُٹھا سکتا ہے۔ ان مفروضات میں خدا کا خود کو انسانیت سے متعارف کروانا اور اور وحی کا کتاب کی صورت میں ہونا شامل ہے۔

آیئے پہلے آخری مفروضے کا سامنا کرتے ہیں۔ اگر خدا نے خود کو انسانیت سے متعارف کروایا ہے تو اس کی جانچنے کے دو طریقے ہیں: اندرونی اور بیرونی۔ اندرونی سے میری مراد یہ ہے کہ آپ خدا کو صرف اپنے دل کی آواز سے اور اپنی ذات کے ادراک سے پہچان سکتے ہیں، اور بیرونی سے میری مراد یہ ہے کہ آپ خدا کو اپنی ذات کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے ہونے والے رابطے سے بھی پہچان سکتے ہیں، بہ الفاظ دیگر حقیقی دنیا میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ خدا کو اندرونی ذرائع سے تلاش کرنا درج ذیل وجوہات کی وجہ سے معقول نہیں:

1۔ ہر انسان مختلف ہے؛ ماہرین نفسیات اس چیز کو انفرادی فرق بھی کہتے ہیں۔ ان میں ڈی این اے، تجربات، معاشرتی پس منظر، ذہنی اور جذباتی اہلیت، جنسی فرق، اور دوسرے کئی محرکات شامل ہیں۔ یہ فرق ہمارے دل کی آواز اور ذات کے ادراک کی اہلیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لیے سوچنے کے عمل کے نتائج مختلف نکلتے ہیں۔ اگر ان تمام عوامل کو صرف اور صرف خدا کی تلاش میں استعمال کیا جاتا، تو نتیجتاً خدا کے حوالے سے ہمارے تصور میں اختلافات ابھر سکتے ہیں۔ یہ تاریخی نقطہ نظر سے بھی درست ہے۔ 6000 سال پہلے قبل مسیح کی قدیم دنیا سے آج تک، خدا کے تقریباً 3700 مختلف تصورات اور نام ہیں۔

2۔ تو جب خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے عام فہم طریقہ استعمال کیا گیا ہے، یا جسے فلسفی عقلمندانہ سوچ کہتے ہیں یا جسے مسلمان علماء دل کی آواز کہتے ہیں، تو ایسے میں اُس کی ذات کی تصدیق کی بجائے اگر یہ تلاش کیا جائے کہ خدا کون ہے تو یہ غلط ہو گا۔ دلائل کی بنیاد پر کسی چیز کو ثابت کرنے کی ہماری صلاحیت محدود ہے۔ مجرد سوچ اور ماہیاتی دنیا پر سوچ بچار ہمیں اس نیتجے پر لے جاتی ہے کہ کوئی ہے جس نے یہ سب تخلیق کیا، اور وہ طاقتور ہے، اور علم رکھتا ہے وغیرہ۔ ان نتائج سے آگے سوچنا قیاس آرائی کے مترادف ہو گا۔ قرآن بجا طور پر پوچھتا ہے، کیا تم خدا کے بارے میں وہ کہتے ہو جو تم نہیں جانتے؟[قرآن: باب 7، آیت 28] ذاتی تجزیے اور اپنی ذات کے ادراک سے خدا کو تلاش کرنا ایسا ہے جیسے کوئی چوہا کسی کہکشاں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس لیے انسان یہ نہیں سمجھ سکتا کہ خدا کیا ہے۔ خدا ایسا بیرونی وحی کی صورت میں بتا سکتا ہے۔

مندرجہ ذیل مثال پر غور کریں۔ آپ کا یہ علم کہ خدا کا وجود ہے ایسا ہے جیسے دروازے پر دی گئی دستک؛ آپ بجا طور پر یہ فرض کر سکتے ہیں کہ دروازے کی دوسری طرف کوئی موجود ہے، لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ کون؟ کسی کی آمد متوقع نہیں تھی، اس لیے یہ جاننے کا واحد ذریعہ کہ دروازے کی دوسری طرف کون ہے صرف یہ ہے کہ وہ شخص آپ کو خود بتائے جو دوسری طرف موجود ہے۔ اس لیے آپ اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اگر خدا نے کچھ کہا ہے یا کسی بات کا اعلان کیا ہے، تو یہ انسان کو بیرونی ذریعے سے ہی پتا چلے گا۔ اس کے علاوہ کچھ بھی قیاس آرائی کے زمرے میں آئے گا۔

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق یہ بیرونی رابطہ قرآن ہے، کیونکہ یہ وہ واحد تحریری دستاویز ہے جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ یہ خدا کی طرف سے آئی ہے اور الہامی دستاویز کے معیار پر پورا اترتی ہے۔ اس معیار میں شامل ہے:

1۔اسے دلیل اور دل کی آواز کے ساتھ مطابقت ہونی چاہیے۔مثال کے طور پر، اگر ایک کتاب کہتی ہے کہ خدا ایک ہاتھی ہے جس کی 40 ٹانگیں ہیں، تو آپ بجا طور پر یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نہیں بھیجی گئی، کیونکہ خدا کا تصور ہی یہی ہے کہ وہ اس دنیا سے ماوراہے اور خود مختار ہے۔ایک ہاتھی، قطع نظر اپنی ہئیت کے ایک مجبور ذات ہے۔ایسا اس وجہ سے ہے کہ اس کی محدود جسمانی خصوصیات ہیں، جیسا کہ جسامت، شکل اور رنگ۔ہر چیز جس کی محدود جسمانی خصوصیات ہوں مجبور ہوتی ہے کیونکہ ایسی بیرونی وجوہات ہوتی ہیں جو اس کی حدود بناتی ہیں۔ خدا اجسامی نہیں ہے اور خود مختار ہے۔اس لیے، کوئی بھی چیز جس کی محدود جسمانی خصوصیات ہوں خدا نہیں ہو سکتی۔

2۔اسے اندرونی اور بیرونی طور پر یکسا ہونا چاہیے۔بہ الفاظ دیگر، صفحہ نمبر 20 پر یہ کہا گیا ہے کہ خدا ایک ہے اور پھر صفحہ نمبر 340 پر کہا گیا ہے کہ خدا تین ہیں، یہ ایک اندرونی، ناقابل اصلاح تضاد ہے۔مزید برآں، اگر ایک کتاب کہتی ہے کہ یہ دنیا صرف 6000 سال پرانی ہے تو یہ ایک بیرونی تضاد ہو گا کیونکہ ہم یہ بات حقیقت کے طور پر جانتے ہیں کہ دنیا اس سے کہیں پرانی ہے۔

3۔اسے انسانی اور عقلی نقطہ نظر سے ماورا ہونا چاہیے۔وحی میں یہ اشارہ ہونا چاہیے کہ کہ یہ ربانی ہے اور یہ قدرتی طور پر تسلی بخش انداز میں بیان نہیں کی جاسکتی۔سادہ الفاظ میں، اس میں یہ ثبوت ہونا چاہیے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔

قرآن میں یہ ثبوت موجود ہیں کہ یہ ایک ربانی دستاویز ہے۔ قوانینِ فطرت کے مطابق اس کی وضاحت نہیں کی جاسکتی؛ اس لیے مافوق الفطرت وضاحتیں ہی بہترین وضاحتیں ہیں۔ ایسے کچھ ثبوتوں میں شامل ہیں:

1۔ قرآن کی لغاتی اور ادبی طور پر نقل ممکن نہیں؛

2۔ قرآن میں بیان کردی کچھ تاریخی واقعات بہ وقتِ وحی انسانی علم کی دسترس میں نہیں تھے؛

3۔ اسکی منفرد ترتیب اور تدوین۔

خلاصہ یہ کہ چونکہ خدا کو جاننے کا واحد ذریعہ بیرونی ہے اور وہ وحی ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ وحی اصلی حالت میں صرف قرآن کی شکل میں ہی موجود ہے۔ قرآن خدا کی صفات و وحدانیت کے بارے میں واضح انداز میں بات کرتا ہے۔ دنیا کے عام مذاہب نے غالباً غیر ضروری سمجھ کر ان سوالات کو نہیں چھیڑا یا چھیڑا بھی تو اس کے مختلف پہلوؤں کو اتنا روشن نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مختلف زمانوں میں بجائے وحی و نبوت کے عقل وحواس ہی کی اس روشنی میں ان سوالات کو حل کرنا چاہا جو ہمیشہ "عالمِ غیب" میں جاکر گل ہو جاتی ہے، نظیروں اور مثالوں کی غلط رہنمائی نے مختلف غلطیوں کے خندقوں میں لوگوں کو گرادیا، مگر قرآن مجید جو غیبی حقائق کی تشریح کی آخری روشنی ہے، اس نے وضاحت کے ساتھ ان سوالات کو اُٹھایا اور وہ جوابات دئے ہیں جنہیں فطرت و عقل بے چینی کے ساتھ ڈھونڈھتی تھی، اس سلسلہ میں جو کچھ کہا جائے گا ممکن ہے کہ ڈھونڈھنے سے دوسرا مذاہب کی الہامی یاد

داشتوں میں بھی اس کے تعلق کچھ تسلی مل سکے، لیکن جہاں تک میری جستجو کا تعلق ہے قرآن کریم کا بیان اس باب میں جتنا روشن ہے یقیناً یہ روشنی کسی دوسری جگہ میسر نہیں آسکتی۔

استفادہ تحریر: حمزہ اینڈر ریس کی انگلش کتاب "دی ڈیوائن رئیلیٹی: گاڈ، اسلام اینڈ دی میرج آف ایتھی ازم"

الحاد تعریف، تاریخ اور ترویج

الحاد ایک تصور ہے جس کا ماننے والا اپنے آپ کو ملحد کہلواتا ہے۔ ملحد ایسا شخص ہوتا ہے جو خدا کے وجود کا صریح انکار کرتا ہے۔ انگریزی لفظ atheism، جو یونانی زبان سے آیا ہے، میں a کے سابقہ کا مطلب ہے نہیں یا کوئی نہیں اور theism، جو لفظ theos سے آیا ہے، کا مطلب ہے 'کسی خدا یا خداؤں کے وجود کا عقیدہ'۔ انگریزی لفظ کا مطلب ہوا 'خدا کے وجود کا عقیدہ نہ رکھنا'۔

لغوی مطالب پر اکتفا کرنا کفایت نہیں کرتا، یہ معلوم کرنا لازم ہے کہ خدا کے وجود سے انکار کا کیا مطلب ہے۔ الحاد کی کسی تعریف پر مکمل اتفاق نہیں ہے لیکن اس وقت میرا کام فلسفیانہ بال کے کھال اتارنا نہیں ہے۔ میری توجہ عملی حصے پر مرتکز ہے[i]۔ ہم اس ضمن میں تین سوالات پر تفصیلی نظر ڈالیں گے۔

کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا شخص جو اپنے آپ کو ملحد کہلواتا ہے، اس کے پاس ایسے دلائل ہیں جن سے الحاد کا عقیدہ سچا ثابت ہوتا ہے؟

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی تک کسی الٰہیاتی دلیل سے قائل نہیں ہوا؟ یا

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بس یونہی کسی خدا پر ایمان نہیں رکھتا؟

آیئے میرے پہلے سوال پر غور کیجئے: ''کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو اپنے آپ کو ملحد کہلواتا ہے، اس کے پاس ایسے دلائل ہیں جن سے الحاد کا عقیدہ سچا ثابت ہوتا ہے؟ اس صورت میں، جبکہ ملحد یہ کہتا ہے کہ کوئی خدا موجود نہیں ہے، ملحد ایک ایسا شخص ہے جو اس بارے میں قوی علم کا دعویٰ کرتا ہے کہ کوئی خدا موجود ہی نہیں ہے۔ تاہم اس قسم کا دعویٰ کرنا جتنا آسان ہے، اس کے دلائل دینا اتنا ہی مشکل ہے۔ یہ دعویٰ ایک خبریہ فقرہ ہے، اور یہ اپنے آپ کو قائم کرنے کے لئے کچھ دلائل مانگتا ہے۔ اس لئے، ایسے ملحد کو لازم ہے کہ اپنے نقطہ نظر کے حق میں دلائل فراہم کرے۔

اب ہم دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں: کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ملحد اب تک کسی الٰہیاتی دلیل سے قائل نہیں ہوا؟ یہ بذات خود الحاد کے دائرہ سے باہر نکلنے اور تشکیک کے گرداب میں داخل ہونے کی نشانی ہے۔اس طرح کا موقف رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کے وجود کی کوئی اچھی دلیل پیش کر دی جائے، تو وہ اس کو قبول کر لیں گے۔

آخر میں، ہمارے پاس اب یہ سوال درپیش ہے: کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص بس یونہی کسی خدا پر یقین نہیں رکھتا؟ اگر کوئی ملحد محض اپنی پسند کی وجہ سے خدا پر ایمان نہیں رکھتا، بغیر کسی عقلی غور و فکر کے، تو یہ کس طرح کسی دوسرے عقیدے سے مختلف قرار پاتا ہے، خواہ وہ توہماتی عقائد ہوں یا نجومی۔

میرا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ سوال کہ ''بھلا کیوں تم کسی خدا پر یقین نہیں رکھتے؟'' کسی ملحد کے ساتھ گفتگو کے آغاز کا بہترین طریقہ ہے (دیکھئے باب نمبر 4)۔اس پہلے ہی سوال کا جو جواب وہ دیں، اس سے ہی مجھے واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تشکیک میں مبتلا ہیں، شوقیہ ملحد ہیں یا ایسے (پڑھے لکھے) ملحد ہیں، جو اپنے پاس خدا کے موجود نہ ہونے کی کوئی دلیل رکھتے ہیں۔اگر وہ مبتلائے تشکیک ہیں، تو بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ آپ اس بات کے اچھے دلائل دیں کہ آپ کیوں سمجھتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔اگر وہ مخلص ہوئے، اور آپ کی دلیل مضبوط ہوئی تو پھر ان کو خدا کے وجود پر ایمان لانا ہوگا۔اگر وہ شوقیہ ملحد ہیں اور بغیر کسی دلیل ہی کے

خدا کا انکار کر بیٹھے ہیں تو ان کو اپنے عقائد یا تصورات پر غور و فکر کرنے پر مجبور کریں۔ ایسے لوگوں سے میرا سوال ہوتا ہے: ''خدا کے وجود کو جھٹلانے کے لئے تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟'' میں ان کو بغیر کسی عقلی و فکری بنیادوں کے محض ذاتی پسند پر شوقیہ عقائد و تصورات رکھنے کے نقصانات دکھاؤں گا۔ اگر ان کا یہ دعویٰ ہو کہ ان کے پاس خدا کے موجود نہ ہونے کی دلیل ہے تو میں ان سے دلیل مانگوں گا۔ ایسی صورت میں بحیثیت مسلم اب یہ میری ذمہ داری ہوگی کہ ان کو سمجھاؤں کہ ان کی دلیل کس طرح بودی یا غلط فہمی پر مبنی ہے، ساتھ ہی ساتھ مجھے اللہ تعالیٰ کے وجود کے دلائل بھی دینا ہوں گے۔

چنانچہ خلاصتاً، ملحد ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ، پہلے، تو ایک منفی دعوی کہ بندہ خدا کے وجود کا منکر ہے۔ دوسرے، خدا کے وجود کے حق میں جو دلائل ہیں، وہ قوی نہیں ہیں، یعنی بندہ مبتلائے تشکیک ہے۔ آخر میں، یہ اصرار کہ خدا کا وجود نہیں ہے۔ اس طرح کا اصرار کسی دلیل قوی کا محتاج ہے۔ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ زیادہ تر ملحدین صرف اس لیے ملحد ہیں کہ وہ خدا کے وجود کے حق میں دلائل سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زیادہ تر ملحد حقیقی معنوں میں ملحد ہیں ہی نہیں بلکہ وہ تشکیک کا شکار ہیں۔ چنانچہ امید کی کرن باقی ہے، صرف اتنا کرنا ہے کہ خدا کے وجود کے حق میں کوئی اچھی سی دلیل پیش کی جائے۔ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا اہم ہے کہ یہاں پیش کردہ تعریفات پتھر پر لکیر نہیں ہیں؛ ہر قسم کے الحاد میں مختلف درجات ہیں۔ ملحدین کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان مختلف قسموں میں سے کچھ کا ملغوبہ بھی بناتے ہیں۔

لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔بنی نوع انسان محض علمی و عقلی مشینیں نہیں ہیں۔ سماجی، روحانی اور نفسیاتی عوامل کی ایک فہرست ہے جو اس بات کا تعین کرتی ہے کہ ہم کون سا نقطہ نظر اپناتے ہیں۔ مخصوص فیصلوں اور عقائد پر منتج ہونے والے عوامل جو ہمہ جہت بکھرے ہوئے ہیں، ان سب کی گتھی سلجھانا ناممکن ہے۔ تاہم میرا تجربہ بتاتا ہے کہ الحاد کا عقیدہ محض سائنس اور عقل سے جنم لینے والا کوئی علمی و منطقی تصور نہیں ہے۔ اس کے برعکس، الحاد کی جڑیں انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں (اگرچہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کلیے کا اطلاق کچھ ملحدوں پر نہیں ہوتا)۔

میزوتھیزم: خدا سے نفرت

اگرچہ یہ الحاد کی قسم نہیں سمجھا جاتا، میرا خیال ہے کہ انکار خدا کی اس قسم کی وضاحت بھی دلچسپی سے لبریز ہو گی۔ بجائے خدا کا انکار کرنے کے، یہ نقطہ نظر خدا کے ساتھ ایک شدید قسم کی نفرت پر مشتمل ہے اور یہ خواہش کہ اس کا وجود نہ ہی ہو۔ الحاد کے انگریزی لفظ کی طرح یہ بھی یونانی زبان سے آیا ہے۔ اس کی بابت کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ یہ الحاد کی کچھ قسموں کو نفسیاتی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر برنارڈ شیوائزر نے اس موضوع پر ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں وہ ممتاز مفکرین اور مصنفین بشمول ایلجرنان چارلس سوین برن، زورا نیل ہرسٹن، ریبیکا ویسٹ، ایلی ویزل، پیٹر شیفر اور فلپ پُل مین وغیرہ کی متعدد ادبی نوعیت کی کارگزاریوں کی چھان بین کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہ لوگ شر اور تکلیف سے اٹی ہوئی اس دنیا میں رحمان اور رحیم کی صفات والی کسی ہستی کے تصور کو قبول کرنے میں مشکلات کا شکار دکھائی دیتے

ہیں۔ وہ واضح کرتا ہے کہ ان کے خدا سے نفرت کا محرک ان کی ''عمومی طور پر قابل قدر انسان دوست جذبات سے مغلوبیت ہے''[ii]۔ شیوائزر واضح کرتا ہے کہ متنفرینِ خدا جذباتی اور نفسیاتی طور پر مشکلات سے دوچار ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ''یہ بالکل سچ ہے کہ نفسیاتی، جذباتی اور جسمانی طور پر زخم خوردگان کا زیادہ امکان ہوتا ہے کہ وہ خدا سے متنفر ہو جائیں''[iii] اور یہ کہ ''کسی طرح یہ بات یقینی نہیں قرار پاتی کہ زیادہ مؤثر نوعیت کی مذہبی تبلیغ سے خدا سے نفرت کی آگ ٹھنڈی ہو گی یا الحاد کے راستے مسدود ہوں گے''[iv]۔ اگرچہ یہ مفکرین تنفیر خدا کی مختلف صورتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ سارے انسانی اندوہ میں خدا کے کردار پر سوال اٹھاتے ہیں:

''متنفرِ خدا کی حالت اور ہے۔ اس کے لئے شر کی عالمگیر ارزانی کے پہلو بہ پہلو ایک 'رحم و کرم اور جود و سخا کے پیکرِ خدا' کے تصور کا بے جوڑ ہونا اصل مسئلہ ہے۔ خدا کے متنفرین خدا کو اصلاً مطعون کرنے والے ہیں، اور وہ اس کو عام شر اور ناحق اندوہ پر موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ یوں، ملحدین اور متنفرین انسانی تکالیف میں خدا کے کردار پر مخالف اطراف سے سوال کرنے آ جاتے ہیں: ملحد کہے گا کہ متنفر محض تخیل کی بنیاد پر ایک فضول دعویٰ کرتا ہے۔ متنفر کے لئے، چونکہ وہ خدا کے وجود کا عقیدہ رکھتا ہے، اس کی نظر میں خدا کوئی قربانی کا بکرا نہیں ہے بلکہ شر کا مجرم اور شریک جرم ہے۔''[v]

شیوائزر کا مطالعہ نہایت ستھرا ہے۔ وہ تنفیر خدا کی تشکیکی تنفیر، مکمل تنفیر اور سیاسی تنفیر میں درجہ بندی کرتا ہے۔ پروفیسر کے بنیادی نکتے کو سمیٹنے کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ متنفر اس بنیادی سوال پر اڑا ہوا ہے: انسانیت نے ایسا کیا برا کیا ہے کہ خدا اور اس کی طرف سے جاری کردہ تمام تر شر و فساد کا مستحق ٹھہرے؟ اپنے تجربے سے میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ ملحدین اور متنفرین میں بہت سی ذہنی قرابت ہے۔ ایک سوال جو عام طور پر اس نتیجے کی صداقت کو ثابت کر دیتا ہے، یہ ہے کہ: 'اگر خدا بالواقع موجود ہو، تو کیا تم اس کی عبادت کرو گے؟' (دیکھئے باب نمبر 15) بہت سے ملحدین کا جن سے میرا سامنا ہوا ہے، جواب ہوتا ہے ''نہیں'' اور وہ بکثرت دنیا میں 'غیر ضروری' اور 'بلاوجہ' کی شر اور اندوہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ اگرچہ میں ان کے غم میں اپنے آپ کو شریک پاتا ہوں اور اپنے جیسے حساس ذی روح افراد کی تکالیف پر ترس آتا ہے، ملحدین اور متنفرین ایک پوشیدہ نوعیت کی انائیت کے بھی شکار ہیں۔ یعنی وہ دنیا کو اپنے نقطہ نظر کے علاوہ کسی اور نقطہ نظر سے نہ دیکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ تاہم، ایسا کرتے ہوئے وہ ایک قسم کی جذباتی—یا روحانی—مغالطہ دیتے ہیں۔ وہ خدا کو انسانی قالب دیتے ہیں اور اس کو ایک محدود انسان میں بدل دیتے ہیں۔ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ خدا کو لازماً چیزوں کو اس انداز سے دیکھنا چاہیئے، جس انداز سے ہم دیکھتے ہیں اور اس لئے اس کو تمام شر کو ضرور ہی روکنا ہو گا۔ اگر وہ اس کو جاری رہنے دیتا ہے، تو اس پر سوال اٹھانا اور اس کے وجود کو مسترد کر دینا چاہیئے۔

خدا کو انسان کے ساتھ اس طرح موازنہ کرنے سے چیزوں کو ان کی کلیت میں سمجھنے میں ان کی نااہلی ظاہر ہوتی ہے۔ متنفر اس نکتے پر غالباً یہ سنسنی خیز دعویٰ کرے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا سے زیادہ

رحم دل ہے۔اس بات سے ان کی نااہلی اور ظاہر ہوتی ہے کہ وہ چیزوں کو اپنے نقطہ نظر سے ماوراء دیکھ سکیں، اوران کی اس ناکامی کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اس نکتہ کو سمجھیں کہ خدا کی مرضی اور اس کے کام کسی الٰہی حکمت کے تابع ہے، جو ہماری فہم سے پرے ہے۔اللہ تعالیٰ شر و فساد سے خوش نہیں ہوتا۔اللہ ان چیزوں کو روکتا نہیں ہے کیونکہ اس کے فہم میں ہر شے ہے اور وہ ہر اس بات کو احاطہ میں لئے ہوئے ہے، جو ہم نہیں دیکھ پاتے،نہ کہ اس لئے کہ وہ شر اور تکلیف کے جاری رہنے سے خوش ہوتا ہے۔اللہ کے پاس پوری تصویر ہے اور ہم اس کے محض ایک نقطے کو ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔اس بات کی سمجھ سے روحانی اور ذہنی تسکین حاصل ہوتی ہے۔کیونکہ مؤمن یہ سمجھتا ہے کہ آخر کار اس دنیا میں جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ ایک بالاتر الٰہی حکمت کے تحت ہوتا ہے، جو ایک بالاتر الٰہی رحمت پر مبنی ہوتا ہے۔اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار ہی وہ مقام ہے جہاں اللہ کا انکاری غرور، انائیت اور آخر کار مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔وہ آزمائش میں ناکام ہو چکا ہوتا ہے اور خدا سے اس کی نفرت اس کو اس مقام پر پہنچا دیتا ہے، جہاں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ خدا کون ہے، اور وہ الٰہی حکمت، رحمت اور بھلائی کو مسترد کرتا ہے۔

الحاد اور فلسفیانہ فطرت پرستی

قبل اس کے کہ میں الحاد کی اسلامی تعریف پر گفتگو کروں، اس باب میں ایک ایسے تصور کا تعارف پیش کروں گا جس کا اس کتاب کی متعدد ابواب میں تذکرہ آئے گا۔ الحاد کی طرح، فلسفیانہ فطرت پرستی(Philosophical -Naturalism) بھی تصور الٰہ اور ماورائے فطرت کا انکار کرتی

ہے۔ چنانچہ اس میں تعجب نہیں ہے کہ زیادہ تر ملحدین فلسفیانہ فطرت پرستی کو نظریہ حیات کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ فلسفیانہ فطرت پرستی وہ نظریہ حیات ہے کہ کائنات میں واقع ہونے والے تمام مظاہر کی، طبیعیاتی سلسلہ اعمال (Physical processes) کے ذریعے وضاحت کی جا سکتی ہے۔ فلسفیانہ فطرت پرست لوگ تمام تر ماورائے فطرت دعوؤں کو مسترد کرتے ہیں اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اس کائنات سے "باہر" کسی چیز کا وجود ہے بھی، تو وہ اس کائنات کے ساتھ کسی قسم کا تعارض نہیں کرتی۔ جیسا کہ پروفیسر رچرڈ ڈاکنز کا بیان ہے، ہر ملحد "یہ یقین رکھتا ہے کہ فطری اور طبیعی دنیا سے ماوراء کچھ بھی موجود نہیں ہے" [[vi]۔ تاہم کچھ ملحد دانشور فطرت پرست نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ ملحد خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں، وہ غیر طبعی مظاہر کے وجود کے قائل ہیں۔ خدا پر ایمان رکھنے والے کے لئے اس طرح کے الحاد پر علمی مباحثہ عمومی پیرایے میں آسان تر ہے کیونکہ وہ غیر طبعی مظاہر کا انکار نہیں کرتے۔

یہ نہایت اہم بات ہے کہ زیادہ تر ملحدین جو خدا کے وجود کی تردید میں دلائل دینے پر اصرار کرتے ہیں، فلسفیانہ فطرت پرستی کا تصور اپناتے ہیں، خفیہ یا علانیہ۔ تاہم، اس کتاب میں پیش کردہ زیادہ تر دلائل ان کو بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جو فلسفیانہ فطرت پرستی کو نہیں اپناتے لیکن پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں الحاد کا شکار ہیں۔

اسلامی تعریف

اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرنے کو 'الحاد' کہا جاتا ہے۔ الحاد عربی زبان کے لفظ 'لحد' سے آیا ہے جس کا استعمال قبر کھودنے کے اس اسلامی طریقے کو بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے جس میں گڑھا کھودنے کے بعد اس کے ایک جانب میت کے لئے ایک خانہ سا بنایا جاتا ہے۔ یعنی لحد کا مطلب اصل گڑھے سے انحراف ہے۔ لغوی اعتبار سے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ الحاد فطری اور عقلی اعتبار سے درست نقطہ نظر سے انحراف ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمام انسان فطرت سلیمہ یا ایسی ذہنی و فکری حالت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، جو اصولی طور پر خدا کے وجود کو تسلیم کرتی ہے اور اس کی عبادت کا جذبہ موجزن ہوتا ہے (دیکھئے باب نمبر 4) [[vii]۔ اس حدیث نبوی سے اس اسلامی عقیدے کی بنیاد پڑتی ہے کہ الحاد غیر فطری ہے اور انسانی نفسیات سے سنگین بے اعتنائی کے مترادف ہے۔

اسلامی الٰہیات کے مطابق، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں پیدا کرنے والا (الخالق)، پالنے والا (الرزاق)، اور ابتدا کرنے والا (المبدئ) شامل ہیں۔ ملحدین ان اسماء و صفات کو مسترد کرتے ہیں اور اس کائنات کے لئے کسی خالق کے وجود کو جھٹلاتے ہیں۔ اسلام کے نظریہ توحید کے مطابق اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات میں سے کسی ایک کا بھی انکار شرک تصور ہوتا ہے (دیکھئے باب 15)۔ چنانچہ اسلامی تعلیمات کے نقطہ نظر سے، ملحد کو مشرک تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں تعجب نہیں ہے کہ قرآن حکیم اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ جو کسی خالق کے وجود کو جھٹلاتے ہیں، وہ لوگ ''غیر یقینی کی کیفیت میں ہیں'' [viii] اور یہ بھی کہ قرآن توحید کے منکروں کو ''نادان'' قرار دیتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین اور ان کے ساتھ ساتھ ملحدین

بھی بے وقوف، نادان اور غافل ہیں[[ix]۔ الغرض، الحاد کے متعلق اسلام کا موقف یہ ہے کہ یہ ایک غیر فطری تصور ہے جو بے یقینی اور بے وقوفی پر مبنی ہے۔

الحاد کی یہ تعریف غیر جانبدار نہیں ہے۔ یہ اثباتی طور پر ایک خدا یا خالق کا وجود فرض کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی نہیں ہے کیونکہ قرآن الحاد کو نقطہ آغاز تسلیم نہیں کرتا۔ یہ آسمانی کتاب تسلسل کے ساتھ مظاہر قدرت کا حوالہ دیتا ہے۔ یہ آیتیں قاری یا سامع کے لئے مقدموں کے طور پر استعمال کی گئی ہیں تاکہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اللہ تعالیٰ ہی عبادت کے لائق ہے۔ اس نے کائنات کو حکمت، مقصد، باریکی اور خوب صورتی سے تخلیق کیا۔ یہ آیتیں اللہ تعالیٰ کی بڑائی، قدرت، عظمت، رحمت اور محبت کی بھی تعریف کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ اگرچہ کم از کم دو آیتیں الحاد کو براہ راست موضوع بناتی ہیں (دیکھئے باب 5)، قرآن کریم کا زیادہ تر حصہ جو دنیائے محسوس پر دلالت کرتا ہے، نہ صرف علمی دلائل کے لئے ثبوت فراہم کرتا ہے بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کی نشانی کے طور پر بھی کہ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے، کسی الٰہی حکمت، قدرت اور مقصد کے ساتھ تخلیق کی گئی تھی۔ لازم ہے کہ یہ بات انسان کے ذہن اور قلب کو اس نتیجے تک مزید پہنچائے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہماری عبادت اور محبت کا حق دار ہے (دیکھئے باب 15)۔ یہ قرآنی حکمت اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ الحاد اور متعلقہ سوال کہ کیا خدا موجود ہے؟ نقطہ آغاز نہیں ہے؛ بلکہ، یہ غیر فطری نقطہ نظر ہے جو کھلی حقیقت کا انکار کرتا ہے (دیکھئے باب 4)۔

الحاد کی مختصر تاریخ

تاریخ اسلام میں

آٹھویں صدی کے ''دہریہ'' کے ظہور تک الحاد کوئی معاشرتی اور علمی خطرہ نہیں تھا۔ یہ مفکرین شاہد پرست تھے جن کا ماننا تھا کہ تمام تر علم صرف تجربات سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ کائنات ازلی ہے اور چار خصوصیات سے مل کر بنی ہے، جو ہر موجود چیز کا ذمہ دار ہے۔ وہ کہتے تھے کہ تمام چیزیں ہمیشہ سے موجود ہیں اور کسی خالق یا بنانے والے کی ضرورت نہیں ہے۔[[x]]

فرج الاصفہانی کی کتاب الاغانی کے مطابق، مشہور قاضی اور روایتی مکتب فکر کے بانی امام ابو حنیفہ نے آٹھویں صدی میں ایک دہری سے مناظرہ کیا تھا۔ ابو حنیفہ دہریوں کو عوامی مناظروں میں چاروں شانے چت کرنے میں مشہور تھے (دیکھیئے باب 8)۔ امام الغزالی، ابن الجوزی، الجاحظ، محمد بن شبیب، ابن قتیبہ، اور ابو عیسیٰ الورّاق وغیرہ بہت سے علمائے اسلام نے دہریوں کے دعوؤں کی خوب بیخ کنی کی[[xi]۔ امام غزالی اپنی کتاب کیمائے سعادت میں دہریہ کو اختزالی قرار دیا ہے جو کائنات اور اس کے مقصد کی کوئی تکمیلی فہم نہیں رکھتے۔ وہ دعوے سے کہتے ہیں کہ وہ لوگ ایک کاغذ پر چلتے چونٹیوں کی مانند ہیں جو روشنائی یا قلم سے پرے اپنی نظریں نہیں اٹھا سکتے، یوں وہ لکھنے والے کو دیکھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں[[xii]۔

الحاد کی اسلامی تاریخ کے مطالعے سے نہایت واضح طور پر ایک علمی گفتگو اور مباحثے کی آزادی معلوم ہوتی ہے جو صرف باہمی احترام اور رواداری ہی سے ممکن ہے۔ قرآن اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ متنوع آراء کا ہونا اللہ تعالیٰ کی مرضی میں سے ہے، اور کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہیئے سوائے باہمی احترام اور رواداری کے:

"اور اگر تیرا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب ایمان لے آتے، پھر کیا تو لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔"[[xiii]]

"دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے"[[xiv]]

مفکر اسلام اور عالم دین ڈاکٹر جعفر ادریس دیگر عقائد سے متعلق اسلام کے حکم کا خلاصہ بڑی خوب صورتی سے پیش کرتے ہیں:

"غیر اسلامی عقائد کے پیروکاروں کے ساتھ پر امن بقائے باہمی، اسلام کا ایک لازمی اصول ہے جو قرآن کی بہت سی آیتوں میں بیان ہوئی ہے اور جس پر مسلمان اپنی ساری تاریخ میں عمل پیرا رہے۔ یہ کوئی ایسی چیز

نہیں جو مسلمان اپنے مذہب پر لاگو کرتے ہیں یا بیرونی حالات کی وجہ سے جس کی طرف پناہ لیتے ہیں۔ یہ دین اسلام کا ایک فطری تقاضا ہے۔۔۔"[[xv]

اسلام کا علمی ورثہ ایسے مسلمانوں کو اعتماد دلاتا ہے جو عصر حاضر میں ایسے چیلنجز کا سامنا کر رہے ہیں جو ان کے دین کی علمی بنیادوں پر سوال اٹھاتے ہیں۔ سیکولرز اور ملحدین کی طرف سے اٹھائے جانے والے بہت سے سوالات جو نئے کہلائے جاتے ہیں، اسلام کے پرانے علماء پہلے ہی ان کا تشفی بخش جواب دے چکے ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمان بڑی مظبوط بنیادوں پر کھڑے ہیں۔ ان کا کام صرف اتنا ہے کہ اس علمی خزانے تک رسائی لیں اور اس کو جدید ذہن کے موافق بنا کر پیش کر دیں۔

مغرب میں

قدیم زمانوں میں الحاد کسی معروف تحریک کی صورت میں کبھی نہ تھی، اور اس کے قابل ذکر پیروکار بھی نہ تھے۔ مؤرخین کے مطابق، قدیم زمانوں میں جتنے ملحدین ملتے ہیں، وہ چند افراد تھے (کچھ مستثنیات) "جنھوں نے اپنے عدم ایمان کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی جرات کی یا کچھ فلسفی ایسے تھے جنھوں نے خداؤں کے وجود میں آنے کے متعلق علمی و عقلی نظریات پیش کیے، عام طور پر اپنے نظریات پر عمل درآمد کیے یا مذہب کو کلی طور پر مسترد کیے بغیر۔"[[xvi] الحاد کے انگریزی متبادل atheism کا پہلا استعمال یونانی عالم سر جان چیک [1] کے ہاں ملتا ہے، جنھوں نے پلوٹارک [2] کی ایک کتاب [3] کے ترجمے میں یہ لفظ

استعمال کیا۔ فرانس میں سترہویں صدی میں الحاد پر معرکہ آرائی شروع ہوئی اور اس نظریے کے خلاف سماجی و سیاسی اقدامات لیے گئے[xvii]۔الحاد کو اٹھارہویں صدی کے برطانیہ میں ایک خطرہ تصور کیا جاتا تھا۔ مشہور زمانہ ڈرامہ نگار و مضمون نگار جوزف ایڈیسن[4] نے عیسائی مذہب کا ثبوت کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جس میں ایک حصہ الحاد کے خلاف بھی تھا۔ کتاب کے اس حصے میں، وہ ملحدین کی یوں تصویر کشی کرتے ہیں:

"اس قسم کے جذباتی لوگوں میں ایک چیز ایسی گھٹیا اور ٹیڑھی ہے کہ آدمی کو پتہ نہیں لگتا کہ ان کی اصلی رنگت کیا ہے۔ یہ ایسے جواری ہیں جو ہمیشہ ہی مار کھاتے ہیں، اگرچہ وہ کسی چیز کے لئے بھی نہیں کھیلتے۔ وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کو اپنے جیسا بننے کی ترغیب دیتے ہیں، اگرچہ ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اس تبادلے سے دونوں ہی کو خاک فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ مختصراً، الحاد کے فروغ کا جذبہ خود الحاد سے زیادہ بے ہودہ ہے... وہ ایسے نظریات کی جال میں پھنسے ہوئے ہیں جو باہم تضادات اور ناممکنات سے پر ہیں۔ اور ہاں ایمان کے کسی ایک رکن میں کوئی چھوٹی سی مشکل پیش آنے پر اس کو سارے کا سارا مسترد کرنے کی مشکل ہی کو دیکھ لیجئے۔۔۔ میں ایسے کسی ہٹ دھرم کافر سے جو الحاد کے سارے بڑے نکات کو کائنات کے وجود کا سبب کے طور پر سہارا دیتا ہو، پوچھنا چاہوں گا: روح کی فناپذیری، جسم کی اتفاقی طور پر شاندار تنظیم، مادے کی حرکات اور باہم کشش؛ اور اسی قسم کی چیزیں باہم ایک عقیدے کی مانند مرتب کر کے اس پر ایمان لے آنا اور اس عقیدے کا دنیا کے لوگوں پر مسلط کیا جانا، کیا اس کے لئے بے پناہ قسم کی ایمانی قوت درکار نہیں ہو گی، بمقابل ارکان ایمان کے کسی بھی مجموعے کے، جس کی یہ لوگ اتنی شدت سے مخالفت کرتے ہیں؟

چنانچہ میں اس جھگڑالو نسل کو، ان کی اپنی اور عوامی بھلائی کے لئے، یہ نصیحت کروں گا کہ کم از کم کسی ایک بات پر جم کر قائم تورہ لو اور بے وقوفی سے بے دینی کے جوش میں جل کر کوئلہ نہ ہو جایا کرو۔"[xviii]

ایڈیسن کے الفاظ اگرچہ مرصع ہیں، اٹھارہویں صدی میں مذہب پر ایک قسم کی پرجوش اور تند و تیز بحث و مباحثے کا پتا دیتے ہیں۔ اگرچہ برطانیہ میں الحاد کوئی معروف عام تحریک نہیں تھی، کفر کے کچھ بیج بو دیے جا چکے تھے اور ان کے کچھ پھل بھی پک کر سامنے آرہے تھے۔

اگرچہ ایڈیسن کا الحاد کی وضاحت اس کے دور میں بڑھتے ہوئے مباحثوں کی ایک متعصب تصویر کشی ہے، سترہویں اور اٹھارہویں عیسوی کی صدیاں ایسی نمایاں علمی کارناموں سے پہچانی جاتی ہیں، جنھوں نے ایک علمی نوعیت کی تشکیکیت اور ایک قسم کی ماوراء عقیدہ الحاد کا راستہ ہموار کیا۔ بہت سے فلسفی اور مفکرین اس کے ذمہ دار تھے۔ 1689 میں پولش مفکر کازیمرز لزکزنسکی [5] نے اپنی ایک کتاب میں خدا کے وجود کا انکار کیا۔ لزکزنسکی کا کہنا تھا کہ خدا انسان کا ساختہ ایک تصور ہے اور یہ کہ انسان نے خدا کا تصور اس لیے گھڑا کہ دوسروں پر تسلط پا سکے۔ 1674 میں میتھیاس نطزن [6] نے، جس کی یورپ بھر میں شاندار مقبولیت تھی، الحاد کے دفاع میں تحریریں پیش کیں۔ اٹھارہویں صدی میں ڈیوڈ ہیوم [7] اور وولٹائر [8] جیسے لوگوں نے ایسے خیالات اور دلائل پیش کیے، جو الحاد کو جڑ پکڑنے کے لئے ناگزیر قسم کی زمین فراہم کرتے ہیں۔ وولٹائر نے ڈی ازم [9] کے حق میں دلائل دیے، جو ایک ایسا فلسفیانہ اور الٰہیاتی نقطہ نظر ہے، جو یہ کہتا

ہے کہ ایک اکیلا خالق موجود ہے، لیکن یہ انسانی زندگی میں وحی اور مذہبی علم کے کردار کی نفی کرتا ہے۔ ڈیوڈ ہیوم نے خدااور مذہب کے معاملے پر اچھاخاصا تحریری مواد چھوڑا۔اس کا کہنا تھا کہ خدا کا تصور فہم سے بالا ہے۔ اس نے خدا کے وجود کے لازم ہونے کے تصور کی مخالفت کی اور "لازمی وجود(Necessary Existence)" کی کمزوریوں اور محدودیت کو واضح کرنے کی کوشش کی (دیکھئے باب نمبر 8)۔ ہیوم کا کہنا تھا کہ دنیامیں شر اور اندوہ کا وجود علمی طور پر مشکل ثابت ہوتا ہے۔ قدیم فلاسفہ کے اقوال کی بازگشت میں، اس کے دلائل نے خدا کے وجود کا انکار تو نہ کیا؛تاہم ان دلائل نے اتنا ضرور کیا کہ شر کی شر انگیزی اور ایک انسانی نقطہ نظر سے اس کی توجیہ کی ہماری ناکامی کو عیاں کیا(دیکھئے باب 11)۔ ہیوم کے مذہب کے تصور معجزہ پر حملوں کا نمایاں اثر ہوا۔اس کا کہنا تھا کہ معجزات پر ایمان صرف اس صورت میں معقول ہو گا اگر عینی شاہدین کے غلطی کرنے کا امکان ان معجزوں کے واقع ہونے کے امکان سے کم ہو۔ اگرچہ یہ بحث ایسے فلسفیوں، لکھاریوں اور مفکروں کی کوئی مکمل تصویر نہیں دیتی، جنھوں نے الحاد کو عوامی رواج میں جڑ پکڑنے میں مدد دی، یہ اس دور میں مغرب میں خدا کا انکار کرنے کی تاریخ پر ایک جھلک ڈالتی ہے۔

انیسویں صدی میں الحاد کی جنگ لڑنے والی ایک اہم شخصیت ابھری، جس کا نام چارلس براڈلا[10] ہے۔ برطانوی پارلیمان کے مذکورہ رکن نے الحاد کو معاشرے کے لئے قابل قبول بنانے کے لئے ایک طویل جنگ لڑی۔ اگرچہ اس نے اپنا مقصد حاصل نہیں کیا، لیکن صدی کے آخر تک اس نے دوسروں کے لئے راستہ ہموار کیا کہ وہ اس جدوجہد کو آگے بڑھائیں[xix]۔ براڈلا نے بہت سے مضامین لکھے، جن میں

Humanity's Gain from Unbelief, A Plea for Atheism اور Doubts in Dialogue شامل ہیں[[xx۔ براڈلا، تشکیک اور الحاد کا حامی و مددگار، نے اپنی تحریروں کی مدد سے ''کافی سارے موجودہ تعصبات، جو نہ صرف الحادی نظریات رکھنے والوں کے خلاف تھے، بلکہ ان کے خلاف بھی، جن پر الحاد کا شک تھا'' کی مدد کی[[xxi۔ براڈلا کی تحریک صرف برطانوی معاشرے کو الحاد کو قبول کرنے پر قائل کرنے تک محدود نہ تھی بلکہ یہ بھی واضح کرنے میں لگی ہوئی تھی کہ الحاد سے انسانوں کی زندگی زیادہ خوش ہوتی ہے اور آدمی کی بہبود میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے ''تشکیکیت سے انسانیت بہت کچھ حاصل کرنے والی ہے، اور یہ کہ عیسائیت کی بتدریج اور بڑھتی ہوئی تردید نے درحقیقت آدمی کی خوشی اور بہبود میں اضافہ کیا ہے اور یہ اضافہ جاری رہے گا۔ xxii]]"

1920 کی دہائی نے منطقی اثباتیوں [11] کا ظہور دیکھا۔ سائنس میں ترقی سے متاثر ہو کر اس شدت پسند فلسفیانہ تحریک نے یہ نقطہ نظر اپنایا کہ الفاظ اور جملے تب ہی معنی خیز ہوتے ہیں جب ان کی تجرباتی طور پر تصدیق کی جاسکتی ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا جملہ بولتا ہے جو کسی ایسی چیز کی جانب اشارہ کرتا ہو جو حسِ انسانی کی رسائی سے ماوراء ہو تو پھر یہ بکواس ہے۔ منطقی اثباتیوں کا کہنا تھا کہ طبیعی دنیا سے ماوراء کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ الفاظ اور جملے یا تو تجزیاتی ہوتے ہیں یا تشریحی۔ تجزیاتی جملے ایسے جملے ہیں جو اپنی تعریف کے اعتبار سے درست ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ''گیند گول ہے'' کہنا درست ہے کیونکہ ''گول'' لفظ ''گیند'' میں شامل ہے۔ تشریحی جملے ایسے جملے ہیں جو تجرباتی طور پر درست ہوتے ہیں۔ مثال

کے طور پر اس جملے کی صداقت کہ ''گیند اچھل رہا ہے''، گیند کی حالت دیکھ کر معلوم کی جاسکتی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں، منطقی اثباتیوں نے معنویت کا ایک تجرباتی پیمانہ مقرر کر لیا۔ یہ اصول کہتا ہے کہ کسی بھی جملے کو معنی خیز ہونے کے لئے، اس کو لازمی طور پر طبعی تجربے سے تصدیق کیا جانا ضروری ہے۔ اس سبب سے، خدا، مابعد الطبیعیات، اخلاقیات اور تاریخ کے متعلق بہت سے سوالات لایعنی سمجھے گئے۔ اس لئے، الحاد کو نقطہ آغاز سمجھا گیا، کیونکہ خدا کی تصدیق طبعی تجربے سے نہیں کی جاسکتی۔

1960 کی دہائی نے منطقی اثباتیت کی موت دیکھی۔ اس کی موت کا ایک بنیادی سبب یہ حقیقت تھا کہ یہ اپنے آپ کو خود توڑ دینے والی تھی۔ منطقی اثباتیتیوں کا معنویت کا یہ پیمانہ ہے کہ ہر جملے کی طبعی تجربے سے تصدیق کی جائے؛ تاہم خود اس پیمانے کی طبعی تجربے سے تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ نتیجتاً یہ پیمانہ خود ہی بے معنی ٹھہرتا ہے۔

منطقی اثباتیت کے زوال کے بعد علمی دنیا نے وجود خدا پر ایمان کو دوبارہ جڑ پکڑتے دیکھا۔ 1980 میں Time میگزین نے علمی دنیا میں خدا کے وجود کے یقین کے فروغ پر تبصرے میں کہا: ''فکر و دانش کی دنیا میں آنے والے ایک خاموش انقلاب میں، جس کو بیس سال قبل کوئی پیش بینی سے نہیں دیکھ سکتا تھا، خدا کے وجود پر یقین لوٹ کر آرہا ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایسا مذہبی علماء یا عام ماننے والوں میں

نہیں بلکہ علمی فلسفیوں کے خالص فکری حلقوں میں ہو رہا ہے، جہاں ایک اتفاق رائے سے خدا کو مفید مباحثے سے یکسر خارج کر دیا گیا تھا۔''[[xxiii

علمی حلقوں میں خدا کے وجود کے یقین کی واپسی کی وجہ, بیسویں صدی کے وسط میں ہونے والی چھبتی ہوئی سائنسی دریافتیں تھیں۔ان میں 'بِگ بینگ' بھی شامل ہے، جو کائنات کے لئے ایک نقطہ آغاز کا تصور دیتا ہے۔ یہ اس وقت کے متعلق عمومی خیال (یعنی کائنات ہمیشہ سے ہے اور اس کو کسی خالق کی ضرورت نہیں ہے) سے ہٹی ہوئی بات تھی (دیکھئے باب نمبر 5)۔ 1970 کی دہائی میں سائنسدانوں نے کائنات میں ہر طرف ''کمال درستگی (''Fine Tuning) دریافت کرلی, جس سے اس خیال کو سائنسی تقویت ملی کہ کائنات کی ترتیب اور اس کے قوانین بڑی باریکی سے تعین کیے گئے ہیں۔تاکہ یہاں باشعور حیات، جیسے کہ انسان، پرورش پاسکے (دیکھئے باب 8)۔ بیسوں صدی کے آغاز تک انسان علم حیاتیات (Biology) کے پیچ و خم کے بارے میں تقریباً لابلد تھا۔ ماہرین حیاتیات خلیوں کو (جو زندہ اجسام کی اینٹ ہیں) پروٹوپلازم(Protoplasm) کا یکساں ملغوبہ ہی سمجھتے رہے یہاں تک کہ 1935 میں جا کے، جیمس واٹسن اور فرانسس کِرک[12] نے DNA کی ساخت دریافت کی اور بتایا کہ یہ خلیے اور حیوان کی ساخت وپرداخت کی بابت تمام تر معلومات کا حیرت انگیز ذخیرہ اور مرکز ہے۔اس دریافت کے بعد حیاتیاتی ساخت(Molecular Biology) کے رازوں کے انکشاف کا ایک زبردست سلسلہ اب تک جاری ہے۔کِرک (جو خود ملحد تھا) جینیاتی معلومات کے اس خزانے کی آفاقیت سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ وہ اس

بات سے متفق ہو گیا تھا، کہ یہ سارا محض اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا اور کہا کہ کسی قسم کی ماوراء الارض طاقتوں کا عمل دخل شامل ہے[[xxiv]].

سائنس کی دنیا میں ہونے والی ان ترقیوں اور دریافتوں نے اور ان سے ملحق فلسفیانہ مسائل نے الٰہیات کے موضوع کو علمی اور عالمانہ گفتگو میں واپس داخل کر دیا۔ آج الٰہیات کا موضوع ایک مکمل طور پر قابل قدر موضوع کے طور پر جانا جاتا ہے۔ بہت سے عالمانہ نوعیت کی اشاعتیں الٰہیات کے مسئلے پر ملتی ہیں اور عوام الناس کے لئے بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ سوشل میڈیا پر اس مسئلے سے متعلق اربوں کے حساب سے پوسٹس ملتی ہیں۔

الحاد کا فروغ

ان عوامل کے باوصف، الحاد آج تیزی سے بڑھتی ہوئی علمی تحریکوں میں سے ایک ہے۔ گزشتہ بیس سالوں میں ایسے افراد کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جو اپنے آپ کو ملحد یا غیر مذہبی قرار دینے میں فخر جانتے ہیں۔ یہ تحریک، جس کو نیو ایتھیزم (new atheism) بھی کہا جاتا ہے، الحاد اور سیکولرازم (الحاد کا سیاسی رخ) کے مقاصد کی ترجمانی میں پیش پیش ہے۔ آج کے ملحد قلم کار اور مفکرین بشمول رچرڈ ڈاکنز، سام حارث، کرسٹوفر ہیچنز اور ڈان ڈینیٹ وغیرہ نے اس تحریک کو بڑی شد و مد سے فروغ بخشا ہے۔

ان کی کتابیں، سب سے زیادہ بکنے والی کتابیں بن گئیں اور ہزاروں لوگوں نے ان کی تقریریں سنیں۔ تاہم کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کا بیانیہ گھناؤنا، گول مٹول اور باہم الجھن کا شکار ہے۔

کرسٹوفر ہیچنز کہتا ہے "مذہب ہر چیز کو زہر آلود کر دیتا ہے[" xxv]، سام حارث کا اصرار ہے "ہماری مذہبی شناخت کے دن گنے جا چکے ہیں["xxvi] اور رچرڈ ڈاکنز کا موقف ہے کہ خدا کا تصور ایک "دھوکا["xxvii] ہے۔ ان مشابہتوں کے باوصف، ملحدین کوئی یکساں گروپ تشکیل نہیں دے پاتے۔ بعض ملحد محققینءدراصل نئے ملحد بیانیے سے غیر متفق ہیں۔ مثال کے طور پر فلسفی ٹِم[13] کرین لکھتا ہے:

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ بہت سارے دعوے جو نئے ملحدین کر رہے ہیں، وہ بلاشبہ درست نہیں ہیں، اور دنیا کے امور میں مذہب کے کردار کے متعلق ان کا نقطہ نظر کئی لحاظ سے گمراہ ہے۔۔۔ مذہب کے متعلق اس قسم کا رویہ برقرار رکھنا اس دنیا کے مسائل سے نمٹنے کا کوئی سمجھدار انداز نہیں ہے۔۔۔ یہ حیرت انگیز طور پر مشکل ہے۔۔۔ کہ لوگوں کے عقائد تبدیل کیے جائیں۔ لیکن اگر کوئی ایسی چیز ہے جو اس معاملے میں واضح ہو، تو وہ یہ ہے کہ ایسا کرنے کے لئے (عام طور پر) لوگوں کو بے وقوف، نامعقول یا مایوسی کی حد تک جاہل نہیں کہنا ہوگا۔"[[xxviii]

مشہور ملحد فلسفی مشل ریوز[14] نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ’’میرا خیال ہے کہ ڈاکنز فلسفہ اور الٰہیات کے ہر ایک پہلو کے بارے میں جاہل ہے اور یہ بات عیاں ہے۔‘‘ ریوز، نو ملحدین کی ’’نقشۂ دانا(intelligent design)اور عیسائیت کے روبرو حکمت عملیوں کی کامیابی کا جائزہ لینے سے نہیں ہچکچاتا اور ان کے متعلق کہتا ہے کہ وہ:

’’نقشۂ دانا کے خلاف جنگ ایک سانحہ ہے—ہم جنگ ہار رہے ہیں۔۔۔ ہمیں بے مقصد جوابی الحاد کی نہیں بلکہ مسائل کے ساتھ سنجیدگی سے نبرد آزما ہونے کی ضرورت ہے—تم دونوں میں سے کوئی بھی سنجیدگی کے ساتھ عیسائیت کا مطالعہ کرنا اور افکار کے ساتھ الجھنا نہیں چاہتے—یہ دعویٰ جھاڑنا کہ عیسائیت سیدھی سیدھی ایک شیطانی قوت ہے، جیسے رچرڈ دعویٰ کرتا ہے، محض صاف صاف پاگل پن اور کلیتہً غیر اخلاقی ہے—اس پر مستزاد، ہم ایک جنگ میں ہیں، اور ہمیں اس جنگ میں دوست بنانے کی ضرورت ہے، نہ کہ ہر نیک نیت کو دھتکارنے کی۔[’’xxix]

’’باہمی ’’لڑائیوں کے باوجود، الحادِ نو کی تحریک اپنے افکار اور نقطہ نظر کی اشاعت میں خاصا کامیاب ہے۔ برطانیہ اور ویلز میں 25.1٪ لوگ اپنے آپ لا مذہب کہلواتے ہیں، اور ان میں یونیورسٹی والوں کی غالب اکثریت ہے[[xxx۔ یورپ میں 46٪ لوگ خدا کے مروجہ تصور پر یقین نہیں رکھتے، اور 20٪ کا کہنا ہے کہ وہ نہیں سمجھتے کہ کوئی روح، خدا یا قوت حیات کا وجود ہے[[xxxi۔ چین کی آبادی کا نصف حصہ

اپنے آپ کو ملحد سمجھتا ہے[[xxxii۔ عمُرانیات کے پروفیسر فل زکرمین کہتا ہے کہ بہت سے معاشروں میں الحاد فروغ پا رہا ہے[[xxxiii۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اہم عالمی مذاہب کے بعد الحاد چوتھے درجے پر آتا ہے: ''عیسائیت، اسلام، اور ہندو مت کے بعد عوامی طور پر اختیار کیے جانے والے مذہب کی عالمی درجہ بندی میں خدا پر ایمان نہ رکھنے والے، بطور گروہ کے، چوتھے نمبر پر آتے ہیں۔[''xxxiv]

اس بڑھتی ہوئی سماجی تحریک کے اثرات سے مسلم دنیا محفوظ نہیں ہے۔ وِن گیلپ انٹرنیشنل کے مطابق، 5٪ سعودی باشندے اپنے آپ کو باضابطہ ملحد سمجھتے ہیں، اور 19٪ سے زیادہ لوگ اپنے آپ کو غیر مذہبی سمجھتے ہیں[[xxxv۔ عرب دنیا نے الحاد کو فروغ پاتے ہوئے دیکھا ہے اور عربی زبان میں اس موضوع پر کتابوں کا ترجمہ بہت زیادہ کیا جا رہا ہے۔ مغربی ملکوں کے مسلمان بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار ہیں۔ مرتدین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، جبکہ مرتدین اپنے آپ کو ملحد قرار دے رہے ہیں۔ یہ مسئلہ مسلم کمیونٹی میں مختلف درجات پر ابھر رہا ہے جبکہ یونیورسٹیوں میں گہری تبدیلیاں عمل میں آرہی ہیں۔ سوشل میڈیا پر الحادی مطبوعات کی مقبولیت، اور اس کے ساتھ جارحانہ اور پرجوش قسم کی تحریکی سرگرمیوں نے مل کر علمی و فکری چیلنج اور معاشرتی دباؤ کا ماحول تشکیل دیا ہے۔ کیمپس پر آج کوئی مسلمان جوان مسائل سے نمٹنے کے لئے ناگزیر روحانی، علمی اور الٰہیاتی لوازمات سے آراستہ نہ ہو، وہ آسانی سے خدا کے وجود کا انکار کرنے والی نامعقول راہ پر بھٹک سکتا ہے۔

اس کتاب کو لکھنے کی اہم وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کو یہ ضروری سازوسامان بہم پہنچاؤں تاکہ یہ واضح کردوں کہ ،اسلامی تعلیمات باہم مربوط اور سچائی پر مبنی ہیں،اور الحاد ایک فکری سراب ہے۔

Sir John Cheke[1]

Plutarch[2]

On Superstition[3]

Joseph Addison[4]

Kazimierz Lyszczynski[5]

Mathias Knutzen[6]

David Hume[7]

Voltaire[8]

Deism[9]

Charles Bradlaugh[10]

Logical Positivists[11]

James Watson and Francis Crick[12]

Tim Crane[13]

Michael Ruse[14]

[i] Bullivant, S. (2015). Defining ‘Atheism’. In: The Oxford Handbook of Atheism.

Oxford: Oxford University Press, pp. 11-21.

[ii] Schweizer, B. (2010). Hating God: The Untold Story of Misotheism. New York:

Oxford University Press, p. 28.

[iii] Ibid, p. 216.

[iv] Ibid, pp. 217-218.

[v] Ibid, pp. 217-218.

[vi] Dawkins, R. (2006). The God Delusion. London: Bantam Press, p. 14.

[vii] صحیح مسلم

[viii] قرآن کریم، سورت 52، آیت 36. اس کتاب میں، میں نے مختلف قرآنی ترجمے استعمال کیے ہیں۔ میں نے سب سے زیادہ پروفیسر عبد الحلیم صاحب کا ترجمہ استعمال کیا ہے۔ [See Abdel

Haleem, M. A. S. (2005 & Reissue Edition, 2008) The Qur'an: A New Translation. New York: Oxford University Press] and the translation by Sahih International [available at: www.quran.com].

[[ixاور کون ہے جو ملت ابراھیمی سے رو گردانی کرے سوائے اس کے جو خود ہی احمق ہو۔ سورہ بقرہ آیت130

[x] Crone, P. Atheism (pre-modern). In: Encyclopaedia of Islam, THREE, Edited by:Kate Fleet, Gudrun Krämer, Denis Matringe, John Nawas, Everett Rowson. 322 | The Divine Reality. Available at: http://dx.doi.org/10.1163/1573-3912_ei3_COM_23358 [Accessed 1st October 2016].

Ibid. [xi]

[xii] Al-Ghazali. (2007). Kimiya-e Saadat: The Alchemy of Happiness. Translated by Claude Field. Kuala Lumpur: Islamic Book Trust, p. 22. The translator refers to physicists; however, in the original context it refers to those who reject God's providence.

[xiii] سورہ یونس، آیت 99

[xiv] سورہ بقرہ، آیت 256

[xv] Idris, J. (2012). An Islamic View of Peaceful Coexistence. Available at:

www.jaafaridris.com/an-islamic-view-of-peaceful-coexistence

Accessed 1st October 2016].]

[xvi] Bremmer, J. N. (2007). Atheism in Antiquity. In: M. Martin, ed., The Cambridge Companion to Atheism, 1 st Edition. New York: Cambridge University Press, p. 11.

[xvii] Hyman, G. (2007). Atheism in Modern History. In: M. Martin, ed., The Cambridge Companion to Atheism, p. 29.

[xviii] Addison, J. (1753). The Evidence of the Christian Religion. London, pp. 224-223

Hyman, G. (2007). Atheism in Modern History, p. 31. [xix]

[xx] Bradlaugh, C. (1929). Humanity's Gain from Unbelief and Other Selections from the Works of Charles Bradlaugh. London: Watts & Co. The Thinkers Library, No. 4

[xxi] Ibid, p. 23.

[xxii] Ibid, p. 1.

[xxiii] Modernizing the Case for God. Time Magazine, 7 April 1980, pp. 65-66. Available at:

http://content.time.com/time/magazine/article/0,9171,921990,00.html [Accessed 2nd October 2016].

[xxiv] Crick, F. (1982). Life Itself: Its Origin and Nature. London: Futura Publications, pp. 117-129.

[xxv] Hitchens, C. (2007). God Is Not Great: The Case Against Religion. New York: Atlantic Books, p. 13

[xxvi] Harris, S. (2006). The End of Faith: Religion, Terror and the Future of Reason. London: The Free Press, p. 227

[xxvii] Dawkins, R. (2006). The God Delusion, p. 20.

[xxviii] Cited in William, P. S. (2009). A Sceptic's Guide to Atheism. Milton Keynes: Paternoster, p. 41

[xxix] Ibid p. 44.

[xxx]Office for National Statistics. (2011). Religion in England Wales 2011.

[online] Available at:

http://www.ons.gov.uk/ons/rel/census/2011-census/key-statistics-for-

local-authorities-in-england-and-wales/rpt-religion.html#tab-Changing-picture-of- religious-affiliation-over-last-decade.

Accessed 1st October 2016].]

[xxxi] Biotechnology Report. Fieldwork January 2010 – February 2010. Bruxelles: TNS

Opinion & Social, p. 203. Available at:

http://ec.europa.eu/public_opinion/archives/ebs/ebs_341_en.pdf [Accessed 1st October 2016].

[xxxii] The history of atheism in China has its own complexities and cannot be equated with Western atheism. Chinese atheism is not due to Darwinism or a Dawkins type of new atheism. Atheism in China is based on a unique set of cultural, political and intellectual factors. It has to be studied on its own.

[xxxiii] Zuckerman, P. (2007). Atheism: Contemporary Numbers and Patterns. In: M. Martin, ed, The Cambridge Companion to Atheism, p. 61

[xxxiv] Ibid, p. 55.

[xxxv] WIN-Gallup International. (2012). Global Index of Religiosity and Atheism, p. 16.

Available at: http://www.wingia.com/web/files/news/14/file/14.pdf

Accessed 2nd October 216].]

الحاد کیسے غیر فطری [Unnatural] ہے؟

تصوّر کریں کہ ایک رات آپ کو داؤد کی کال آتی ہے۔ داؤد سکول کے وقت سے آپ کا ساتھی ہے جس کے ساتھ آپ سائنس کے دروس کے دوران بیٹھا کرتے تھے۔ آپ نے کئی سالوں سے اس سے بات نہیں کی، لیکن آپ کو اس کے عجیب و غریب سوالات یاد ہیں جو وہ کیا کرتا تھا۔ اگرچہ آپ اس کو ایک اچھا انسان سمجھتے تھے لیکن اس کے خیالات کے معترف نہیں تھے۔ ہچکچاتے ہوئے آپ نے اس کی کال ریسیو کرلی۔ سلام دعا کے تبادلے کے بعد وہ آپ کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دیتا ہے۔ آپ آدھے دل سے اس کی دعوت

قبول کر لیتے ہیں۔ کھانے کے دوران وہ پوچھتا ہے ”کیا میں آپ کو کچھ بتا سکتا ہوں۔“ آپ ہاں میں جواب دیتے ہیں اور وہ آپ سے کسی ایسی چیز کے بارے میں بات کرنا شروع کر دیتا ہے جس کے بارے میں آپ نے پہلے کبھی نہیں سنا: ”کیا تم جانتے ہو، ماضی یعنی جو تم نے کل (یعنی گزرے ہوئے دن)، گزرے ہوئے سال اور اسی طرح تمہاری پیدائش سے لے کر اب تک جو کچھ تم نے کیا، وہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف تمہارے دماغ کا فتور تھا۔ تو میرا سوال تم سے یہ ہے، کیا تم اس بات پر یقین کرتے ہو کہ ماضی کی کوئی حقیقت ہوتی ہے؟“ ایک عقلمند آدمی کے طور پر آپ اس کے موٴقف/رائے سے اتفاق نہیں کرتے اور جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں ”ماضی حقیقت میں موجود نہیں ہوتا، اس بات کو ثابت کرنے کے لیے تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟“

اب اس جگہ پہ آ جائیں جہاں سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا اور تصوّر کریں کہ یہ سوال پوچھنے کے بجائے آپ کھانے کا تمام وقت یہ ثابت کرنے میں لگا دیتے ہیں کہ ماضی ایک واقعی حقیقت ہے۔ آپ کس صورتِ حال کو ترجیح دیں گے؟ یقیناً آپ پہلی صورتِ حال کو ترجیح دیں گے کیونکہ آپ ان معقول لوگوں میں سے ہیں جو ماضی کو ایک اظہر مِن الشّمس حقیقت سمجھتے ہیں جیسا کہ دوسری واضح سچائیاں ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کی حقیقت کو للکارے یا ان کی حقیقت کے بارے میں سوالات اٹھائے، تو بارِ ثبوت اُسی پر ہے جس نے ان کی حقیقت پر سوال اٹھایا ہے۔

اب اسی دلیل کو ایک دیندار اور ملحد شخص کے مکالمے پر لاگو کرتے ہیں۔ ایک دیندار شخص اپنے ایک ملحد دوست کو شام کے کھانے کی دعوت دیتا ہے اور کھانے کے دوران اس کا ملحد دوست دعویٰ کرتا ہے ”تم جانتے ہو، خدا موجود ہی نہیں۔ اُس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں۔“ دیندار شخص ملحد دوست کے سوال کا

جواب دینے کے لیے خدا کی موجودگی کے دلائل کی بھرمار کردیتا ہے۔ تاہم کیا دیندار شخص نے درست طریقہ اختیار کیا؟

اس سے پہلے کہ ہم خدا کی موجودگی کے ثبوت دیں، ہمیں اس بات کا کھوج نہیں لگانا چاہیے کہ خدا کی موجودگی کے بارے میں سوال کرنا ہمیشہ سے طے شدہ فرضی سوال کیوں رہا ہے؟ یہ سوال ایسے نہیں ہونا چاہیے ''کیا خدا موجود ہے؟'' بلکہ اس سوال کو ایسے ہونا چاہیے: ''خدا کے وجود کا انکار کرنے کے لیے ہمارے پاس کیا دلائل موجود ہیں۔''؟؟؟اب مجھے غلط مت سمجھیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے پاس خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے بڑے ٹھوس دلائل موجود ہیں اور اس تحریری سلسلے میں اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں میں جس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر اللہ کے وجود کا انکار کرنے کے لیے کوئی ٹھوس دلائل موجود نہیں تو پھر ایک سمجھدار آدمی کا رب پر ایمان رکھنا لازمی بات ہے۔ نہیں تو یہ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے ماضی کی حقیقت پر سوال اٹھانے کے مترادف ہے۔ اس نقطۂ نظر سے الحاد غیر فطری ہے۔

بدیہی/عیاں بالذات سچائیاں[:Self-evident truths]

ہم بہت سارے عقائد کو واضح اور فطری طور پر سچّا سمجھتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

—— فطرت کی یکسانیت/ہمہ گیریت

—— قانونِ سبب و علل

—— ماضی کا ایک حقیقت ہونا

▬▬ ہمارے استدلال کادرست ہونا

▬▬ دوسرے ذہنوں/آراکاموجود ہونا

▬▬ ایک بیرونی دنیاکاموجود ہونا

جب کوئی ان حقائق کے مبنی بر حقیقت ہونے پر اعتراضات کرے تو ہم اندھادھند اس بات کا یقین نہیں کرلیں گے بلکہ عام طور پر سوال کریں گے کہ "آپ کے پاس ان حقائق کو رد کرنے کے لیے کیا دلائل ہیں؟" یہ حقائق بالکل واضح ہیں کیونکہ یہ ان خصوصیات کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔

1۔آفاقی[Universal] : یہ کسی خاص تہذیب کا خاصہ نہیں ہیں بلکہ بین الثقافتی ہیں۔

2۔جبلی[Untaught]: ان کی بنیاد معلومات کی منتقلی پر نہیں۔ یہ آپ کے تجزیے اور حواس کے علاوہ حاصل کیے جانے والے علم کی طرح حاصل نہیں کیے گئے۔ سادہ الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اُس طرح حاصل نہیں کیے گئے جس طرح علم حاصل کیا جاتا ہے۔

3۔فطری[Natural]: یہ انسانی نفسیات کی فطری کارگزاری کے ذریعے وجود میں آئے ہیں۔

4۔وجدانی/بدیہی[Intuitive] : دنیا کی سادہ اور آسان ترجمانی۔

ہم مندرجہ بالا خصوصیات کو ماضی کے حقیقت ہونے کے یقین پر لاگو کر کے دیکھتے ہیں۔ماضی کا مبنی بر حقیقت ہونا ایک واضح سچائی ہے کیونکہ یہ یونیورسل ہے۔یہ جبلی، قطعی فطری اور بدیہی ہے۔یہ ایک ہمہ گیر سچائی ہے کیونکہ تقریباسب ہی کلچر ماضی پر یقین رکھتے ہیں اس طرح کہ جو آج ماضی ہے وہ کبھی حال

تھا۔ماضی پر یقین کی کوئی تعلیم نہیں دی جاتی کیونکہ جب کوئی پہلے اس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے کہ ماضی وہی کچھ ہے جو حقیقی زندگی میں پیش آ چکا ہے، یہ کسی نے ان کو پڑھایا یا سکھایا نہیں۔ کسی کو بھی پرورش کے دوران والدین کی طرف سے یہ نہیں سکھایا جاتا کہ ماضی ایک حقیقت تھا۔ یہ یقین وہ ذاتی تجربہ سے حاصل کرتے ہیں۔ماضی کا حقیقت ہونا فطری بھی ہے۔وہ تمام لوگ جن کے ہوش و حواس قائم ہیں،اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ماضی ان چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے جو حقیقی زندگی میں پیش آ چکی ہوتی ہیں۔آخر میں یہ یقین کہ ماضی وہی کچھ ہے جو کبھی نہ کبھی ہمیں پیش آ چکا ہے تو یہ ہمارے ذاتی تجربات کی آسان ترین ترجمانی ہے اور زمین کی فطری سمجھ بوجھ پر مبنی ہے۔ماضی کو فریبِ نظر گردانننے سے جتنے مسائل حل ہوتے ہیں،اس سے کہیں زیادہ اور مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

خدا:ایک بدیہی سچائی[God: a self-evident truth]

جس طرح ماضی ایک نہ جھٹلانے والی حقیقت ہے اسی طرح خدا کی ذات بھی اظہر من الشمس ہے۔اس تحریر میں خدا سے مراد اس کائنات کے بنانے والے یا تخلیق کار اور ایسی ذات کے ہیں جو انسانی اور کسی اور چیز سے ماوراہے. کسی خاص مذہب کا نہیں بلکہ خدا کا وہ تصور جو کم و بیش ہر مذہب، ثقافت اور قوم میں مشترک و موجود رہا ہے، اس بحث سے یہ واضح ہو گا کہ خدا کا تصور کیسے آفاقی، وجدانی اور فطری ہے نہ کہ ایک سوچا سمجھا عملی تصور یا نظریہ۔

1۔آفاقی: [Universal]

یہ تصور کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے بنیادی طور پر ہر تہذیب اور ثقافت میں موجود رہا ہے. جس طرح قانونِ علت اور یہ تصور کہ باقی لوگ بھی عقل رکھتے ہیں تقریباََ ہر تہذیب میں موجود رہا ہے اسی طرح تصورِ خدا تہذیب، قوم، رنگ نسل سے ماورا ہے اور ہمہ گیر ہے. خدا کا تصور یا کسی مافوق الفطرت کا تصور آفاقی ہے نہ کہ کسی ایک تہذیب میں پروان چڑھنے والی اختراع۔ قطع نظر اس کے کہ دنیا میں دہریوں اور ملحدوں بھی موجود رہے ہے مگر اس بات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ ہر دور میں تصورِ خدا کسی نہ کسی ہیئت میں موجود رہا ہے۔ خدا کے وجود پر ایک بین ثقافتی اجماع یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ ایک عالمگیر سچائی ہے۔. یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تصورِ خدا کے حامل لوگوں کی تعداد ملحدوں سے ہر دور میں زیادہ رہی ہے۔

2۔ جبلی[:Untaught]

آفاقی حقائق کو کسی سے سمجھنے یا سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاََ سپیگھٹی (ایک جدید مذہب کا منفرد خدا) کے بارے میں جاننے کے لئے مغربی اور خصوصاََ اطالوی ہونا ضروری ہے. میں صرف سپیگھٹی پر غور و فکر کر کے اس کے بارے میں آگاہی حاصل نہیں کر سکتا. جبکہ دوسری طرف یہ جاننے کے لیے کہ کسی بھی چیز کا خالق ہونا ضروری ہے، آپ کو کسی کلچر یا ادارے کی ضرورت نہیں ہے. اسی لئے ماہرِ عمرانیات کا ماننا ہے کہ اگر دہریت پسند لوگوں کے بچوں کو کسی ویران جزیرے پر چھوڑ دیا جائے تو وہ کچھ عرصے بعد یہ تصور رکھنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس ویران جزیرے کا بھی کوئی خالق ہے.(1) مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں میں خدا کے تصور میں فرق ضرور ہو سکتا ہے لیکن خالق کا تصور ضرور ملتا ہے کہ یہ غور و فکر کا قدرتی نتیجہ ہے.

کچھ ملحدین کہتے ہیں کہ خدا کو ماننے اور سپیگھٹی عفریت کے ماننے میں کوئی فرق نہیں، یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ آفاقی حقائق کسی خارجی علم کے محتاج نہیں ہوتے۔ سپیگھٹی اور عفریت کا تصور خارجی علم کا محتاج ہیں اور ان کو محض غور و فکر یا فطری طور پر نہیں سمجھا جاسکتا۔ لہٰذا سپیگھٹی عفریت کوئی آفاقی حقیقت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم موجودہ بحث سے ہٹ کر بھی دیکھیں تو ہم کو خدا کے ہونے کے بے شمار دلائل ملیں گے جبکہ سپیگھٹی عفریت کے بارے میں نہ ہونے کے برابر۔

3۔ فطری [:Natural]

یہ انسانی سوچ کا ایک فطری پہلو ہے کہ وہ ایک ماورالفطرت خالق کا تصور رکھتی ہے۔ یہ نظریہ کہ خدا ایک روشن حقیقت ہے ہمیشہ سے اسلامی تاریخ میں علمی مباحث کا مرکز رہا ہے۔ مشہور عالم امام ابن، تیمیہؒ کہتے ہیں کہ " خالق کا تصور تمام لوگون کے دلوں میں مضبوطی سے گڑھا ہوا ہے اور یہ انسان کے وجودیت کے لئے ایک لازم و ملزوم امر ہے "(2)۔ بارھویں صدی کے مشہور عالم الراغب الصفہانیؒ فرماتے ہیں کہ روح میں خالق کا علم قدرتی طور پر رکھ دیا گیا ہے۔ نہ صرف اسلامی روایات میں بلکہ مختلف شعبوں میں کی جانے والی بے شمار تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہم فطری طور پر اس کائنات کو ایک سوچی سمجھی اور مربوط و منظم تخلیق سمجھتے ہیں نہ کہ کسی حادثاتی اتفاق کا نتیجہ !(3)

نفسیاتی ثبوت [:Psychological evidence]

مشہور ماہرِ تعلیم اولیویز پیٹروچ ((Olivera Petrovich نے حیوانات اور نباتات پر تحقیق کے دوران اس بات کا بخوبی مشاہدہ کیا ہے کہ اس بات کا کہیں 7 گنا زیادہ امکان ہے کہ وہ بچے جنہوں نے اسکول

کی شکل نہ دیکھی ہوں یہ بات کہیں کہ یہ دنیا خدا نے بنائی ہے بجز ان بچوں کے جو اسکول گئے ہوں (4).پیٹر وچ کے مشہور انٹر ویوز اور میرے اپنے خط و خطابت میں بار بار یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ عقیدہ کہ ایک مافوق الفطرت خدا ہے جس نے یہ ساری دنیا تخلیق کی ہے' فطرت سے کہیں زیادہ قریب تر ہے اور دہریت انسان کا ایک اپنا بیان کردہ نظریہ ہے جو فطرت سے بالکل میل نہیں کھاتا.(5) پیٹر وچ 2017ء میں ایک کتاب شائع کرنے جارہی ہے جو اس موضوع پر مزید روشنی ڈالے گی ۔اس کا عنوان ہے:

"Natural Theological understanding from childhood to adulthood".

مشہور ماہرِ نفسیات پال بلوم (Paul Bloom) اورادراکی نفسیات (cognitive psychology) پر کی گئی جدید تحقیق کی روشنی میں کہتے ہیں کہ مذہبی عقائد کے دو پہلو ایک یہ عقیدہ کہ کوئی خالق یا تخلیق کار ہے اور دوسرا یہ تصور کہ روح اور جسم انسان کے دو جدا مگر لازم وملزوم چیز ہیں' بچوں میں فطری طور پر عود کرتے ہیں.(6)

ڈیبورا کیلمین (Deborah Kelemen) نے اپنے ایک مضمون ''کیا بچے وجدانی طور پر خداپرست ہوتے ہیں؟'' میں تحقیق پیش کی کہ بچے فطری طور پر قدرتی اشیاء کو مقصدیت کے تناظر سے دیکھتے ہیں. یہ صرف وجدانی خداپرستی کے ثبوت کی طرف اشارہ ہے،اس ضمن میں مزید تحقیق کی گنجائش ہے۔مقالے میں مختصراً ''خدا کے تصور کے بارے میں ڈیبورا یوں رقم طراز ہے:

"ادراکی ترقی کی جدید ریسرچ میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ بچے پانچ سال کی عمر میں قدرتی اشیاء یا چیزوں کی تخلیق کو کسی مافوق الفطرت قوت سے منسوب کرتے ہیں اور ان مظاہر قوت کو تخلیق شدہ سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں. علاوہ ازیں چھ سے دس سال کے بچوں کی اسائنمنٹس یہ ثابت کرتی ہے کہ بچوں کا فطرت کو کسی مقصد یا ارادے سے جوڑنا اور منسوب کرنا ان کے ماورالفطرت اور غیر انسانی علتوں یا قوتوں کے تصور سے منسلک ہے لہٰذا ان تمام تحقیقات کے نتائج کی روشنی میں بچوں کے مندرجہ بالا رویوں کو "وجدانی خدا پرستی کہا جاسکتا ہے۔"(7)

ایک تحقیق جو حال ہی میں Elisa Jarnefelt, Caitlin F. Canfield and Deborah Keleme نے "ملحد کا منتشر ذہن: مختلف گروہ کے ملحد نوجوانوں میں فطرت کو تخلیق شدہ سمجھنے کے وجدانی خیالات اور عقائد" کے عنوان سے پیش کی۔ اس میں یہ نتیجہ نکالا گیا کہ فطرت کو تخلیق شدہ سمجھنا اور دیکھنا ایک فطری رویہ ہے.(8)

یہ نتائج تین تحقیقی مطالوں اخذ کئے گئے ہیں جن میں سے پہلی تحقیق شمالی امریکہ سے تعلق رکھنے والے 352 افراد شامل تھے ان میں مذہب کے نہ ماننے والے اور ماننے والے دونوں طرح کے لوگ شامل تھے. اس مطالعے کے دوران مختلف کام انجام دیئے گئے جن سے زیرِ مطالعہ لوگوں کا فطری میلان جانچنا مقصود تھا جس میں ایک سرعتی تخلیقی کام تھا جس میں ان افراد کو 120 تصویریں دکھائی گئیں اور انھوں نے تیزی سے کی بورڈ سے "یس یا نو" دبا کر یہ بتانا تھا کہ آیا تصویر میں موجود چیزوں کو کسی فرد یا ذات نے کسی مقصد کے تحت بنایا یا تخلیق کیا یا نہیں۔(9) دوسرے مطالعے میں 148 لوگ ایسے شامل تھے جن کو ملحد ین اور انکی تنظیم یا سوسائٹی کی ای میل لسٹ سے چنا گیا تھا ان کا تعلق بھی شمالی امریکہ سے تھا. انہیں بھی اسی

طرح کا تیز ٹاسک دیا گیا۔(10)اسی طرح تیسرے مطالعے کے لئے فن لینڈ سے 151 افراد چنے گئے جو کہ ملحد تھے اور طلبہ تنظیموں سے وابستہ تھے. انکو بھی اسی طرح کا تخلیقی ٹاسک دیا گیا۔ان تحقیقی مطالعوں سے نہایت حیران کن نتائج سامنے آئے.(11)ماہرین نے ان نتائج پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ ملحد بھی چیزوں کو کسی مقصد کے تحت تخلیق کیا ہوا یا بنا ہوا سمجھتے ہیں:

''پہلے دو کئے گئے مطالعوں کی طرح تیسرے تحقیقی مطالعے سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب فن لینڈ کے ملحدوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ فطری طور پر تیزی سے جاندار یا غیر جاندار اشیاء یا مظاہرِ قدرت کو دیکھیں تو وہ ان کو ماورالفطرت ذات کی مقصدیت سے بھرپور تخلیق کا ثمر سمجھتے ہیں.اس ضمن میں اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ فن لینڈ میں ملحدانہ افکار کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی وہاں پر خدا پرستی ان کی ثقافت کا حصہ ہے، جیسا کہ امریکہ میں.

دلچسپ بات یہ ہے کہ فن لینڈ کے ملحدین، شمالی امریکہ کے ملحدین کی نسبت اپنے مندرجہ بالا فطری داعیے کو جبراََ دبانے میں زیادہ ناکام ثابت ہوئے ہیں. جس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ صرف معاشرتی یا ثقافتی طور پر موجود خدا پرستی کا نظریہ ہی لوگوں کو مظاہرِ فطرت کو کسی مقصدیت کے لیے ہونے والی تخلیق سمجھنے پر مائل یا مجبور نہیں کرتا، بلکہ یہ ایک فطری طور پر انسان کے شعور میں پیدا ہونے والا نظریہ یا جذبہ ہے. (12)

عمومی طور پر اس تحقیق سے ہمیں شواہد ملتے ہیں کہ الحاد ذہنی طور مشقت طلب ہے(13)اور عام انسان فطری طور پر فطرت اور اسکے اندر موجود اشیاء اور مظاہر کو ایک تخلیق شدہ حقیقت کے طور دیکھتا

ہے.(14)دوسرے لفظوں میں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ الحاد ایک غیر فطری رویہ اور فطرت کو تخلیق شدہ سمجھنا ہی ہمیں انسان بناتا ہے، خدا پرستی انسان کے اندر پیدا ہونے والا فطری رویہ ہے. بہر حال جیسا کہ ہر تحقیق میں کچھ سوالوں کے جواب نہیں ملتے اسی طرح یہ سوال کہ انسان کے اندر اوائل عمر میں یہ وجدانی خیالات کیوں پیدا ہوتے ہیں، اور ان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ کا جواب ابھی باقی ہے۔(15)ابھی ذہنی،ادراکی اور تشکیلی نفسیات میں تحقیق کی بہت ضرورت ہے جس سے حتمی نتائج اخذ کئے جاسکیں مگر مندرجہ بالا تحقیقات خدا پرستی کو فطری سمجھنے کے نظریئے کو بھرپور تقویت دیتی ہے.

کچھ نقاد ایسی تحقیق کا حوالہ دے سکتے ہیں جس کے مطابق مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بچوں کا حقیقت اور فسانے میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن یہ تحقیق اوپر پیش کردہ تحقیق کو رد نہیں کر سکتی کیونکہ یہ صرف مذہبی بیانیوں پر کی گئی ہے نہ کہ چیزوں کے لیے کسی خالق یا تخلیق کار کے ضروری ہونے پر ۔(16)اس ضمن میں یہ ذکر کرنا ضروری ہوگا کہ جن تحقیقات کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے اس کے تنائج کسی ایک ثقافت یا نظریئے کے حامل لوگوں کے بارے میں نہیں ہیں۔اس سے قطع نظر کہ تحقیق میں حصہ لینے والوں میں مذہبی تھے یا غیر مذہبی' وہ مذہبی رویے کی طرف ہی مائل نظر آئے۔

ایک اور اعتراض کے مطابق جیسا کی یہ تحقیق بتاتی ہے کہ الحاد نفسیاتی طور پر مشقت طلب ہے تو اس سے یہ کہا جا سکتا ہے چونکہ اس کے لئے عقل اور سوچ کی قوت زیادہ درکار ہوتی ہے لہٰذا یہ عقلی طور پر زیادہ مضبوط حیثیت رکھتا ہے. یہ دلیل نہادت بودی ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ الحاد اس کائنات کے بارے میں غلط مفروضوں پر مبنی ہے. "(تفصیل اگلی تحاریر میں آئے گی)اور ان غلط مفروضوں کی بناء پر الحاد انسانوں کی فطری اور ذہنی صلاحیتوں پر ایک بوجھ لاد دیتا ہے۔

میں نے یہاں تمام ریسرچ کا ذکر نہیں کیا کہ اس سے بحث بہت پیچیدہ ہو جاتی. بہت سی متضاد تحقیقات اور بھی موجود ہیں لیکن وہ کہیں کم اور کمزور دلائل رکھتی ہیں۔ مندرجہ بالا بحث کا بنیادی مقصد جدید تحقیقات سے سامنے والے اس ٹرینڈ کی نشاندہی کرنا ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ ''خدا پرستی کا عقیدہ ایک فطری رویہ ہے''۔

علم عمرانیات اور بشریات پر مبنی دلائل (Sociological and anthropological evidence):

پروفیسر جسٹن بیریٹ (Justin Barrett) نے اپنی کتاب ''پیدائشی خدا پرست: بچوں کے مذہبی عقیدوں کی سائنس'' میں بچوں کے رویوں اور دعوؤں پر تحقیق پیش کی ہے. انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بچے ایک ''فطری مذہب'' پر یقین کرتے ہیں ان کے اندر قدرتی طور پر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ماورالفطرت خالق ہے اور وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''بچوں کی بڑھتی ہوئی ذہنی وادراکی صلاحیتوں اور ماورالفطرت ذات پر عقائد پر سائنسی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ بچے فطری طور پر وہ ذہن بناتا ہے جو ماورالفطرت ذات یا خدا کے وجود پر ایمان رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے، پیدائش کے ایک سال بعد ہی بچے عوامل اور غیر عوامل میں فرق کرنا شروع کر دیتے ہیں وہ ہر چیز کے پیچھے کارفرما عوامل کو قدرتی طور پر ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں. چاہے اس کے بارے میں موہوم سی دلیل ہی موجود کیوں نہ ہو، پہلے سال کے ختم ہونے سے قبل ہی وہ یہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ کوئی شخصیت نا کہ قدرتی طاقتیں انتشار سے کسی منظم حالت کو ترتیب دینے کا باعث بنتی ہے۔۔ فنکشن اور مقصد کو دیکھنے کا

یہ رجحان اور یہ سمجھ بوجھ کہ مقصد اور ترتیب ایک شعور سے ہی تشکیل پاتی ہے بچوں کو ابتداء ہی سے اس قابل بناتا ہے کہ وہ اس قطرتی فنامنا کو مقصد کے تحت تخلیق شدہ سمجھیں؛ یہ سوال کہ خالق کون ہے؟، بچے سمجھتے ہیں کہ انسان کم از کم اچھے امیدوار نہیں ہیں . یہ خدا ہی ہو سکتا ہے جو اس اہلیت پر پورا اترتا ہے. اسی لئے میں کہتا ہوں کہ بچے خدا پرست پیدا ہوتے ہیں جسے میں نے ''فطری مذہب'' کہا ہے۔(17)

4۔وجدانی/بدیہی[: Intuitive]

خدا کا وجود اس کائنات کی وجدانیت سے بھرپور تشریح ہے،اسکے لئے زائد ذہنی قلابازیوں اور موشگافیوں کی چنداں ضرورت نہیں۔انسان فطری طور پر چیزوں کو ان کے علل سے منسلک کرتا ہے اور پوری کائنات ی بھی ان میں سے ایک ہیں. تمام وجدانی خیالات ضروری نہیں کہ صحیح ہو مگر پہلے سے موجود وجدانی خیالات کے رد کے لئے ٹھوس شواہد ہونا بھی ضروری ہیں۔ جیسے اگر کوئی شخص اس کائنات میں نظمِ ہم آہنگی اور ربط دیکھتا ہے تو اس کا وجدانی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی تخلیق کار ہے جس نے اس نظم وضبط کو تشکیل دیا۔ اس شخص کے اس تصور کے رد کے لئے ٹھوس شواہد پیش کرنے ہونگے جو اس الگ وجدانی تصور کو ثابت کر سکیں۔

خلاصہ یہ کہ خدا، خالق، تخلیق کار، ماورالفطرت وقدرت ذات پر قدرتی طور پر عقیدہ رکھنا ایک ناقابل تردید اور بدیہی حقیقت ہے. یہ آفاقی، وجدانی اور قدرتی تصور ہے جو کسی فلسفیانہ سوچ کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ کسی درسگاہ کا مرہونِ منت ہے. اس حقیقت کی روشنی میں صحیح سوال یہ نہیں کہ کیا خدا ہے؟ بلکہ سوال یہ ہے کہ ''کیا خدا کا انکار کیا جا سکتا ہے؟'' یہ وہ سوال ہے کہ جو الحاد کی بنیادیں دیتا اور یہ ثابت کرتا ہے کہ الحاد غیر

فطری رویہ ہے۔ جو ایک ایسی ناقابل تردید حقیقت کو جھٹلاتا ہے جو سورج کی طرح روشن ہے ثبوت اسی کے ذمے ہیں۔ جیسے کوئی شخص کہے کہ ماضی کی کوئی حقیقت نہیں اور باقی لوگ دماغ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو معاشرہ اس سے اس تصور کا ثبوت مانگے گا اس طرح ملاحدہ کو بھی کائنات کے لیے خالق کی موجودگی کے تصور کو جھٹلانے کے لیے ثبوت پیش کرنا ہونگے۔

فطری رجحان- فطرہ[:The innate disposition:fitrah]

اسلامی الہیات میں 'عیاں بذات حقیقت' کا تعلق فطرت سے ہے. فطرت کے لفظ کی عربی جڑف طر ہے جو کہ فطرن، فطرہ جیسے الفاظ کا ماخذ ہے. جن کا مطلب کسی پیدا کی گئی چیز کے ہیں. عربی لفظ فطرۃ کے لفظی معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے اندر کوئی پیدا کی گئی چیز کے ہیں. دینی طور پر فطرت اس علم کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدائشی طور پر عطا فرمایا ہے، جو ہمیں اللہ تعالیٰ کو تلاش کرنے اور اسکی عبادت پر اکساتا ہے (18) اس بات کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے۔ "ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔" (19)

یہ نبوی روایت بتاتی ہے کہ ہر انسان اس قدرتی علم کے ساتھ پیدا ہوتا ہے لیکن اسکی صحبت جیسے کے والدین/ معاشرہ اسے بدلتا ہے. یہاں تک کے وہ فطرت چھوڑ کر دیگر اعمال اور یقین اپنا لیتا ہے. بیشمار علماء فطرت کے تصور کو زیر بحث لاتے رہے ہیں، جیسے کہ امام غزالی فطرت کو خدا کی موجودگی اور اسکے معبود ہونے کے سچ تک پہنچنے کا ذریعہ بتاتے ہیں. وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کا خدا ہونا ہر انسان شعور کی گہرائیوں میں موجود ہوتا ہے". (19) امام ابن تیمیہ فطرت کو دائمی یادداشت بتاتے ہیں جو اللہ نے اپنی

مخلوق میں پیدا فرمائی ہے، ''فطرت ایک کامل خدا کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے، اور یہ علم دائمی، ضروری اور ظاہر ہے'' (20)

صحبت اور ماحول کے اثرات فطرت کو میلا یا تباہ کر سکتے ہیں. یہ اثرات ، جیسا کہ انبیا اشارہ کرتے ہیں، والدین، معاشرے یا تعلقاتی دباؤ سے تعلق رکھتے ہیں. یہ اثرات فطرت کو میلا کر دیتے ہیں اور انسان کو حق جاننے سے روکتے ہیں. امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ جب کسی شخص کی فطرت میلی ہو جاے تو پھر خدا کو پہچاننے کے لئے اسے دوسری نشانیوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے. ''خدا کی موجودگی اور اسکا کمال ایک قدرتی امر ہے اس کے لئے جسکی فطرت بگڑی نہ ہو۔ فطری ادراک کے علاوہ اس کے سامنے دوسری نشانیاں بھی ہوتی ہیں اور اکثر جب فطرت میں بگاڑ آجاے تو اکثر لوگوں کو ان دوسری نشانیوں کی ضرورت پڑتی ہے'' (21)

ان دوسری نشانیوں میں عقلی دلائل بھی ہو سکتے ہیں. امام ابن تیمیہ خدا کی موجودگی کے ثبوت میں عقلی دلائل کے حق میں نہیں تھے. وہ فطرت کو ہی خدا کی پہچان کا ذریعہ گردانتے تھے. لیکن انہوں نے عقلی دلائل کو بالکل چھوڑا نہیں بلکہ صرف انہیں جو اسلامی تعلیمات کے مطابق نا ہوں. (2223,)

اسلامی علم معرفت کی نظر سے یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ کے ہونے کا یقین صرف نشانیوں کے ہونے یا خیالی تصور یا پھر سائنسی نشانیوں سے نہیں ہو سکتا. بلکہ یہ نشانیاں صرف اس کی فطرت کو صاف کرتی ہیں تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کو پہچان لے۔ اللہ کی موجودگی اور اسی کا معبود ہونا فطرت کو معلوم ہوتا ہے، بیرونی اثرات اسکو آلودہ کر دیتے ہیں. عقلی دلائل اسی بات کی یاددہانی کے لیے ہوتے ہیں جو ہم پہلے سے جانتے ہیں

۔اس بات کو واضح کرنے کے لئے ایک مثال پیش ہے۔ فرض کریں میں اپنی والدہ کے پرانے سامان کی صفائی کر رہا ہوں. صفائی کے دوران پرانے بیگ ہٹاتے اور فضول چیزیں سمیٹتے مجھے اپنا پسندیدہ کھلونا مل جاتا ہے. وہ چیز دوبارہ میرے ذہن میں آجاتی ہے جسے میں پہلے سے جانتا تھا۔! میں کہتا ہوں ''او شکر ہے، مجھے میرا کھلونا مل گیا، یہ میرا پسندیدہ تھا''. اللہ تعالیٰ کی پہچان اور معرفت بھی کچھ اسی طرح ہے. عقلی دلائل روحانی و ذہنی بیداری کے لیے کام کرتے ہیں اس علم کو جاننے کے لئے جو کہ ہماری فطرت میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔

فطرت کا مشاہدہ باطنی غور و فکر سے بھی ہو سکتا ہے۔ قرآنِ پاک گہرے غور و فکر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ''ہم اسی طرح تمام آیات کو سمجھ داروں کے واسطے صاف صاف بیان کرتے ہیں۔(7:32) یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں (13:3) کیا یہ بغیر کسی (پیدا کرنے والے) کے خود بخود پیدا ہو گئے ہیں؟ یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ کیا انہوں نے ہی آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ یہ یقین نہ کرنے والے لوگ ہیں۔(52:35,36)

اسلامی تصورِ تعلیم عقلی دلائل کو ذریعہ سمجھتا ہے نہ کہ مقصود بالذات۔ یہ فطرت کے رموز تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔ اس لیے یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ راہنمائی خدا کی طرف سے آتی ہے، اور عقلی دلائل کی کوئی مقدار کسی کے دل کو اسلام کی حقانیت پر مطمئن نہیں کر سکتی۔ خدا تعالیٰ نے اس بات کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ ''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہے ہدایت کرتا ہے''(28:56)۔ راہنمائی ایک روحانی معاملہ ہے اور یہ خدا کے علم و فضل پر مبنی ہے۔ اگر خدا کی رضا ہو کہ کسی کو عقلی دلائل کے ذریعے ہدایت عطا ہونی ہے تو کوئی اس شخص کے لیے اس امر کو روک نہیں سکتا۔

البتہ اگر خدا کے ہاں کسی کے متعلق یہ فیصلہ ہو جائے کہ وہ ہدایت کے قابل ہی نہیں تو جتنے بھی مدلل دلائل لائے جائے، وہ شخص حق کو قبول نہیں کرے گا۔

حاصل یہ کہ خدا پر ایمان ایک عیاں بذات حقیقت ہے۔ جیسا کہ اس جیسی تمام حقیقتوں کے ساتھ ہوتا ہے، جب کوئی انکا انکار کرتا ہے، دلیل اس کے ذمے ہوتی ہے۔ خدا پر ایمان اسی وقت قابل اعتراض ہو سکتا ہے جب کہ اس کے نہ ہونے کا کوئی ثبوت ہو۔ یہ کتاب (دی ڈیوائن ریلیٹی) دکھائے گی، ملحدین کے پاس جو چند اعتراضات ہیں وہ کتنے کمزور اور فلسفیانہ طور پر بودے ہیں۔ (ابواب ۱۱ اور ۱۲ ملاحظہ فرمائیں)۔ خدا پر ایمان کا عیاں بذات حقیقت ہونا خود قرآن میں ۱۴۰۰ پہلے سے مذکور ہے:

"کیا حق تعالیٰ کے بارے میں تمہیں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔" (14:10)

اس باب کو ختم کرتے ہوئے اسلامی اسکالر محمد صالح فرفر بیان کرتے ہیں کہ خدا پر ایمان عین فطری عمل ہے:

"بے شک اگر کوئی شخص اپنی ذات میں اور اپنے ارد گرد دنیا میں تفکر کرے تو پہلا احساس کسی عظیم ہستی کے موجود ہونے کا ہوتا ہے جو اس دنیا پر حاکم ہے، جس کے قبضہ قدرت میں زندگی اور موت، تخلیق و نیست، حرکت و سکوت اور ہر طرح کی لطیف تبدیلیاں ہیں جو یہاں رونما ہو رہی ہیں۔ چنانچہ، انسانیت اس حقیقت کو محصوص کرتی ہے اور اس پر ایمان رکھتی ہے، چاہے وہ اس احساس کا کوئی ثبوت دے سکے یا نہ دے سکے۔ یہ انسانیت کا عمومی بدیہی رویہ ہے، اور یہی ایک بہت ہی مضبوط اور ٹھوس دلیل ہے۔ مزید برآں، ہم اپنے اندر محبت، رحم، نفرت، شوق اور ناپسندیدگی جیسے جذبات محسوس کرتے ہیں، کیا ثبوت ہے

کہ یہ جذبات موجود ہیں ؟ حالانکہ یہ ہمارے اندر موجزن ہیں۔ کیا کوئی شخص اپنے احساسات سے بڑھ کر کوئی ثبوت پیش کر سکتا ہے، ان جذبات کے ہونے کا، حالانکہ یہ کسی شبہ کے بغیر موجود ہیں۔ ایک تیزی اور تکلیف محسوس کرتا ہے، لیکن وہ کوئی ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہے سوائے اس کے کہ وہ بیان کر سکے کہ وہ کیا محسوس کر رہا ہے۔ کسی شک کے بغیر اس کا یہ عمل ایک فطری طریقہ ہے، جس پر انسانیت کی تخلیق ہوئی ہے، یہ وہ گہرے احساسات ہیں جو اس کے اندر گھر کیے ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے اندر یقیناً بے مقصد یا بے کار نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک فطری سچ ہیں جو دنیا سے متعلق ہیں۔"(24)

حوالہ جات:

1. BBC Today. (2008). Available at: http://news.bbc.co.uk/today/hi/today/newsid_77 45000/77 455 14.stm [Accessed 1″ October 2016].

2. Ibn Taymiyyah, A. (1991) Dar’ Ta’arud al-‘Aql wan-Naql. 2nd Edition. Edited by Muhammad Rashad Salim. Riyadh, Jami’ah al-Imam Muhammad bin Saud al-Islamiyah. Vol 8, p. 482.

Al-Isfahani, Al-Raghib. (2009) Mufradat al-Qur' an al-.3 Karim. 4th Edition. Edited by Safwan Dawudi. Beirut: al-Dar al-Shamiyya, p. 640.

Petrovich, O. (1997). Understanding the Non-Natural .4 Causality in Children and Adults: A Case Against Artificialism. Psyche en Geloof, 8,151-165.

Zwartz, B. (2008). Infants 'Have Natural BeliefIn God'. .5 Available at: http://www.theage.com.au/national/infants-have-natural-belief-in-god-20080725-3l3b.html [Accessed 4th October 2016].

Bloom, P. (2007). Religion is Natural. Developmental .6 Science, 10, 147-151.

Kelemen, D. (2004) Are Children "Intuitive Theists"? .7 Reasoning About Purpose and Design in Nature. Psychological Science, 15(5),295-301.

Jarnefelt, E., Canfield, C. F. & Kelemen, D. (2015). The .8 Divided Mind of a Disbeliever: Intuitive Beliefs About Nature as Purposefully Created Among Different Groups of Non-Religious Adults. Cognition 140:72-9.

Ibid. 74..10

Ibid..11

Ibid. 79..12

Ibid. 81..13

Ibid. 82..14

Ibid. 83..Ibid. 84..15

Corriveau. K. H .• Chen. E. E. and Harris. P. L. (20 .16 15).]udgments About Fact and Fiction by Children From Religious and Nonreligious Backgrounds. Cogn Sci. 39: 353-382. doi: 10.1 11 1/cogs.12138.

Barrett.]. L. (2012) Born Believers: The Science .17 ofChildren’s Religious Belief New York: Free Press. pp. 35-36.

AI-‘Asqalani. A. (2000) Fath al-Bari Sharh Sahih al-.18 Bukhari. 3rd Edition. Riyadh: Dar al-Salam. p. 316.

Narrated by Muslim..19

AI-Ghazali. (2007) Kimiya-e Saadat: The Alchemy of .20 Happiness. Translated by Claude Field. Kuala Lumpur: Islamic Book Trust. p. 10.

Ibn Taymiyyah. A. (2004) Majmu’ al-Fatawa Shaykhul .21 Islam Ahmad bin Taymiyyah. Madina: Mujama’ Malik Fahad. Vol 16. p. 324.

Ibid. Vol 6. p. 73..22

Ibn Taymiyyah. A. (1991) Dar’ Ta’arud al-‘Aql wan-.23 Naql. Vol 7. p. 219.

Farfur. M. S. (2010) The Beneficial Message and The .24 Definitive Proofin The Study of Theology. Translation and notes by Wesam Charkawi. Auburn: Wesam Charkawi. pp. 85-86. .

Click to share on Facebook (Opens in new window)Click to share on Twitter (Opens in new window)Click to share on LinkedIn (Opens in new window)Click to share on Pinterest (Opens in new window)

Allah ka wujood aur :ٹیگز.(اکیڈمک)خدائی حقیقتOctober 17, 2018 in insani fitrat, Allah ka wujood kaisy fitri aur ilhaad kaisy gair fitri hai, Book 'The Divine reality' Urdu Translation, God and Sociological and anthropological evidence, How atheism is unnatural? ,الحاد کیسے غیر فطری ہےHamza andreas Hamza andreas, How Concept of God is natural, Human nature and God, khuda ka tassawur aur fitrat, khuda ka

tassawur aur iski tareekh, kia Khuda ka tassawur mafrooza hai, The divine Reality Direct download link, The divine reality Urdu tarjuma، انسان میں خدا کا تجسّس کیوں ہے؟, جدید الحاد کا علمی محاکمہ, حمزہ اینڈر ئیس کی کتاب کا ترجمہ, خدا کا تصور اور انسانی فطرت, خدا کا تصور کیسے فطری ہے, خدا کا تصور کیسے فطری ہے حمزہ اینڈر ئیس, خدا کا عقیدہ فطری ہے یا الحاد ؟ ایک جائزہ, خدا کا وجود اور جدید فلسفہ, خدا: ایک بدیہی سچائی [God: a self-evident truth], What is speghetti سپیگھٹی monster, شیخ حمزہ اینڈریس کی کتابیں, کیا خدا کا تصور ایک مفروضہ ہے, وجود خدا اور علم عمرانیات اور بشریات پر مبنی دلائل, وجود خدا کے نفسیاتی دلائل

تصور کریں آپ ایک صبح اٹھتے ہیں اور اپنا ناشتہ بنانے باورچی خانے کی طرف جاتے ہیں. وہاں آپ کو ڈبل روٹی کے دو سنکے ہوئے ٹکڑے آپکی من پسند چاکلیٹ لگے ہوئے ملتے ہیں. یہی نہیں بلکہ چاکلیٹ کچھ یوں لگی ہوتی ہے کہ ہر ٹکڑے پر 'آئی لو یو' لکھا نظر آتا ہے۔ آپکو خوشگوار حیرت ہو گی، لیکن کیوں؟ کیا آپ نے یہ سوچا کہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے خود ہی سنک گئے اور چاکلیٹ سے اتفاقیہ طور پر محبّت کے الفاظ لکھے گئے، سب کچھ خود ہی اور اتفاق سے ہو گیا؟ یا آپ کی سوچ اپنے ہمسفر کی طرف جاتی ہے کہ وہ پہلے اٹھ کر یہ سب کر گئی. اس زمین پر رہنے والا ہر باشعور انسان اس کی نفی ہی کرے گا کہ یہ سب بغیر کسی ارادے یا سبب کے ہو سکتا ہے، اندیکھے امکانات اس سارے واقعے کی تفصیل کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔

کائنات بھی کچھ مختلف نہیں ہے ، اسکا آراستہ اور انتہائی درست موجوداتی ڈھانچہ [precise cosmic architecture] اس کی بامقصد وضع یا ڈیزائن کی نشاندہی کرتا ہے. یہ عالم زندگی کے وجود کو جلا بخشنے کے لئے نپے تلے قوانین رکھتا ہے، اور اسے ایسے ایک مخصوص انداز میں ترتیب دیا گیا ہے جس سے انسانی زندگی پنپ سکے۔ اگر ان قوانین میں اختلاف ہوتا یا کائنات ستاروں، سیاروں اور دوسری چھوٹی بڑی طبعیاتی چیزوں کی ترتیب میں زندگی کی حساسیت کا خیال نا رکھا جاتا تو آپ اس وقت یہ آرٹیکل نہ پڑھ رہے ہوتے، بلکہ انسانی زندگی کا کوئی وجود ہی نا ہوتا۔

ایک اور مثال سوچیں آپ ناسا کے لئے کام کرنے والے اک خلا باز ہیں. یہ سن 2070 ہے، اور آپ کسی اور کہکشاں میں زمین جیسے ایک سیارے پر اترنے والے پہلے انسان ہیں. آپکی مہم اس سیارے پر زندگی کی تلاش ہے. آپ آخر کار خلائی جہاز سے اس سیارے پر اپنے پہلا قدم رکھتے ہیں اور آس پاس سوائے پتھریلی زمین کے کچھ نہیں نظر آتا. تاہم آپ چلتے جاتے ہیں یہاں تک کہ آپ کو ایک گرین ہاوس نظر آتا ہے۔ اس

کے اندر آپکو انسانوں کی طرح کی مخلوق چلتی پھرتی، کھاتی پیتی ، کھیلتی اور کام کرتی نظر آتی ہے۔ آپ کو درخت، پودے اور دوسری ہریالی بھی نظر آتی ہے. آپ جیسے ہی اس مکان کے پاس پہنچتے ہیں انکا ایک نمائندہ آپ کا دوستانہ انداز میں ستقبال کرتا اور آپکو اندر آنے کی دعوت دیتا ہے. اپنی ابتدائی ملاقات میں ہی وہ آپکو بتاتے ہیں کہ مکان میں آکسیجن کا ضروری انتظام موجود ہے اسکے علاوہ پانی اور دوسرے کیمکلز بھی غذا اور ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے موجود ہیں. حیران ہو کر آپ ان سے پوچھتے ہیں کہ زندگی کو قائم رکھنے کے لیے یہ مکمل ماحولیاتی نظام آپ نے کیسے اس سیارے پر بنا لیا؟ ایک نمائندہ جواب دیتا ہے کہ 'اتفاق سے بن گیا'.

آپکا ذہن فوراً اس مضحکہ خیز بیان کو سلجھانے کی کوشش کرنے لگتا ہے. اس بات کی ممکن وضاحت یہی ہو سکتی تھی کہ یہ کسی صاحب عقل کا کام ہے نا کہ محض اتفاق۔ ابھی آپ سوچ کے گھوڑے دوڑا ہی رہے ہوتے ہیں کہ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ 'ہم تو مذاق کر رہے تھے' اور سب ہنس دیتے ہیں۔

اگر ایک چھوٹا سا ماحولیاتی ڈھانچہ ایک پتھریلے سیارے پر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتا ہے کہ ضرور اسے کسی نے بنایا ہے تو سوچیے تمام عالم کے لئے ہمیں کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہیے؟ تمام عالم اور اس میں جو کچھ بھی ہے طبیعاتی قوانین کے تابع ہے. اگر یہ قوانین ذرا بھی مختلف ہوتے تو یہاں کسی بھی باشعور زندگی کا تصّور محال ہوتا. تمام عالم میں اربوں ستارے اور کہکشائیں اور ان بے شمار کہکشاؤں میں ان گنت سیارے، ان سیاروں میں اک سیارہ ہماری زمین اور ہماری زمین میں کھربوں باشعور مخلوقات کا وجود. سوچیے ان آسمانی اجسام اور ان میں طبیعاتی قوانین کی انتہائی درست ترتیب اور باشعور مخلوق کی موجودگی کس بات کی نشاندہی کرتی ہے؟ ناگزیر اور سادہ جواب یہی ہے کہ یہ قطعاً کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے۔

☆اسلامی بنیاد[[The Islamic basis

یہ دلیل اسلامی بنیاد رکھتی ہے. قرآن آسمانی اجسام، دن اور رات کے پلٹنے، پودوں، جانوروں اور دوسرے طبعی مظاہر کے بارے میں ذکر کرتا ہے. اللہ تعالیٰ نے یہ تمام چیزیں عظیم الہامی توازن کیساتھ تخلیق کی ہیں:
"سورج اور چاند حساب میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور بیلیں اور درخت سب اس کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ اور آسمان کو اسی نے بلند کیا ہے اور اسی نے ترازو قائم کی ہے۔"۔(218)

عربی میں لفظ ' میزان ' کے کئی مطالب ہیں، ان میں 'توازن'[[balanceاور' الہامی درستگی '[[Divine precisionدونوں شامل ہیں. یہ لفظ میزان نشاندہی کرتا ہے کہ کائنات انتہائی درستگی، توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ بنائی گئی ہے. قرآن میں مزید بہت سی آیات کائناتی درستگی، ترتیب، ڈیزائن اور ہم آہنگی کو بیان کرتی ہیں:

"بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے بارے بارے آنے جانے میں ان عقل رکھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں"۔(219)

"سورج اور چاند حساب میں جکڑے ہوئے ہیں"۔(220)

اور اس نے دن اور رات کو اور سورج اور چاند کو تمہاری خدمت پر لگا رکھا ہے، اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام پر لگے ہوئے ہیں۔ یقیناً ان باتوں میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیں۔ (221)

اسلامی علماء نے 'ایک ڈیزائنر اور خالق کی ضرورت واضح کرنے کے لیے جگہ جگہ کائناتی ڈیزائن کی طرف متوجہ کیا ہے۔ مثلاامام غزالی لکھتے ہیں،

''ایک انتہائی ادنی ذہن بھی زمین و آسمان کے عجائبات، جانوروں اور پودوں پر غور کرنے کے بعد اس حقیقت سے کیسے آنکھ چرا سکتا ہے کہ یہ حیران کردینے والی دنیا اپنے تمام عجائبات اور ترتیب کے لیے کسی خالق کی محتاج نہیں جس نے اسے ڈیزائن کیا، ترتیب دیا اور چلایا'' (222)

امام ابو حنیفہ، اسلام کے عظیم علماء میں سے ایک، ایک دفعہ ایک ملحد کے ساتھ مباحثہ کرتے ہوئے ڈیزائن آرگومنٹ کو کامیابی سے پیش کرتے ہیں:

''اس سے پہلے کہ ہم بحث کا آغاز کریں، مجھے یہ بتائیے کہ آپ کا ایک ایسی کشتی کے بارے میں کیا خیال ہے جو خود بخود بغیر کسی کنٹرول کرنے والے، چلانے والے کے فرات (دریا) کے کنارے آتی ہے، سارا سامان خود لادتی ہے اور واپس ہوتی اور اپنی منزل پر لنگرانداز ہو کر وہاں خود سامان اتارتی ہے؟ جواب ملا، 'یہ ناممکن ہے ہر گز ایسا نہیں ہو سکتا'. تو امام نے ان سے فرمایا کہ اگر ایک کشتی کے لئے خود سے یہ سب کرنا اور چلنا محال ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ یہ اتنی بڑی دنیا اپنے تمام لوازمات کیساتھ خود بخود چل رہی ہو؟ (223)''

یہ قرآنی آیات اور مسلم علماء کے نکات وہی بازگشت ہیں جو پچھلی دہائی کی طبیعاتی دریافتوں میں بھی سنائی دیتی ہے، جو یہ بتاتے ہیں کہ کائنات طبیعاتی قوانین رکھتی ہے جو زندگی کا وجود برقرار رکھنے کے لیے بہت توازن کیساتھ بنائے گئے ہیں، اور یہ کہ کائنات انسانی زندگی کی سہولت کے لیے ایک مخصوص ترتیب رکھتی ہے۔

اس نپی تلی ترتیب، توازن کو علماء، ماہرین طبیعات اور فلاسفر 'نفیس درستگی' [[fine-tuning]] کا نام بھی دیتے ہیں.

☆نفیس درستگی() (Fine-tuning) انتہائی باریکی سے کسی شے کو اچھی شکل میں ڈھالنا اور جوڑنا):

کائنات کی نفیس ہم آہنگی کے مختلف پہلو ہیں۔ اوّل اگر کائنات کے قوانین کا وجود نہ ہوتا تو زندگی، خاص طور پر شعور رکھنے والی پیچیدہ زندگی کبھی ممکن نہ تھی۔ دوسری بات یہ کہ کائنات میں دلکش ترتیب دکھائی دیتی ہے: جس طرح سے آسمانی اور دوسرے اجسام کو ترتیب دیا گیا ہے وہ زمین پر زندگی کے معاون ہے۔ نفیس ہم آہنگی کے اِن مختلف پہلوؤں سے وابستہ تمام معلومات اس بات کی مضبوط دلیل ہیں کہ کائنات کو پیچیدہ اور حساس زندگی کی پناہ کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔

1۔طبیعیاتی قوانین(:Physical laws):

زندگی کے وجود کے لیے قوانین کا درست ترتیب دیا جانا بے حد ضروری ہے۔ اگر ان قوانین میں معمولی سے ردّوبدل کی جائے تو اس کا نتیجہ کائنات میں زندگی کا اختتام ہوگا:

1. کشش ثقل کا قانون(:Law of Gravity): گریویٹی دو اجسام کے درمیان قوتِ کشش کا نام ہے۔ کششِ ثقل (gravity) کے علاوہ ایسی کوئی قوت نہ نہیں ہوگی جو اشیاء/اجزاء کو اکھٹا کر سکے۔

چنانچہ یہاں نہ سیارے ہونگے نہ ستارے۔ ستاروں کے بغیر زندگی کے قیام کے لیے توانائی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ ہوتا۔(224) کائنات محض تاریک خلاء ہوتی۔

2. برقی مقناطیسی قوت(Electromagnetic Forces):: یہ منفرد قوت کائنات کی ہر شے پر اثرانداز ہوتی ہے۔ برقی مقناطیس، ی قوت اشیاء کو طاقت مضبوطی، شکل اور سختی مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس کے بغیر ایٹم (ذرّے) کا وجود نہ ہوگا کیونکہ کوئی ایسی قوت نہ ہوگی جو الیکٹران (برقیہ) کو جوہر کے گرد دائرے میں رکھ سکے ۔ اگر ایٹم نہ ہوتے تو زندگی بھی نہ ہوتی۔ کیمیائی جوڑ(chemical bonding) بھی برقی مقناطیسی قوت کی وجہ سے ہی ہے اور کیمیائی جوڑ کے بغیر زندگی کا وجود ممکن نہ تھا۔(225)

برقی مقناطیسیت کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ ایک قوت ہے اور بہت سی مختلف قسم کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ پروفیسر جان لیسلی (John Leslie) اپنی کتاب ''لامحدود ذہن، ایک فلسفیانہ علمِ کائنات'' ''Infinite Minds, A Philosophical Cosmology'' میں لکھتے ہیں:

''برقی مقناطیسیت ایک قوت ہے جو بہت اہم عوامل کے رونما ہونے میں معاون ہے: اسی کی وجہ سے ستارے اربوں سالوں سے جل رہے ہیں، یہ ستاروں میں کاربن بننے کا بھی باعث ہے۔ یہ اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ کوآرک(Quark) کی جگہ لپٹن(lepton) نہ لے، وگرنہ ایٹم کا وجود ممکن نہ ہوتا۔ اس قوت کی وجہ سے پروٹون(Proton) زیادہ جلد ذائل نہیں ہوتا اور پروٹون دوسرے پروٹون کو زیادہ

قوت سے نہیں دھکیلتا و گرنہ کیمیا(Chemistry) ممکن نہ ہوتی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی قسم کی قوت ان مختلف قسم کی ضروریات کے لیے کافی ہے، جبکہ ایسا لگتا ہے کہ ان عوامل کے لیے مختلف قوتیں درکار ہوں گی۔"(226)

پروفیسر کے سوال کا تسلی بخش جواب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ قوت بہت باریکی اور مہارت سے متعیّن کی گئی ہے کہ یہ بیک وقت ان تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

3۔قوی جوہری قوت :[The strong nuclear force]چونکہ ایٹم کا مرکز (nucleus)مثبت بار کے حامل پروٹون (Proton)سے مل کر بنتا ہے، اس کو بکھر جانا چاہیے کیونکہ ایک جیسے بار رکھنے والے ذرّے ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں لیکن ایٹم کا مرکز قوی جوہری قوت کیوجہ سے ثابت رہتا ہے۔ اگر یہ بدل دیا جائے تو "کائنات محض ایک بڑے بلیک ہول کی طرح ہو جائے گی"۔(227)

4۔کمزور جوہری قوت[:The weak nuclear force]کمزور جوہری قوت کشش ثقل سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ مگر یہ بہت ہی تھوڑے فاصلے تک اثر انداز ہو سکتی ہے۔ یہ ستاروں کے ایندھن اور عناصر کی تشکیل کا باعث ہے۔ یہ تابکاری کے تنزل کا بھی باعث ہے۔ سورج اس قوت کے بغیر جلنے کے قابل نہیں ہو گا کیونکہ یہ جوہری انشقاق((Nuclear Fusionمیں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر یہ قوت معمولی سی زیادہ طاقتور یا کمزور ہوتی تو ستارے تخلیق نہ ہو سکتے۔

طبعی قوانین کی فائن ٹیوننگ کی درجِ بالا مثالوں کی روشنی میں کوئی بھی صاحبِ عقل کچھ سنجیدہ سوال پوچھ سکتا ہے:

فزکس کے یہ قوانین کہاں سے آئے؟

ہم بے ترتیبی کے بجائے یہ قوانین کیوں دیکھتے ہیں؟

کیسے یہ قوانین بے شعور، عقل نہ رکھنے والے، اندھے اور بے ترتیب پراسیس اس طرح چلاتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی کے لیے معاون ثابت ہوں؟

یہ ایک منطقی ذہن کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ نتیجہ اخذ کرے کہ کسی قانون ساز، عظیم ریاضی دان، یا کائناتی ذہن نے ایسے قوانین تخلیق کیے ہیں جو کہ ایک باشعور زندگی کے وجود کے لیے معاون ہیں۔

2۔کائناتی ترتیب(:Cosmic order)

کائنات میں جو ہم نظم و ضبط کا اظہار دیکھتے ہیں اور فلکی معاملات میں ہم آہنگی، یہ نہ صرف متوسط ذہن رکھنے والوں کے لیے حیرت کا باعث ہے بلکہ اس نے اعلیٰ ذہن رکھنے والوں کو بھی مسحور کیا۔البرٹ آئن سٹائن نے ایک دفعہ کہا:

”میں ایک منکرِ خدا نہیں ہوں اور مجھے نہیں لگتا کہ میں خود کو وجودی کہہ سکتا ہوں۔ہماری حالت ایک ایسے چھوٹے بچے کی سی ہے جو ایک بہت بڑی لائبریری میں داخل ہو گیا ہے جو مختلف زبانوں میں لکھی گئی

کتابوں سے بھری پڑی ہے۔ بچہ جانتا ہے کہ یہ کتابیں ضرور کسی نے لکھی ہوں گی۔ مگر اسے یہ معلوم نہیں کہ کیسے؟ وہ ان زبانوں کو نہیں سمجھ سکتا جس میں وہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بچے کے ذہن میں ایک مدھم سا خیال ہے کہ ان کتابوں کے انتظام میں کوئی راز کوئی ترتیب پوشیدہ ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ ترتیب کیا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ خدا کی ذات کے حوالے سے بہت ذہین انسان کا رویہ بھی اسی قسم کا ہے۔ ہم اس کائنات کو ایک شاندار ترتیب میں دیکھتے ہیں یہ مختلف قوانین کی پابند نظر آتی ہے مگر ہم ان قوانین کو بے حد مدھم سا جانتے ہیں۔ ہمارے محدود ذہن اس پراسرار قوت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جس نے انہیں چلایا ہے۔"(228)

حتیٰ کہ مشہور بدلحاظ ملحد رچرڈ ڈاکنز نے بھی کائنات کے نظم وضبط پر اظہارِ خیال کیا۔ البتہ وہ نظریہ ڈیزائن کا قائل نہیں اور اپنی ایک طبعی وضاحت پیش کرتا ہے لیکن پھر بھی اس نے وہی کچھ بیان کیا جس نے آئن سٹائن کو مسحور کیا تھا۔

"مگر جب میں دیکھتا ہوں تو میں یہ لکھتا ہوں کہ میں خوش قسمت ہوں کہ میں زندہ ہوں اور آپ بھی۔ ہم ایسے سیارے پر رہتے ہیں جو ہماری طرح کی زندگی کے لیے بالکل موزوں اور کامل ہے۔ نہ زیادہ گرم، نہ زیادہ سرد، ایک مہربان سی دھوپ کی حرارت، بہت نرم پانی سے سیراب کیا گیا ہے، بہت دھیمے سے گھوم رہا ہے۔ سبز اور سنہری فصل اس سیارے کی گرمائش جذب کر لیتی ہے۔۔ کیسا اتفاق ہے کہ ایک سیارے نے بے ترتیبی سے ایسے خواص جمع کیے ہیں جو اس قدر مہربان خصوصیات کے حامل ہیں۔"(229)

حقیقتاً یہ کائنات بہت شاندار طریقے سے ترتیب دی گئی ہے اور یہ ترتیب بہت پیچیدہ ہے۔ اگر یہ ترتیب مختلف ہوتی تو یہ تقریباً ناممکن تھا کہ انسانی زندگی یہاں پھل پھول سکتی۔ درجِ ذیل مثالیں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں۔

a۔ ہمارے سیارے کا محلِ وقوع:

زندگی کے لیے معاون ہمارے سیارے کی ایک اہم خصوصیت اس کا سورج سے فاصلہ ہے۔ زمین اس حصے میں واقع ہے جسے قابل رہائش حلقہ [[habitable zone کہا جاتا ہے۔ اس حلقے کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے "ایسا علاقہ جہاں مرکزی سیارے کی تپش ہمارے سیارے کو ایسا سطحی درجۂ حرارت مہیا کرتی ہے جس پر ہمارے سمندروں کا پانی نہ تو منجمد ہوتا ہے اور نہ ابلتا ہے۔"(230) اگر ہمارا سیارہ سورج سے ذرا سا بھی مزید قریب ہوتا تو یہ اتنا گرم ہوتا کہ اس پر زندگی ممکن نہ ہوتی اور اگر یہ دور ہوتا تو بھی اس قدر ٹھنڈا ہوتا کہ زندگی ممکن نہ ہوتی۔

b۔ جوپیٹر کی کششِ ثقل (Jupiter's Gravitational Pull)::

ہمارے شمسی نظام میں جوپیٹر (Jupiter) سیارے کی غیر موجودگی، زندگی کے وجود کے لیے سنجیدہ مسائل کا باعث ہوتی۔ جیالوجیکل سائنس (Geological Sciences) کے پروفیسر پیٹر وارڈ (Peter Ward) کہتے ہیں:

"جوپیٹر (Jupiter) کے بغیر قوی امکانات تھے کہ آج ہماری زمین پر حیواناتی زندگی کا وجود نہ ہوتا۔"(231) جوپیٹر ہمارے لیے خلائی حفاظتی ڈھال (cosmic shield) کا کردار ادا کرتا ہے۔

یہ ستاروں اور چھوٹے سیاروں کو ہمارے سیارے سے ٹکرانے سے بچاتا ہے کیونکہ اس کی کششِ ثقل ان سیاروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ہمارے اس دوست سیارے کے بغیر اس اعلیٰ زندگی کی نشو و نما ممکن نہ تھی۔

ناسا (NASA) کی تحقیقاتی فیلو ربیکا مارٹن (Rebecca Martin) جنھوں نے جوپیٹر کے اثر کا مطالعہ کیا، لکھتے ہیں: "ہماری تحقیق یہ بتاتی ہے کہ آج تک سیاروی نظام کے بہت معمولی سے حصے کا مشاہدہ کیا جا سکا ہے اور اس سے پتہ چلا ہے کہ بہت بڑے سیارے بالکل درست جگہ پر موجود ہیں جو مناسب حجم رکھنے والے سیاروں کی قطار [[an asteroid belt بناتے ہیں تاکہ قریبی سیارے پر زندگی کے وجود کو ممکن بنایا جا سکے۔ ہماری تحقیق یہ اشارہ دیتی ہے کہ شاید ہمارا شمسی نظام بہت خاص ہے۔"(232)

جوپیٹر (Jupiter) کے بغیر، دوسرے سیاروں اور ستاروں کے ٹکراؤ کی وجہ سے ہمارے سیارے پر زندگی کی بقا بے حد مشکل تھی۔(233-234)

c۔ قمری لہریں/مدّوجزر[Lunar Tides]:

چاند کا زمین سے نسبتاً بڑا حجم، اپنی ثقلی پل [gravitational pull] کی وجہ سے زمین پر لہروں کا باعث ہے۔ چاند اپنی تخلیق کے بعد اب کی نسبت زمین سے زیادہ قریب تھا مگر یہ قربت زیادہ دیر نہ رہی۔ اگر چاند پیچھے نہ ہٹتا (اینگولر مومینٹم کی وجہ سے) تو ہمارے سیارے پر شدید اثرات ہوتے۔ ان اثرات میں زمین کی سطح کا زیادہ گرم ہونا بھی شامل ہے جو زمین پر زندگی پنپنے میں رکاوٹ کا باعث ہوتی۔ پروفیسر وارڈ (Ward) بیان کرتے ہیں کہ قریبی چاند زمین کے اوپر کے حصوں کو موڑ دیتا اور درجۂ حرارت بڑھا دیتا

اور عین ممکن تھا کہ زمین کی سطح پگھل جاتی: ’’قریبی چاند کی وجہ سے سمندری لہریں (اور زمینی لہریں) کی کثرت، زمین کی اوپر کی پرت کا مڑنا اور رگڑ کی وجہ سے درجۂ حرارت بڑھنا زمین کی پتھریلی سطح کو پگھلا دیتا۔‘‘ (235)

d۔ زمین کے گھومنے کے خطوط کو متوازن رکھنا:

چاند اس چیز کا بھی ذمہ دار ہے کہ زمین کی اپنے محور کے گرد گردش کے دوران اس خطِ مستقیم یا محور کے جھکاؤ کو متوازن بھی رکھے۔ پروفیسر وارڈ بیان کرتے ہیں ’’جھکاؤ کی سمت دس ہزار سالوں میں سیارے کے لڑکھڑانے/ڈگمگانے پر بدلتی ہے کسی گھومتی ہوئی شے کے محور کی طرح، مدار اور جھکاؤ کے مابین زاویے میں تقریباً کوئی ردّوبدل نہیں ہوتا۔‘‘ (236)

یہ زاویہ اربوں کھربوں سالوں سے چاند کی کششِ ثقل کی وجہ سے ایک ہی ہے۔ اگر چاند چھوٹا ہوتا یا سورج اور جوپیٹر (Jupiter) کے لحاظ سے اس کی جگہ مختلف ہوتی تو یہ زمین کے درجۂ حرارت کو طویل عرصے تک متوازن رکھنے سے قاصر ہوتا۔‘‘ (237) اسی لیے اگر چاند زمین کے پاس ہوتا تو ہمارے سیارے کا موسم متحرک اور شدید ہوتا، ہمیشہ بدلتا رہتا۔ محض چھوٹے جاندار/حشرات جنم لے سکتے اور پیچیدہ زندگی ممکن نہ ہوتی۔

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں طبعیات کے قوانین اور نظامِ شمسی کے نظم کی بہترین وضاحت کیا ہو سکتی ہے ؟ اس کی چند ہی آپشن ہیں: اتفاق، طبعی ضرورت[[physical necessity، کثیر کائناتی مفروضہ[[Multiverse یا ڈیزائن۔

1۔اتفاق(Chance):

اس نظم((fine-tuning کا اتفاقی قرار دیا جانا اس نتیجہ کا غماز ہے کہ قوانینِ طبعیات اور نظام شمسی کا نظم بغیر کسی ارادہ یا مقصد کے وقوع پذیر ہوئے۔ان کا ظہور میں آنا حادثاتی اور غیر مربوط امور کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک غیر عقلی دعویٰ ہے۔ بروس لی کی اس ایک پینٹنگ کو لیجیے۔

اگر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ اتفاق سے سیاہی صفحہ پر گری اور یہ تصویر بن گئ، تو آپ فوراً اس امکان کا انکار کر دیں گے۔ یہ اس لیے کہ آپ کا تجربہ اور معلومات یہ بتاتی ہیں کہ یہ ممکن نہیں۔اسی طرح اگر میں کہوں کہ امریکا کا مشہور آزادی کا مجسمہ اتفاقی طور پر بن گیا تھا، تو آپ یقیناً میری دماغی حالت پر شک کریں گے۔

اتفاق کا یہ مفروضہ نہ صرف غیر عقلی ہے بلکہ ایک مخالف بیانیہ ((counter-discourse بھی ہے۔اس سے میری مراد یہ ہے کہ اگر بات اتفاق پر ہی آ ٹھہرے تو پھر کوئی بھی بے عقلی کی بات دعویٰ کے طور پر کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک ملحد کو یہ کہ سکتا ہوں کہ میرا یقین ہے کہ میری اصل ماں وہ عورت نہیں ہے جس کو میں ماں کہتا ہوں بلکہ وہ ایک دراصل گلابی ہاتھنی تھی جو مریخ پر پیدا ہوئی تھی اور ایک ''بڑے پَر''((giant feather پر سوار ہو کر زمین پر آئی تھی۔ میرا ملحد دوست شائد مجھے پاگل کہے مگر میں جواب دے سکتا ہوں کہ ''اس کا امکان تو ہے''۔ امکان/اتفاق کا مفروضہ یا بیانیہ ہر دعویٰ کو

ممکن بنادیتاہے اوراس طرح ''دلیل'' کی ضرورت کو ہماری روزمرہ اوراکیڈیمک گفتگو سے نکال دیتا ہے۔
اس طرح میں دعویٰ کرسکتا ہوں کہ اسلام سچا مذہب ہے اگرچہ اس کا ثبوت موجود ہے کہ یہ ہے لیکن یہ دعوی کرتے ہوئے میں اس ''علمی تصور'' کا استعمال کررہا ہوں گا جو کہ ''امکان'' کو گفتگو کی بنیاد بنا کر رائج کردیا گیا ہوگا۔ چنانچہ یہ طریقہ کار کسی کو کوئی بھی دعویٰ کرنے کا اختیار دے دیتا ہے۔

ایک ملحد جو قوانینِ فطرت میں نظم کے سوال کے جواب میں اتفاق/امکان کے مفروضہ کو ایک قابل قبول جواب کے طور پر قبول کرتا ہے، وہ یقیناً دوہرے علمی معیارات اپنانے کا مجرم ٹھہرے گا۔ انکی اپنی روزمرہ زندگی میں اتفاق یا امکان کبھی انتہائی ناممکن چیزوں کی قابل قبول وضاحت کے لیے پیش نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر ایک ملحد اپنے بچے کو منع کرے کہ سونے سے پہلے بسکٹ نہیں کھانے اور پھر اگر وہ اپنے سوتے ہوئے بچے کے آس پاس اور اس کے چہرے پر بسکٹ کے ٹکڑے (ریزے) پائے اور بسکٹ کا ڈبہ بھی اس کے پاس ہی پڑا ہو، تو آپ کا کیا خیال ہے کہ اس کے ذہن میں فوری خیال کیا آئے گا؟ کیا اس سب کے خود بخود وقوع پذیر ہونے کا خیال بھی اس کے ذہن میں آئے گا؟ یقیناً نہیں۔ آپ مزید تصور کریں کہ اگر یہی توجیہہ ہمارے کاروباری امور، عدالتی کاروائی، منصوبہ سازی، روزمرہ زندگی میں پیش کی جائے تو ہماری روزمرہ زندگی، معیشت اور عالمی معاملات کس قدر ابتری کا شکار ہوجائیں گے۔

بہت سارے ملحدین، خدا کے معاملے میں بات کرتے ہوئے ایک منفرد علمی اصول بناتے ہیں جبکہ وہ روزمرہ زندگی میں اس سے مختلف اصول پر چل رہے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا بدیہات کو ماننے سے انکار پر اصرار ہے، جس کی وجہ جذباتی یا کچھ کی رائے میں روحانی ہیں۔ کچھ ملحدین کے لیے، منطقی دلائل ایک

پردہ ہوتے ہیں ایک بڑے مسئلے پر پردہ ڈالنے کے لیے: ان کی اس ضد کیلئے کہ وہ خدا کی عبادت نہیں کرنا چاہتے۔(دیکھئے تحریر ہم خدا کی عبادت کیوں کریں؟)

لیکن پھر بھی اس بات کا چانس تو ہے!

کچھ ملحد پھر بھی اس بات پر اصرار کرتے ہیں' چاہے یہ بات کتنی ہی غیر عقلی یا ناممکن کیوں نا ہو' کہ نظمِ کائنات کسی ارادے یا مقصد کا نتیجہ نہیں۔ان کا دعویٰ ہے کہ ہماری یہ کائنات جو زندگی کو ممکن بناتی ہے ایک شاندار حادثے کا نتیجہ ہے۔

اس اعتراض کے جواب کے لیے، امکان کے اصول کو ذہن میں لائیے۔ایک عقلی ذہن اس بات کو مانتا ہے کہ جب کوئی معلومات ایک مفروضہ کے ثبوت کے لیے ممکن نہ ہو، تو وہ دوسرے کسی مفروضہ کو قائم کرنے میں دلیل بن سکتی ہے جس کے تحت وہ ممکن ہو۔اس بات کو میں ایک مثال کے ذریعے واضح کرتا ہوں۔(239) فرض کریں کہ ایک بچہ جارج کی ولدیت کی تصدیق کا ٹیسٹ دو افراد پال (y) اور جان (x) پر کیا جائے۔ماں کا خیال ہے کہ پال (y) کے حقیقی والد ہونے کا امکان زیادہ ہے۔البتہ جان (x) کا خیال البتہ یہ ہے کہ وہ باپ ہے اور وہ اس کو ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے، ماں اس بات کی تصدیق کے لیے تینوں کا ٹیسٹ کروانا چاہتی ہے۔ٹیسٹ کا رزلٹ یہ آتا ہے کہ پال (y) کا ڈی این اے بچے کے ڈی این اے سے میچ ہو رہا ہے جان (x) سے نہیں۔اس رزلٹ اور حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں ماں کا مفروضہ سہی ثابت ہوتا ہے اور جان (x) کا مفروضہ ثابت نہیں ہوتا۔اس اصول کے تحت دونوں کے ٹیسٹوں کا نتیجہ ماں کے مفروضہ کو تقویت دیتا ہے کیونکہ اس کے مفروضے کے صحیح ہونے کے لیے جہاں پال (y) کا

DNA بچہ سے ملنا ضروری ہے وہاں جان (x) کے DNA کا نہ ملنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ٹیسٹ سے حاصل شدہ معلومات جان (x) کے مفروضے کے بجائے ماں کے مفروضے کی تائید کرتی ہیں۔

کائنات کی فائن ٹیو نگ / نظم کی بہترین توجیہ ڈیزائن آر گومنٹ سے ہوتی ہے نہ کہ اتفاق کے مفروضہ سے کیونکہ کائنات کا نظم اس بات کو زیادہ سپورٹ کرتا ہے کہ یہاں ذہانت اور منصوبہ بندی شامل ہے نہ کہ حادثاتی اور اتفاقی وجہ سے یہ سب ہو گیا۔ مندرجہ بالا مثال کے اصول کو میری گفتگو پر منطبق کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کائنات کے بارے میں معلومات اتفاق کے بجائے ڈیزائن/ منصوبہ بندی کے مفروضے کو سپورٹ کرتی ہے۔

2۔ضرورتِ طبعی ((Physical necessity

اس تصور کے مطابق نظمِ کائنات کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسا وہ ہے۔ یہ بات دو وجوہ سے غلط ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ اس صورت میں ہمیں ماننا پڑے گا کہ ایک ایسی کائنات جو ہمارے وجود کو ممکن نہ بنائے اس کا ہونا ناممکن ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ کوئی اور کائنات جس میں قوانین کی ترتیب مختلف ہوتی، اس کا تخلیق ہونا ممکن ہے۔(239) ماہر طبعیات پال ڈیوس وضاحت کرتے ہیں کہ "کائنات کا موجودہ حالت میں ہونا کوئی لازمی امر نہیں، یہ اس سے مختلف حالت میں بھی بن سکتی تھی"۔(241)

دوسری وجہ یہ کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں یہ کائنات ایسی اس لیے ہونی ضروری تھی تاکہ زندگی قائم ہو سکے، ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ پہلے والی مثال جو ڈبل روٹی کے توس، یہاں بھی وہی سامنے آتی ہے کہ

مکھن توس پر لگا دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا کہ اس کو ایسا ہی ہونا چاہے تھا۔ یقیناً یہ بات غلط ہے۔ توس کچا بھی ہو سکتا تھا اور اس پر مکھن کی بجائے چاکلیٹ بھی ہو سکتی تھی۔

3۔ کثیر کائناتی مفروضہ (Multiverse):

کچھ کی رائے یہ ہے کہ اس فائن ٹیونگ کی وضاحت کثیر کائناتی مفروضہ سے کی جا سکتی ہے۔ یعنی کائناتوں کی ایک کثیر تعداد میں سے ایک ہماری ہے۔ اگر کائناتیں ایک بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں تو اس بات کا امکان ہے کہ زندگی کو ممکن بنانے والی کائنات بھی موجود ہو۔ اگر ہم اوپر پیش کی گئی بروس لی کی تصویر کی مثال پر غور کریں تو یہ کثیر کائناتی مفروضہ ایسا ہی ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ کاغذ پر متعدد بار سیاہی گرانے سے یہ ممکن ہے کہ ایک باقاعدہ تصویر بن جائے۔ کثیر کائناتی مفروضہ کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں، ان سب کا جواب تو یہاں ممکن نہیں، مگر ہم ان سب کے بنیادی نکات پر بات کر کے اس مفروضہ کا رد کریں گے۔

دوسری بات یہ کثیر کائناتی مفروضہ فضول [superfluous] ہے۔ یہ بلا ضرورت کثیر کائناتوں کے امکان کو ضروری قرار دیتا ہے [It unnecessarily multiplies entities beyond necessity]۔ پروفیسر Richard Swinburne کہتے ہیں، "یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک کائنات کی خصوصیات کو بیان کرنے کے لیے اربوں کھربوں کائناتوں کے وجود کا مفروضہ پیش کیا جائے، جبکہ ایک ذات (خدا) کا ماننا یہی کام کر سکتا ہے۔"(242)

مزید کثیر کائناتی مفروضہ کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ پروفیسر Anthony Flew لکھتے ہیں "۔۔۔اس بات کا امکان کہ اپنے طبعی قوانین کے ساتھ کائناتوں کا کثیر تعداد میں ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ ایسی کائناتیں موجود بھی ہیں۔ اس وقت کثیر کائناتی مفروضہ کا کوئی ثبوت نہیں۔ یہ ابھی تک محض ایک افواہ ہے۔"(243) نہ صرف یہ کہ کثیر کائناتی مفروضہ کا کوئی ثبوت نہیں، یہ غیر سائنسی بھی ہے۔ Luke A. Barnes، سڈنی کے فلکیاتی ادارے میں ایک محقق ہیں، وہ کہتے ہیں کہ کثیر کائناتی مفروضہ مشاہدہ کی حد سے باہر ہے"۔

"سائنس کی تاریخ نے ہمیں بار بار سمجھایا ہے کہ تجرباتی ٹیسٹ کوئی اضافی فضول شے نہیں۔ کائناتوں کا کثیر تعداد میں ہونے کا مفروضہ ہمیشہ تجربے سے باہر ہی رہے گا۔ اس کا سب سے آسان مثبت ثبوت کسی ایسی طبعی تھیوری کا ہونا ہوگا، جس کا اچھی طرح تجربہ ہماری کائنات میں ہو چکا ہو، اور وہ کائنات کی تشکیل کا کوئی کلیہ ہمیں بتائے۔ پھر بھی ایسے سوال رہیں گے جو مشاہدے کی حد سے باہر ہیں، جیسا کہ آیا ایسی تشکیل کے لیے ضروری ابتدائی شرائط اس کائنات سے باہر خلا میں موجود ہیں؟۔۔۔اور کائنات کی تشکیل جس عمل کے ذریعہ ہو سکتی ہے اس کا مشاہدہ کیا ہی نہیں جا سکتا"۔(244)

کثیر کائناتی مفروضہ کا سب سے مشہور بیانیہ جو کہ اکثر ماہرینِ فلکیات وطبعیات کی جانب سے سامنے آتا ہے، یہ ہے کہ کائناتیں طبعی قوانین کے تحت تشکیل پاتی ہیں۔ یعنی اس طرح یہ سب لوگ یہ مانتے ہیں کہ طبعی قوانین کا موجود ہونا ضروری ہے جو کہ اس کائنات اور دیگر کائناتوں کے وجود میں آنے کے ذمہ دار ہیں۔ اس بیانیہ کا مسئلہ یہ کہ ان قوانین کے موجود ہونے پر یقین لانا خدا پر ایمان لانے سے زیادہ مشکل امر ہے، کیونکہ اس طرح ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ قوانینِ فطرت جادوئی طور پر خود ہی ظاہر ہو گئے۔ مزید یہ کہ ہمارا

علمی حق ہو گا کہ ہم یہ سوال کریں کہ یہ قوانینِ فطرت کہاں سے نمودار ہوئے ہیں۔ سب سے اہم یہ کہ ان قوانین کا اپنے آپ سے ایسے ڈیزائن میں وجود میں آنا لازمی ہے جس سے ایسی ایک کائنات بنے جو ہمارے وجود کو ممکن بنائے۔(234) چنانچہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اس مفروضے کے ماننے والے صرف نظمِ کائنات اور فائن ٹیونگ تک ہی محدود ہیں اس سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتے۔ مزید برآں، اگر کثیر کائناتی مفروضہ صحیح بھی ہو تو اس سے خدا کے وجود پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ (دیکھئے تحریر آرگومنٹ فرام ڈیپین ڈینسی)

4۔اسے لازمی طور پر ڈیزائن کیا گیا ہے۔

کائنات میں موجود فزیکل قوانین اور انتہادرجے کا ربط اس بات ثبوت ھیں کہ یہ کائنات کسی عظیم منصوبہ بندی کا نتیجہ ھے اور باقی سب نظریات جیسا کہ کائنات کا اتفاق سے وجود میں آنا، نظریہ ضرورت یا ملٹی ورس کائنات میں اس ربط کی وجوھات بیان کرنے سے قاصر ھیں۔ یہ کائنات کسی ذھین اور عقل مند ھستی کی پیشگی منصوبہ بندی اور ذہانت کا نتیجہ ھے اور یہ نظریہ باقی سب نظریات سے زیادہ مربوط اور منطقی ھے۔ اس نظریہ کے عام فہم اور منطقی اعتبار سے مضبوطی کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ھے کہ اگر ایک بندہ کسی باغیچہ سے گزرے اور پھولوں سے لکھے ھوئے 'مجھے آپ سے محبت ہے' کے الفاظ دیکھے اسکے ذہن میں یہی خیال آئے گا یہ کام مالی نے کیا ہے۔

نظریہ ڈیزائن پر کچھ اعتراضات اور سوالات اٹھائے جاتے ہیں جن کی وضاحت پیش ھے۔(246)

1۔ڈیزائنر کو کس نے بنایا؟[[Who designed the designer?]]

یہ اعتراض رچرڈ ڈاکنز کی کتاب 'دی گاڈ ڈیلوین' میں بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ 'کیونکہ یہ نظریہ (ڈیزائن) فوری طور پر سوال اٹھاتا ھے کہ بنانے والے کو کس نے بنایا؟(247)' اگر ایک ڈیزائنر موجود ہے تو ضرور با لضرور اس ڈیزائنر کا بھی کوئی ڈیزائنر ھونا چاھیے.

پہلی بات فلاسفی آف سائنس کا بنیادی اصول یہ بیان کرتا ہے کہ جب ایک وضاحت کو کسی خاص مسئلہ کے لئے بہترین ممکنہ توجیھہ کے طور پر مان لیا جاتا ہے تو اس توجیہہ کی اپنی وضاحت کے لیے کسی وضاحت ضروری نہیں ہوتی۔ یہ مثال اسکی وضاحت کرے گی آپ تصور کریں 5000 سال بعد آثار قدیمہ کا ایک ماہر گروپ لندن کے ہائیڈ پارک میں کھدائی شروع کرتا ہے اور کھدائی کے دوران انھیں ایک گاڑی اور ایک بس کے حصے ملتے ہیں. وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ھیں کہ یہ گاڑی اور بس کسی حیاتیاتی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک نامعلوم تہذیب کی مصنوعات ہیں. تاہم اگر کوئی یہ دلیل دیتا ہے کہ ہم یہ نتیجہ نہیں نکال کیونکہ ہم اس تہذیب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، وہ کس طرح رہتے تھے یا انھیں کس نے پیدا کیا۔ کیا اس دلیل سے آثار قدیمہ کے ماہرین کے دعوی پر کوئی اثر پڑے گا؟ یقینا نھیں۔؟

دوسری بات اگر ہم اس بچگانہ اعتراض کو سنجیدگی سے لے لیں تو یہ خود سائنس اور فلسفہ کی بنیادوں کو کمزور کرتا ہے. اگر ہم سائنس کے بنیادی مفروضوں کے بارے میں ہی منطقی سوالات کی تفصیل ڈھونڈنے لگ جاتے مثلاً اس تھیوری کے کہ 'بیرونی دنیا موجود ہے' تو آپ کو کیا لگتا ہے کہ ہمارے سائنسی ترقی اب تک کہاں پہنچی ھوتی؟ اگر ہم اس قسم کے سوالات کو ہر مفروضے کی موجود سائنسی وضاحت کے ساتھ جوڑ دیں،

توہم وضاحتوں کے لامتناہی سلسلے میں پھنس جائیں گے اور اس میں پڑنے سے سائنس کا بنیادی مقصد ہی فوت ھو جائے گا۔(248)

2۔بنانے والا ذیادہ پیچیدہ ھونا چاھیے۔

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ ایک وضاحت کو ھر ممکن حد تک آسان اور عام فہم ہونا چاہئے اور اس سے مزید سوالات پیدا نھیں ھونے چاھیے بلکہ جوابات ملنے چاھیے۔

کائنات خود اتنی پیچیدہ ھے تو ضروری ھے کہ اس کا بنانے والا اس سے بھی ذیادہ پیچیدہ ھو اسی لیے یہ نظریہ کہ خدا نے کائنات بنائی مزید سوالوں کو جنم دیتا ھے یہ فیل ہے۔

یہ اعتراض کے اسلامی تصور خدا کی غلط تشریح کرتا ہے. اسلام الہیات میں خدا صرف ایک اور منفرد ہے۔قرآن میں خدا کی ایک جامع سمری کو دیکھیے:' کہہ دو: بات یہ ہے کہ اللہ ہر لحاظ سے ایک ہے۔اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں۔(249)

پروفیسر انتھونی((Anthony Flew نے خدا کے اس تصور کی سادگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ خدا کا تصور اتنا آسان ہے کہ تین عظیم الھامی مذاہب کے تمام پیروکاروں کو سمجھ آگیا ہے."(250)

کیا خدا واقعی پیچیدہ ہے؟[[Is God physically complex?

اس اعتراض کیساتھ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ یہ فرض کرتا ہے کہ خدا بہت سے فزیکل پارٹس کا مجموعہ ھے. چونکہ عام طور پر پیچیدہ صلاحیتوں والی چیزیں جسمانی طور پر پیچیدہ ہوتی ہیں. اگر خدا اربوں دعاؤں کا جواب دے سکتا ہے، وسیع کائنات کو برقرار رکھتا ھے اور اس کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے اسے معلوم ہے، اسی لیے اسے ایک پیچیدہ جسمانی ساخت کا ہونا بھی ضروری ہے. تاہم یہ ایک غلط تصور ہے. پیچیدہ صلاحیت کا ھونا پیچیدہ جسمانی ساخت کو ثابت نہیں کرتا. مثال کے طور پر عام استرے اور الیکٹرک شیور پر غور کریں. ایک بجلی والا شیور بالوں کو شیو کر سکتا ہے اور ایک عام استرا بھی بال اتار سکتا ہے. ان دونوں کی ایک ہی صلاحیت ہے، لیکن بجلی کا شیور عام استرا سے زیادہ پیچیدہ ہے. اس کے باوجود عام استرا جسمانی طور پر پیچیدہ برقی شیور کے مقابلے میں زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہے. یہ پھل اور گتے جیسے مواد کو کاٹ سکتے ھے. یہ سوراخ بھی کر سکتا ہے۔ اس اعتراض کا سادہ سا جواب اس مثال میں بھی موجود ھے۔ انسان ایک کار سے زیادہ پیچیدہ ھے لیکن اس مطلب یہ نہیں نکالا جاسکتا کہ کار کو انسان نے نہیں بنایا۔ یہ سادہ سی مثال اس اعتراض کو غلط ثابت کرنے کیلئے کافی ھے۔

3۔ خلا کا خدا(‘God of the gaps’):

یہ اعتراض ملحدین کی طرف سے سب سے زیادہ کیا جاتا ھے اور ‘ملحدین کے دانشوروں’ میں بے نظیر اور نا قابل شکست ہتھیار کے طور پر جانا جاتا ہے اس اعتراض کی رو سے ایک دن سائنس اتنی ترقی کر لے گی کہ وہ ان تمام لاجواب سوالوں کا جواب دے سکے گی جن کے جواب کے لیے خدا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ ‘‘کائنات کے وجود کیلئے خدا کا ھونا ضروری ھے’’ کا نظریہ دم توڑ جائے گا۔ ڈیزائن آرگومنٹ کے سیاق میں یہ حیلہ خاص وزن نہیں رکھتا وہ کس طرح؟ اس کی تین وجوہات ہیں:

1۔ جب کوئی ملحد اس اعتراض کو آگے بڑھا دیتا ہے تو وہ لازمی طور پر یہ دعوی کرتا ہے کہ ہم نے کائناتی ڈیزائن کی توجیہہ کے لیے اسے سارے سائنسی ڈیٹا کے بعد بھی جو ابھی تک ہم نے جمع کیا ہے، خدا کا ئنات کے ڈیزائن کی سب سے بہتر وضاحت ہے، لیکن پھر بھی اسے امید ہے کہ کسی آنے والے وقت میں اتنی سائنسی ترقی ہو جائے گی کہ وہ خدا کے وجود کی دلیل کو مسترد کر دے گی۔ یہ سائنس پر اندھے یقین سے زیادہ نہیں کیونکہ یہ ایسے کہنے کے مترادف ہے کہ "سائنس اس مسئلے کو ابھی حل نہیں کر سکتی، لیکن ہمیں امید ہے"۔!

2۔ ملحدین کے اس اعتراض کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس اعتراض کی بنیاد ہی خلاف حقیقت ہے۔ ملحدین کہتے ھیں کہ سائنس آخر کار تمام سوالوں کا جواب دے کر ھمارے علم میں موجود گیپ کو ختم کر دے گی۔ جبکہ سائنس نے ہمیشہ خلا کو ختم نہیں کیا بلکہ اکثر وہ اس گیپ کو مزید بڑھا دیتی ھے اور بجائے جواب کے سوالات کا انبار لگا دیتی ھے۔ مثال کے طور پر کچھ صدیاں پہلے ھم خلیے کو محض پروٹوپلازم کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ 1950 میں ھمیں پتا چلا کہ خلیہ تو در حقیقت اپنے اندر معلومات (کوڈ نگ سسٹم) کا خزانہ چھپائے ھوئے ھے۔ اس دریافت نے بجائے ایک سادہ سے سوال کا جواب دینے کے ہماری سمجھ میں موجود خلا کو مزید بڑھا دیا۔

3۔ آخری بات یہ حیلہ بنیادی طور پر سائنس کی منہاج کو نا سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ میں ملحدین سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ سائنس نے آخر آج تک کس قسم کے سوالات کا جواب دیا ہے. سائنس صرف "کیسے" کا جواب دیتی ھے جبکہ "کیوں" کا جواب دینے سے قاصر ھے۔ اس نے اس بات کی وضاحت کی ھے، کائنات میں کس طرح ہر چیز کام کرتی ھے اور فزیکل قوانین کا اس میں کیا رول ھے۔ جبکہ سائنس ان سوالات کا

جواب دینے سے قاصر ھے جن کی بہت گہری اھمیت ھے اور وہی اس مسئلے میں اہم ہیں جیسا کہ یہ قوانین کس نے بنائے، کائنات کی فائن ٹیوننگ، کائنات کی شروعات، زندگی کی ابتداء، فطرت کا وجود، سوچنے کی صلاحیت وغیرہ کے متعلق کیوں کا سوال۔ سائنس کا ایسے سوالات کے جواب دینے کا ایک اچھا ٹریک ریکارڈ نہیں ہے کیونکہ یہ میٹا فزکس سے تعلق رکھتے ہیں سائنس کے دائرہ کار میں ہی نہیں آتے۔ (تفصیل کے لیے تحریر، کائنات کا عدم سے وجود؟، کیا سائنس نے خدا کو غلط ثابت کر دیا ہے؟)

4۔اس کا کوئی امکان نہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس باب میں جو دعویٰ پیش کیا گیا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں کیونکہ اصطلاحات جیسا کہ ''امکان''، 'احتمال' وغیرہ کو فائن ٹیوننگ اور نظمِ کائنات کے ضمن میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس مطالبہ کی اساس یہ ہے کہ ریاضیاتی امکان [mathematical probability] کو فرض نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہمارے پاس مشاھدے کے لیے صرف ایک کائنات ہے۔ ریاضیاتی امکان کے لیے ہمیں امکانات کی کثرت درکار ہے۔ کیونکہ ریاضیاتی امکان اس بات کو معلوم کرتا ہے کہ ایک امر کسی مخصوص نتیجے پر کتنی کوششوں میں پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس مشاھدے کے لیے کوئی اور کائنات نہیں اس لیے ہم نہیں جانتے کہ کسی اور ترکیب کا کیا نتیجہ نکلتا۔ چنانچہ ریاضیاتی امکان کو استعمال نہیں کیا جا سکتا اور چنانچہ کائناتی منصوبہ کا مفروضہ [design hypothesis] قائم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ اعتراض غلط ہے۔ اس میں اول غلطی یہ ہے کہ اس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہماری ''امکان'' سے مراد ریاضیاتی امکان ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ہم جس امکان کی بات کر رہے ہیں وہ علمی (epistemic)

ہے۔(251)اس طرح کا امکان کسی شماریاتی تخمین کی بجائے عقلی تخمین پر قائم ہوتا ہے ان معلومات کی روشنی میں جو ہمارے پاس ہوتی ہے۔ عمومی انداز میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس قسم کے تخمین کا تعلق مفروضے اور ثبوت پر ہوتا ہے۔ جتنے زیادہ ثبوت ہوں گے مفروضہ اتنا ہی مضبوط ہو گا۔اس کی مثال کسی جرم کا منظر ہو سکتا ہے: تصور کریں کہ ایک مردہ آدمی زمین پر پڑا ہو، اس کے پاس ایک چھری رکھی ہو اور اس کے جسم اور فرش پر خون پھیلا ہو۔ تفتیشی افسر کا یقین ہو کہ اس کی بیوی اس قتل کی مجرم ہے۔ وہ درج ذیل معلومات رکھتا ہے: اس بیوی کے پاس کوئی متبادل بیان نہیں، اس کے انگلیوں کے نشانات اور DNA چھری پر موجود ہے۔ تفتیشی افسر نتیجہ نکالتا ہے کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس شخص کو اس کی بیوی نے قتل کیا ہے۔ میسر ثبوت سے تفتیشی افسر کے مفروضے کو تقویت ملتی ہے۔ یہ صورتحال علمی امکان کی ایک واضح مثال ہے۔

مندرجہ بالا کوئی مثال جو طبعیاتی قوانین یا کائنات کے نظم سے متعلق پیش کی گئی ہیں، وہ ریاضیاتی امکان سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ ساری بحث کا مقصود یہ ہی تھا کہ اگر قوانین مختلف ہوتے، تو زندگی کو ممکن بنانے والی کائنات کا وجود خارج از امکان ہوتا، اور جو ہمیں معلومات حاصل ہیں اشیاء کے حوالے سے (جو کہ منصوبے کے تحت تخلیق ہوتی ہیں)، کائنات کا نظم اس مفروضہ کی تائید کرتا ہے کہ یہ کائنات انسانی وجود کو ممکن بنانے کے لیے منصونے کے تحت بنائی گئی ہے۔

5۔کائنات کا زیادہ تر حصہ کسی جاندار کی رہائش کے قابل نہیں، تو پھر وہ منہ بولی خاص ترتیب/ڈیزائن کہاں ہے؟

اس سوال میں معترض کا مدعا یہ ہے کہ اگر اس کائنات کا کوئی عظیم آفاقی خالق ہے تو پھر اس کائنات میں جانداروں کے لیے قابل رہائش جگہ اتنی قلیل کیوں ہے؟ اس اعتراض کی بنیاد ایک عیب دار مفروضہ ہے کہ کائنات کی تخلیق انسانوں کو رہائش فراہم کرنے کے لیے کی گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے یہ مفروضہ غلط ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہمارے زندگی کے لیے موزوں کرہ ارض کے سائز کا بقیہ کائنات کے ساتھ موازنہ غیر اہم ہے۔ (اسلام اپنے پیروکاروں کو ایمانی لحاظ سے کسی ایسے مغالطہ میں نہیں رکھتا کہ یہ کائنات محض جانداروں کے رہنے کے لیے بنائی گئی ہے۔)

6۔ خدا نے ناقص کائنات کیوں تخلیق کی ہے؟

یہ اعتراض سابقہ اعتراض کا ہی تسلسل ہے۔ اس قسم کے معترض یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر خدا نے کائنات تخلیق کی ہے تو پھر اس میں نقص کیوں ہے؟ بہ الفاظ دیگر کائنات کو ایسا تخلیق کیوں کیا گیا ہے کہ اسکا صرف ایک مختصر حصہ ہی زندگی کے لیے موزوں ہے؟

اس اعتراض میں اس بات کا انکار نہیں ہے کہ اس کائنات کو تخلیق کیا گیا ہے۔ البتہ اس میں خالق کی صلاحیت کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ اس اعتراض کے پیچھے ایک بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ اگر اس کائنات کا خالق خدا ہے، جو کامل و یکتا ہے، تو اسے انسانی زندگی کے لیے موزوں اور ایک بہتر تخلیق کرنی چاہیے تھی۔ یہ ایک غلط مفروضہ ہے کیونکہ ساری کائناتِ ارض و سماں کی تخلیق کا مقصد یہ ہے نہیں، بلکہ یہ اس مقصد کا ایک حصہ ہے کہ انسان کو اس کے ایک چھوٹے سے حصہ میں رکھا جائے۔ یہ کائنات میں انسانی زندگی کے متعلق اسلامی موقف ہے۔ اس میں یہ بات شامل ہے کہ اس کائنات کے ہر کونے کا زندگی کے

لیے بہتر ہونا ضروری نہیں اور نہ اس نے ہمیشہ رہنا ہے۔(البتہ اس بات سے یہ نظریہ قائم کرنا ضروری نہیں کہ زندگی دوسرے سیاروں پر قائم نہیں ہو سکتی۔اس بات کا مطلب یہ کہ کائنات کے ہر گوشے میں زندگی کا موجود ہونا ضروری نہیں ہے)اس لحاظ سے کائنات کا ڈیزائن اپنے مقاصد پورے کر رہا ہے اور اس پر کیا گیا اعتراض درست نہیں۔

7۔کمزور بشری اصول(The Weak Anthropic Principle):

اس اعتراض(یعنیWeak Anthropic Principleیا"کمزور بشری اصول/قانون")کا کہنا یہ ہے، ہمیں اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ کائناتی قوانین میں ایک لطیف توازن ہے، کیونکہ اگر زندگی کے بقا کے حق میں یہ لطیف توازن نہ ہوتا، تو ہمارا وجود ہی نہ ہوتا۔اب چونکہ ہمارا وجود ہے تو ہمیں اس بات پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں کہ کائنات انسانی زندگی کے لیے موزوں ہے۔لہٰذا اس اعتراض کی رو سے، کائناتی قوانین کے لطیف توازن کے موجود ہونے پر مزید دلائل بے فائدہ ہوں گے۔(یعنی ہمارا وجود ہی ایک دلیل ہے، کائناتی توازن کی)۔

اس دلیل کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

1.اگر ہم موجود ہیں، تو کائنات میں ہماری بقا کے اصول موجود ہونے چاہیں۔

2.ہم موجود ہیں۔

3. لہذا کائناتی قوانین ہماری بقا کو یقینی بنانے کے اصولوں کے عین مطابق ہیں۔

اس نتیجہ سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک بار پھر ہمارا سامنا ایک خلط ملط آر گومنٹ سے ہے۔ زندگی کی بقا کے لیے کائناتی قوانین میں موزوں توازن (Fine Tuning) کی موجودگی کا یہ ہر گز مطلب نہیں کہ ہمیں اس بات کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارا وجود کائناتی خدوخال کے عین مطابق ہے۔ یہ اس بات کی وضاحت چاہتی ہے کہ ہمارا وجود کیسے کائناتی خدوخال کے مطابق نظر آتا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کائناتی قوانین مختلف بھی ہو سکتے تھے۔مندرجہ ذیل کہانی سے Anthropic Principle پر اس اعتراض کے بے محل ہونے کی وضاحت ہو سکتی ہے۔(252)

آپ فرض کریں کہ ایک دن گھر جاتے ہوئے آپ ایک غلط موڑ کاٹیں اور ایک ویران صنعتی علاقے میں جا پہنچیں۔ آپ کی گاڑی کام کرنا چھوڑ دے اور آپ مدد تلاش کرنے کے لیے پیدل چلنے کا فیصلہ کریں۔ اچانک ایک مسلح افراد کا گروہ جس نے ایٹمی پلانٹ پر کام کرنے والوں کی طرح کا لباس پہنا ہو وہ نمودار ہو، آپ کو ہتھکڑی لگا کر سر ڈھانپ دیں اور آپ کو کسی گاڑی میں دھکیل دیں۔ چند گھنٹے بعد آپ کو جبراً گاڑی سے نکالا جائے اور آپ کو ایک عمارت میں لا جایا جائے۔ پھر وہ آپ کے سر سے کپڑا اتار کر آپ کو ایک کرسی پر بٹھا دیں۔ آپ کمرے میں نظر دوڑائیں اور آپ کو صرف سفید دیواریں اور بلب نظر آئیں۔ البتہ آپ کو سامنے ایک بڑی سے ایک ایسی مشین نظر آئے جو کسی مستقبل کے دور کی بہت بڑی واشنگ مشین کی مانند ہو۔ ہر چیز ساکت ہو جائے اور ایک آواز آپ کو حکم دے کہ سیڑھیاں چڑھ کر اس مشین میں داخل ہو جائے۔ آپ کو بتایا جائے کہ آپ ایک نئی ایجاد کردہ ٹائم مشین (وقت میں سفر کرنے والی مشین) کو استعمال کرنے والے پہلے انسان ہیں۔ آپ کو اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں۔ آپ مشین میں داخل ہوتے ہیں اور

چند ہی لمحوں میں آپ کو بہت حرارت اور شور محسوس ہوتا ہے اور آپ کے ارد گرد ہر چیز دھندلا جاتی ہے۔آپ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔جب کچھ دیر بعد آپ کو ہوش آتا ہے تو آپ خود کو 1625ء کے دور میں پاتے ہیں۔آپ ایک درخت سے بندھے ہیں اور آپ کو 100 قبائلی امریکی نظر آتے ہیں، چند گز کے فاصلے پر، جنہوں نے اپنے تیر آپ کی طرف کیے ہوتے ہیں۔ان قبائیلوں نے کبھی تیر چلانے میں غلطی نہیں کی اور یہ گھوڑے پر بیٹھ کر، دیکھے بغیر، مکھی کا نشانہ لے سکتے ہیں۔آپ کسی کو دس تک گنتی گنتا سنتے ہیں اور ساتھ ہی ''فائر'' (نشانہ لگاؤ) کی آواز آتی ہے۔ان سب نے آپ کے دل کا نشانہ لیا ہوتا ہے۔مگر جیسے ہی آپ کے حواس واپس آتے ہیں آپ دیکھتے ہیں کہ ان سب کا نشانہ چوک گیا ہے اور آپ صحیح سلامت زندہ ہیں۔اب دو نکات پر آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔پہلا یہ کہ، آپ کو اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہئے کہ آپ زندہ ہیں کیونکہ وہ چوک گئے ہیں، کیونکہ اگر آپ زندہ نہ ہوتے تو آپکو یہ بات پتہ نہ چلتی۔دوسرا یہ کہ آپ کو اس پر بہت حیران ہونا چاہیے کہ آپ کے زندہ رہنے کی وجہ ایک بعید از قیاس بات ہے کہ قبائیلوں کا نشانہ چوک گیا۔

Anthropic Principle کا تعلق پہلے نکتہ سے ہے جبکہ اس مضمون میں بیان کردہ اعتراض کا تعلق دوسرے نکتے سے ہے۔ہمیں اس بات پر نہیں حیران ہونا چاہیے کہ ہم ایک ایسی کائنات میں زندہ ہیں جس میں ہمیں زندہ رہنے دینے کی صلاحیت ممکن ہے۔بلکہ ہمیں اس بات پر حیران ہونا چاہیے کہ کائنات کی خدوخال کا خود سے زندگی کے لیے موزوں ہونا ناممکنات میں سے ہیں۔چنانچہ Anthropic Principle اصل موضوع سے ہٹ کر ہے۔

8۔آپ زندگی کو خاص فرض کر رہے ہیں

کائناتی قوانین کے اندر موجود ترتیب و ترکیب پر ایک دلچسپ اعتراض یہ اٹھایا جاتا ہے کہ ایسا سوچنا انسان کو مرکزِ کائنات سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ دیگر الفاظ میں اعتراض یہ ہے کہ اس نظریہ (فائن ٹیونگ آرگومنٹ) میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ انسانی زندگی کے بہت اہم ہے اور اس کی بقا کے لیے توازن کی ضرورت ہے۔۔ لیکن اگر یہ زندگی نہ بھی ہوتی تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ کائناتی قوانین ستاروں اور سیاروں کی بقا کے لیے موزوں ہیں۔ اگر یہ اجرامِ فلکی بھی نہ ہوتے تو ہم یہ بات ایٹمی ذرات کے بارے میں کہہ سکتے تھے۔یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ کائناتی توازن کی دلیل کسی بھی وجود کے بارے میں بیان کی جاسکتی ہے، لہٰذا یہ اتنا مؤثر اعتراض نہیں۔اس اعتراض کا جواب دو طرح دیا جاسکتا ہے:

1. اگر یہ کائناتی توازن انسانی حیات کے لیے نہیں بھی رکھا گیا تو بھی کائناتی توازن کی دلیل خود کائنات کی اپنی بقا کے لیے بھی دی جاسکتی ہے۔یہ کائنات نہ صرف پیچیدہ کائناتی عناصر پر مشتمل ہے، بلکہ پیچیدہ ترین کیمیائی سرگرمیوں سے بھی معمور ہے جو ان کائناتی عناصر کی تشکیل و ترکیب کا باعث بنتے ہیں۔ یہ پچیدگی وضاحت مانگتی ہے۔ اگر ایسی کائنات نہ ہوتی اور چند عناصر کے ساتھ محض ایک خالی کائنات ہوتی تو پھر کسی قانون کا بھی وجود نہ ہوتا۔ چنانچہ کائنات کی وجودی پیچیدگی ہی اس کی قانونی ترکیب و توازن کا تقاضا کرتی ہے اور وضاحت کی متقاضی ہے۔

2. زندگی، خصوصاً انسانی زندگی انتہائی پیچیدہ ہے۔اس حقیقت کی بنیاد پر کہ اس کائناتی نظام میں اس ''پیچیدہ وجود''کو ممکن بنانے کے اصول موجود ہیں اور اسکی فائن ٹیو نگ کی گئی ہے' ایک منطقی ذہن کی یہ نشانی ہے کہ وہ اس پیچیدگی کے وجود کی وضاحت اور توجیہہ تلاش کرے۔

9۔دیگر حیاتی موجودات پر مبنی اعتراض

ایک اور عام اعتراض جو اس کائناتی قوانین میں مابین زندگی کی سپورٹ میں توازن(Fine-Tuning Argument) کے نظریہ پر کیا جاتا ہے وہ اس مفروضہ پر مبنی ہے زندگی صرف کاربن کی بنیا پر ممکن ہے، یعنی اگر طبعیاتی قوانین مختلف ہوتے تو کاربن کی بناء پر قائم زندگی ناممکن ہوتی۔۔ اگر طبعیاتی قوانین مختلف ہوتے تو زندگی غیر کاربن عناصر پر ممکن ہو جاتی۔ چنانچہ زندگی کسی دوسری کیمیائی ترکیب کے ساتھ کسی اور کائناتی توازن کے تحت وجود میں آسکتی تھی۔

یہ اعتراض بھی غیر متعلقہ ہے کیونکہ ہمارا یہ آرگومنٹ اس مفروضہ پر قائم ہی نہیں ہے۔یہ دو منطقی مفروضوں پر قائم ہے۔پہلا یہ کہ باشعور زندگی کو توانائی کے سورس کی ضرورت ہے، چاہے وہ زندگی کسی کاربن بیس ہو یا نہیں۔مثال کے طور پر کشش ثقل کے بغیر یہاں ستاروں کو وجود نا ہوتا اور ستارے نا ہوتے تو توانائی بھی نا ہوتی۔دوسرا یہ کہ باشعور زندگی پیچیدگی سے عبارت ہے۔مثال کے طور پر اگر قوی جوہری قوت(Strong Nuclear Forces) کو رتی برابر بدل جائے تو ہائیڈروجن کے علاوہ کسی ایٹم کا وجود نا ہو گا۔یہ ناقابل تصور ہے کہ پیچیدہ شعوری زندگی صرف ہائیڈروجن سے ممکن ہو سکتی ہے۔اگر

طبعیاتی قوانین مختلف ہوتے تو کسی بھی مستحکم اور پیچیدہ زندگی کا امکان نہیں ہوتا۔ یہ بالکل عقلی اور ہم آہنگ مقدمات ہیں۔(253)

خلاصہ یہ کہ فائن ٹیونگ آرگومنٹ ایک وجدانی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی سادگی اور طاقت کا مقابلہ بہ مشکل ہی کیا جا سکتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ کہ آپ کا ڈبل روٹی کا توس خود بخود پک گیا اور اس پر اتفاق سے آپ کی پسند کی چاکلیٹ سے ''مجھے آپ سے محبت ہے'' لکھا گیا۔ اس عمل کے ہونے سے ظاہر ہے کہ یہ سب کرنے کے لیے ایک شعوری کوشش درکار ہے تو کائنات جو اس عمل سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے اور اس میں ایک ٹوسٹ کے پیس پر لکھے چند الفاظ سے زیادہ سلیقہ نظر آتا ہے، عقل کو یہ سب یہ یقین کرنے کی بنیاد مہیاء کرتا ہے کہ ضرور کوئی ڈیزائنر موجود ہے جس نے کائنات میں پیچیدگی، توازن اور سلیقہ رکھا۔

حوالہ جات

Analogy adapted from Collins, R (2002) God, Design 217 and Fine-Tuning. Adapted version. Available at: http://home.messiah.edu/ ~rcollins/Fine-tuning/Revised%20Version%200fbA>20Fine-

tuning%20for%20anthology.doc [Accessed 24th October 2016)

The Qur'an, Chapter 55, Verses 5 to 7.218

The Qur'an, Chapter 3, Verse 190.219

The Qur'an, Chapter 55, Verse 5.220

The Qur'an, Chapter 16, Verse 12.221

Tibawi, A.L. (ed. and tr.). (1965) Al-Risala al- 222 Qudsiyya (The Jerusalem Epistle) «Al-Ghazali's Tract on Dogmatic Theology". In: The Islamic Quarterly, 9:3-4 (1965), 3-4.

Ibn Abi AI-'Izz. (2000) Commentary on the Creed of 223 At-Tahawi. Translated by Muhammad 'Abdul-Haqq Ansari. Riyadh: Institute ofIslamic and Arabic Sciences in America, p. 9

Collins, R. (2009) The Teleological Argument. In: 224
Craig, W. L. and Moreland,]. P. The Blackwell Companion
to Natural Theology. West Sussex: Wiley-Blackwell, p.
212.

S Ibid.22

John Leslie. (2001) Infinite Minds: A Philosophical 226
Cosmology. Oxford: Clarendon Press. p. 205.

Collins. R. The Teleological Argument. p. 212.227

Cited in Jammer. M. (1999) Einstein and Religion. 228
Princeton. NJ: Princeton University Press. p. 1 SO.

Dawkins. R. (1999) Unweaving the Rainbow. London: 229
Penguin. p. 4.

Ward. P. D. and Brownlee. D. (2004) Rare Earth: Why 230
Complex Life Is Uncommon in the Universe. New York.
NY: Copernicus Books. p. 16.

Ibid. pp. 221-222.231

No Jupiter. no advanced life? • – evolution may be ‘232 impossible in Star Systems without a giant planet (2012). Available at:

http://www.dailygalaxy.com/my _ weblogl20 12111/would-advanced-life-be-impossible-in-star-systems-without-a-jupiter-.html [Accessed 2nd October 2016].

Rasio. F.A. and E.B. Ford. (1996) Dynamical 233 instabilities and the formation of extrasolar planetary systems. Science 274: 954-956.

Ward. P. D. and Brownlee. D. (2004) Rare Earth: Why 234 Complex Life Is Uncommon in the Universe. New York. NY: Copernicus Books. pp. 238 – 239.

Ibid. p. 227.235

Ibid. p. 223.236

Ibid.237

Inspired by and adapted from Collins. R. The Fine-238 Tuning Design Argument. PowerPoint Presentation. Available at: http://home.messiah.edu/-rcollins/Fine-tuning/Fine-tuning>Al20powerpoint%20final%20version %2010-3-08. ppt [Accessed 24th October 2016].

Ibid.239

Craig. W. L. (2008) Reasonable Faith: Christian Truth 240 and Apologetics. p. 161.

Davies. P. (1993) The Mind of God: Science and the 241 Search for Ultimate Meaning. London: Penguin. p. 169.

Cited in Flew. A. (2007) There is a God. p.119.242

Ibid.243

Barnes. L. A. (2011) The Fine-Tuning of the Universe 244 for Intelligent Life. Sydney Institute for Astronomy. Available at: http://arxiv.org/PS_cache/arxiv/pdf/1112/1112.4647v1.pdf [Accessed 5th October 2016].

Adapted from Collins. R. (2009) The Teleological 245 Argument. pp. 262-265.

I am grateful to Abu Hurayra for his contribution in 246 responding to these objections. 247 Dawkins, R. (2006) The God Delusion, p. 158.

Both points have been adapted from Professor William 248 Lane Craig's treatment on the issue. Craig, W. L. (2009) Dawkins's Delusion. In: Copan, P. and Craig, W. L. (ed.). Contending with Christianity's Critics: Answering New Atheists & Other Objectors. Nashville, Tennessee: B & H Publishing Group, p. 4.

The Qur' an, Chapter 112, Verses 1 to 4.249

Flew, A. (2007) There is a God, p. Ill.250

Collins, R. (2002) God, Design and Fine-Tuning. 251 Adapted version. Available at: http://home.messiah.edu/ - rcollins/Fine-tuningiRevised%20Version%200fb1620Fine-tuning%20for%20anthology.doc [Accessed 24th October 2016].

Adapted from Collins, R. (2009) The Teleological 252 Argument, p. 276.

Ibid253

خدائی تعلق –دلیلِ انحصاری [The Divine Link-The Argument from Dependency]

فرض کریں آپ اپنے گھر سے نکلتے ہیں اور اپنی گلی میں ڈومینوز (ایک کھیل کا چھکا) کی ایک قطار دیکھتے ہیں،جو حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی ہے. پھر آپ کو ایک آواز آنی شروع ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ہے. یہ آواز آپ کے لیے جانی پہچانی ہے کیونکہ آپ بچپن میں ڈومینوز کا کھیل کھیلتے رہے ہیں،یہ ڈومنیوز کی ٹائلوں کے گرنے کی آواز ہے. آپ اس بات کے بہت معترف ہوتے ہیں کہ کس طرح طبیعیات کے بنیادی قوانین نے یہ خوبصورت منظر پیش کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ حیران بھی ہیں کیونکہ ڈومینوز

کی آخری ٹائل آپ کے قدموں سے کچھ ہی فاصلے پر گر چکی ہے. اس حیرت انگیز واقعے سے جو ابھی ابھی رونما ہوا ہے آپ ابھی تک پر جوش ہیں لہٰذا آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ آپ گلی کے آخری سرے تک جائیں یہ امید کرتے ہوئے کہ آپ اس شخص کو جا لیں جو اس حیرت انگیز کارنامہ کا ذمہ دار ہے. (نوٹ: ڈومینوز ایک کھیل ہے جو ٹائلوں کے ذریعے کھیلا جاتا ہے)۔

مندرجہ بالا صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں آپ سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں. گلی میں چلتے ہوئے کیا آپ اس جگہ پہنچ جائیں گے جہاں سے ڈومینوز کے اس تسلسل یا چین کا آغاز ہوا ہے یا آپ ہمیشہ چلتے رہیں گے؟ ظاہر سی بات ہے آپ بالآخر پہلے ڈومینو تک پہنچ جائیں گے. تاہم میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں، کیوں؟ وجہ آپ جانتے ہیں کہ آپ پہلے ڈومینو تک پہنچ جائیں گے کیونکہ آپ کو پتا ہے کہ آپ اگر ڈومینو گرنے کا سلسلہ لا محدود ہوتا تو آخری ڈومینو جو آپ کے قدموں کے بالکل قریب گرا تھا' کبھی نہ گرتا. کیونکہ آخری ڈومینو کے گرنے سے پہلے ڈومینو کی ایک لا محدود تعداد کو گرنا ہوگا اور ظاہر ہے کہ لامحدود ڈومینوز کو گرنے کے لیے لا محدود وقت بھی درکار ہے۔ دوسرے الفاظ میں آخری ڈومینو کبھی نا گر پاتا۔ سادہ الفاظ میں آپ جانتے ہیں کہ آخری ڈومینو گرنے کے لئے لازمی ہے کہ اس سے پہلا ڈومینو گرتا اور اس ڈومینو کے گرنے کے لئے لازمی ہے کہ اس سے پہلے والا ڈومینو گرے، اگر یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے تو آخری ڈومینو کبھی نہیں گرے۔!

اس مثال کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں آپ سے ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں. فرض کریں کہ گلی میں چلتے ہوئے آپ اس پہلے ڈومینو تک پہنچ جاتے ہیں جس سے یہ ڈومینو کے گرنے کا سلسلہ شروع ہوا، پہلے ڈومینو کے بارے میں آپ کے خیالات کیا ہونگے؟ کیا آپ یہ سوچیں گے کہ یہ ڈومینو خود بخود گر گیا؟ دوسرے

الفاظ میں کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ پہلے ڈومینو کے گرنے کی وضاحت کسی بیرونی عنصر، قوت کے بغیر کی جاسکتی ہے؟ بالکل نہیں؛ کیونکہ یہ حقیقت کے بارے میں ہماری بنیادی سمجھ کے ہی خلاف ہے۔ کوئی بھی چیز خود بخود نہیں ہوتی، ہر چیز کے وجود یا ہر واقعے کے رونما ہونے کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ لہذا پہلے ڈومینو کے گرنے کی کوئی اور وجہ (بیرونی عنصر) ہو گی۔ جیسے کوئی شخص، ہوا یا کسی چیز کا اس سے ٹکرانا وغیرہ۔ جب ڈومینو کے گرنے کے واقعے کی وضاحت کی جائے گی تو وہ وجہ ہماری وضاحت کا حصہ ہو گی۔

مذکورہ بالا حقائق کو یکجا کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نہ تو ڈومینو کا سلسلہ لامتناہی ہو سکتا ہے اور نہ ہی پہلا ڈومینو خود بخود گر سکتا ہے چاہے جو بھی ہو۔

اوپر بیان کی گئی مثال انحصار(Dependency) کے بارے میں ہماری بحث کا خلاصہ ہے۔ کائنات بھی ڈومینو کی ایک قطار کی طرح ہے۔ کائنات اور اس میں موجود ہر شے منحصر ہے۔ وہ کسی ایسی چیز یا ہستی پر انحصار نہیں کر سکتی جو خود کسی دوسری چیز پر انحصار کرتی ہو۔ اس کی قرین قیاس وضاحت یہی ہے کہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز کسی ایسی ہستی/ذات پر ہی منحصر ہو سکتی ہے جس کا وجود کائنات پر منحصر نا ہو (اور اس حوالہ سے کسی بھی دوسری پر بھی نہیں۔) یا پھر یوں کہیے کہ اس ذات/ہستی کو کائنات کی طرح یا اس طرح کی کسی دوسری چیز پر انحصار نہیں کرنا چاہیئے جس طرح کائنات میں ہر دوسری چیز کرتی آئی ہے۔ کیونکہ اس طرح ”ڈومینو کی چین میں مزید ایک ڈومینو کا اضافہ ہو جائے گا جس کے لئے ایک الگ وضاحت درکار ہو گی۔ لٰہذا کوئی خود مختار اور لازوال ذات ضروری ہے جس پر ہر چیز انحصار کرتی ہے۔

انحصار/محتاجی سے کیا مراد ہے؟

اس دلیل کو سمجھنے کے لیے مجھے یہ بیان کرنا لازمی ہے کہ منحصر ہونے سے میری مراد کیا ہے؟ جب ہم کہتے ہیں کوئی چیز کسی پر منحصر ہے اس کا کیا مطلب ہوتا ہے:

(1) یہ کوئی ایسی چیز ہے جو لازمی نہیں:

لفظ ''لازمی'' کا فلسفے میں ایک خاص تکنیکی مطلب ہے۔ عام استعمال کے برعکس اس سے ایسی کوئی چیز مراد نہیں جس کی آپ کو ضرورت ہو۔ بلکہ جب فلسفی کسی چیز کے بارے میں لزوم کا لفظ استعمال کرتے ہیں ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ناممکن اور ناقابلِ تصور تھا کہ وہ چیز وجود نا رکھتی۔ یہ ذرا مشکل تصور ہے اس لئے کہ ہمارے عملی تجربے میں کوئی ایسی چیز نہیں جو کبھی لازمی ہو۔ تاہم اس کے الٹ سوچ کر ہم ''کسی چیز کے لازمی ہونے'' کا مناسب مطلب سمجھ سکتے ہیں۔ کوئی شے یا چیز جو لازمی نہ ہو دلالت کرتی ہے کہ اسکا وجود بھی نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بات قابل فہم ہے کہ جو چیز کبھی وجود نہیں رکھتی تھی وہ غیر لازمی ہے۔ وہ کرسی جس پر آپ اس وقت بیٹھے ہیں واضح ہے کہ یہ لازمی نہیں۔ ہم ایسی ہزاروں صورتوں کا تصور کر سکتے ہیں جہاں یہ (کرسی) موجود ہی نہ ہو. آپ نے اس کو خریدنے کے لیے منتخب نا کیا ہو، بڑھئی نے اسے بنایا نہ ہو، یا پھر تاجر نے اس کو بیچنے کا سوچا نہ ہو. واضح طور پر ایسی کئی آسان صورتیں سامنے آتی جن سے کرسی کا کوئی وجود ہی نا ہوتا۔

اب ''یہاں نا پایا جانا'' کا امکان انحصار کرنے والی چیزوں کی خاص خصوصیت ہے۔ کوئی ایسی چیز جس میں یہ خصوصیت پائی جائے اسکے وجود کی توجیہہ لازمی ہے۔ یہ اس لئے کہ ایک ایسی چیز جس کا پہلے وجود ہی نا ہو' کے بارے میں آپ آسانی سے سوال کر سکتے ہیں؛ یہ چیز (مثلاََ کرسی) آخر کیوں موجود ہے؟ یا اس کرسی کے وجود میں آنے کی آخر کیا وجہ ہے؟ یہ ایک مناسب سوال ہے جو وضاحت مانگتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ چیز خود بخود موجود ہوں، کیونکہ اس کے وجود کے بارے میں کچھ بھی لازمی نہیں. یہ کہنا کہ چیز کا اپنا وجود آپ اپنی وضاحت کرتا ہے، انحصار کی اس خصوصیت کا انکار کرنا ہے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا۔ چنانچہ، وضاحت اس چیز سے ہٹ کر ہونی لازمی ہے۔ اس سیاق میں وضاحت/توجیہہ سے ہماری مراد وہ خارجی عنصر ہے جو یہ وجہ بیان کرتا ہے کہ کوئی چیز کیوں وجود رکھتی ہے؟ لہٰذا لازمی ہے کہ وضاحت خارجی عنصر پر مشتمل ہو۔

اپنی کرسی کی مثال کی طرف واپس آتے ہیں، کئی محرکات مثلاََ بڑھئی کا کرسی کو بنانا، تاجر کا اس کو بیچنا اور آپ کا اس کو خریدنا، کرسی کے وجود کی وضاحت کرتے ہیں. لہٰذا اگر کسی چیز کے وجود کے لیے خارجی عناصر درکار ہوں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ چیز اپنے علاوہ کسی دوسری چیز پر انحصار کرتی ہے. لہٰذا اس کا وجود کسی بیرونی چیز پر منحصر ہے. یہ استدلال کی ایک بنیادی، بدیہی اور عقلی شکل ہے. یہ اس لئے ہے کہ کسی ایسی چیز کے وجود کے بارے میں سوال کرنا جو پہلے وجود نہ رکھتی ہو، ایک عقل مند ذہن کی نشانی ہے۔

سوچیے کہ سائنس دان کیا کرتے ہیں. وہ حقیقت کے مختلف پہلوؤں پر انگلی اٹھاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں. (مثلاََ) یہ پھول اس طرح کیوں ہے؟ اس بیکٹریائی جراثیم سے یہ بیماری کیوں لاحق ہوتی ہے؟ کائنات موجودہ رفتار سے کیوں پھیل رہی ہے؟ وہ وجہ جس سے یہ سارے سوالات مناسب قرار پاتے

ہیں وہ یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی چیز لازمی نہیں۔ مطلب یہ ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی بھی چیز اپنی موجودہ حالت میں نہ ہوتی یا سرے سے وجود ہی نا رکھتی۔ اس تصور کو مزید واضح کرنے کے لئے اس مثال پر غور کیجئے؛

آپ صبح صبح اٹھتے ہیں اور سیڑھیاں اتر کر کچن جاتے ہیں. آپ فریج کھولتے ہیں اور انڈوں کے ڈبے پر آپ کو قلم ملتا ہے. سیدھی سی بات ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ فریج بند کر دیں اور یہ خیال کریں کہ قلم کا یہاں پر وجود لازمی ہے. آپ یہ بھی نہیں سوچیں گے کہ قلم خود بخود فریج میں پہنچ گیا. آپ اپنے آپ سے یہ سوال ضرور کریں گے کہ قلم انڈوں کے ڈبوں کے اوپر کیوں موجود ہے یا کیوں رکھا ہوا ہے. یہ سوال پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں قلم کا انڈوں کے ڈبوں کے اوپر موجود ہونا لازمی نہیں ہے. اس کی اس جگہ پر موجودگی بیان کرنے کے لئے ایک وضاحت لازمی ہے اور جس انداز میں یہ وہاں موجود ہے "اس انداز" کی بھی وضاحت درکار ہے. اس کی کئی وضاحتیں ہو سکتی ہیں لیکن یہ حقیقت کہ قلم کا یہاں وجود بیان کرنے کے لئے ایک وضاحت لازمی ہے' کا مطلب ہے کہ قلم (کسی دوسری چیز) پر انحصار [Dependent] کرتا ہے۔ قلم فریج میں کیا کر رہا ہے اور جس انداز میں یہ وہاں موجود ہے، اس کو بھی واضح کرنے کے لئے خارجی عناصر پر مشتمل ایک وضاحت لازمی ہے. مثال کے طور پر یہ قلم کسی جگہ بنایا گیا اور آپ کے بیٹے نے کتابوں کی ایک دکان سے وہ قلم خریدا اور اس کو فریج میں رکھ دیا، یہ وہ خارجی عناصر ہے جو قلم کے فریج میں موجود ہونے کو واضح کرتے ہیں. لہٰذا قلم ان خارجی عناصر پر انحصار کرتا ہے اور یہ خارجی عناصر قلم کے وجود کی وضاحت کرتے ہیں۔

(2)کوئی چیز منحصر[dependent] کہلائے گی اگر اس میں ڈیزائن ہو یا اسکے اجزاء یا اسکی عمارت کے بنیادی بلاک کو مختلف طریقے سے ترتیب دیا جا سکے:

ایسا اس لئے ہے کہ اس چیز سے ہٹ کر کوئی ذات یا چیز لازمی ہے جس نے اس کی خاص ترتیب کا تعین کیا ہے. مجھے ایک مثال کے ساتھ اس تصور کی وضاحت کرنے دیجئے؛ آپ گھر جا رہے ہیں اور آپ کا گزر ایک گول چکر[[roundabout سے ہوتا ہے. آپ کی نظر پھولوں کے ایک خوشے پر پڑتی ہے جو ان تین الفاظ" "I Love You کی ترتیب میں لگے ہوئے نظر آتے ہیں. آپ یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پھولوں کی ترتیب میں کوئی خاص بات نہیں، انکو کسی اور طریقے سے بھی ترتیب دیا جا سکتا تھا۔ مثال کے طور پر الفاظ""" I Love You کے بجائے" "I Adore You استعمال کیے جاتے. یا پھر پھولوں کو ترتیب ہی نا دیا جاتا، یہ بے ترتیب یا بکھرے پڑے ہوتے۔ چونکہ پھول کسی دوسری ترتیب میں لگائے جا سکتے تھے لازمی ہے کہ کسی خارجی قوت نے ہی انکی ترتیب متعین کی ہو۔ موجودہ معاملے میں یہ کوئی مالی ہو سکتا ہے یا پھر لوکل گورنمنٹ کا کوئی پروجیکٹ بھی ہو سکتا ہے۔یہی حقیقت ان ساری چیزوں کے بارے میں ہے جن کا آپ مشاہدہ کرتے ہیں. ہر چیز خواہ وہ ایک ایٹم، یا لیپ ٹاپ یا ایک جاندار ہی کے اجزا کیوں نہ ہوں، ایک خاص انداز میں ترتیب دیے گئے ہوتے ہیں۔ مزید بر آں ہر بنیادی جز کا موجود ہونا بھی لازمی نہیں۔ کسی چیز کے بنیادی اجزاء اپنے آپ کی یا اپنے وجود کی وضاحت نہیں کر سکتے، لہٰذا ان کو ایک وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے. (اوپر بیان کی گئی تعریف دیکھیں)

(3)ایک چیز منحصر ہے، اگر اس کو اپنے وجود کے لئے کسی بیرونی عنصر کی ضرورت ہے؛

یہ عام فہم بات ہے۔ایک منحصر چیز اپنے آپ اپنا وجود برقرار رکھ نہیں رکھ سکتی. مثلاً ً بلی اپنا وجود خود بخود قائم نہیں رکھ سکتی،اس کو زندہ رہنے کے لئے یا اپنی بقا کے لئے بیرونی عناصر پر انحصار کرنا پڑتا ہے.ان عناصر میں خوراک، پانی، آکسیجن اور جائے پناہ شامل ہیں.

(4) کسی منحصر چیز کی تعریفی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کی طبعیاتی خصوصیات محدود ہوتی ہیں؛ جیسا کہ شکل، حجم، رنگ، درجہ ء حرارت، چارج اور وزن وغیرہ.

ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے جب کسی چیز کی طبعیاتی خصوصیت محدود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس خصوصیت کے محدود ہونے کی کوئی بیرونی وجہ ہے، خواہ وہ کوئی ذریعہ یا کئی محرکات ہوں. یہ سوالات اس نکتے کو مزید واضح کرتے ہیں؛ اس چیز کی یہ خصوصیات محدود کیوں ہے؟ یہ اپنے موجودہ وزن سے دگنی کیوں نہیں؟ یہ کسی اور رنگ یا شکل میں کیوں موجود نہیں؟ یعنی اس چیز نے خود بخود اپنے حدود کا تعین نہیں کیا. مثال کے طور پر اگر میں ایک کیک اٹھاتا ہوں جو ایک محدود حجم، شکل، رنگ اور بناوٹ رکھتا ہے اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اس کا وجود لازمی ہے تو آپ مجھے بے وقوف خیال کریں گے. کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ حجم، رنگت اور بناوٹ کا ذمہ دار کوئی بیرونی ذریعہ ہے؛ اس صورت میں اس کیک کو بنانے والا یعنی بیکر۔

لہٰذا یہ ایک معقول اور مناسب دعویٰ ہے کہ محدود طبعیاتی خصوصیت رکھنے والی تمام چیزیں محدود ہوتی ہیں، ان سے پہلے یقیناً ً کوئی چیز ہو گی جو ان کی خصوصیات کی ذمہ دار ہو گی. یعنی تمام محدود طبعیاتی اشیاء کا ایک نقطہ ء آغاز ہو گا، کیونکہ یہ ناقابلِ تصور ہے کہ محدود طبعیاتی خصوصیت رکھنے والی اشیاء دائمی ہوں. اس

کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بیرونی ذریعہ یا محرکات کا ایک مجموعہ یقیناً ہر محدود طبعیاتی خصوصیت رکھنے والی چیز سے پہلے موجود ہونا لازمی ہے وہ اس (چیز) کی محدود خصوصیات کا ذمہ دار ہے.

بالفرض اگر میں ایک پودا اٹھالوں اور آپ سے کہوں کہ یہ دائمی ہے تو آپ کا رد عمل کیا ہو گا؟ آپ اس قسم کے دعویٰ پر یقیناً ہنسیں گے. اگرچہ آپ نے پودے کو اگتے ہوئے نہیں دیکھا ہو، آپ جانتے ہیں کہ یہ فانی یا محدود ہے کیونکہ یہ محدود طبیعیاتی خصوصیات رکھتا ہے. تاہم اگر محدود طبیعیاتی خصوصیات رکھنے والی چیزیں (بشمول یہ کائنات) دائمی ہوتیں پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ "منحصر" ہیں اور ان کا "وجود" لازمی نہیں. یہ دلیل صادق ہے چاہے بیان کی جانے والی شے دائمی ہو یا اس کا کوئی نقطہ ءآغاز ہو.

انحصاری کی توجیہات:

منحصر ہونے کی جو جامع تعریف اوپر بیان کی گئی ہے جب اس کا اطلاق کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات اور اس میں موجود ہر شے منحصر ہیں. کسی بھی چیز پر غور کریں جو آپ کے ذہن میں آئے جیسا کہ قلم، درخت، سورج، الیکٹران اور حتیٰ کہ کوانٹم فیلڈ. یہ سب چیزیں کسی نہ کسی لحاظ سے منحصر ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو وہ تمام چیزیں جو ہمارے مشاہدے میں ہیں بشمول کائنات کے ان کے وجود کی توجیہہ/سبب کے لیے یہ نکات ہو سکتے ہیں:

(1) کائنات اور حلقہ ءادراک میں آنے والی تمام اشیاء دائمی، لازمی اور خود مختار ہیں.

(2) کائنات کا وجود اور حلقہ ءادراک میں آنے والی تمام اشیاء کسی اور چیز پر انحصار کرتے ہیں جو خود بھی کسی نہ کسی پر منحصر ہیں.

(3) کائنات اور حلقہ ءادراک میں آنے والی تمام اشیاء نے اپنا وجود ایک ایسی ذات سے حاصل کیا ہے جو واجب الوجود ہے اور اسی طرح دائمی اور خود مختار ہے.

ہم ہر نکتے کو واضح کریں گے جس سے معلوم ہوگا کہ کونسا نکتہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز کی انحصاری کی بہتر وضاحت کرتا ہے۔

(1) کائنات اور حلقہ ءادراک میں آنے والی تمام اشیاء دائمی، لازمی اور خود مختار ہیں.

یہ کہنا کہ ہمارے حلقہ ءادراک میں آنے والی تمام اشیاء ہمیشہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی اور کسی خارجی عنصر یا علت کی محتاج نہیں، عقلیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا. انسانی حلقہ ءادراک میں آنے والی اشیاء لازمی وجود نہیں رکھتیں: ان کا وجود نہیں بھی ہو سکتا تھا، انکی طبعی خصوصیات محدود ہیں۔ چونکہ یہ تحدید انہوں نے خود اپنے اوپر نہیں لگائی، لہٰذا لازماً کوئی خارجی عنصر یا عناصر ہی اس کا سبب ہوں گے. ہمارے ادراک اور مشاہدے میں آنے والی چیزیں یا اشیاء صرف اپنی وجود کی بناء پر اپنی وضاحت نہیں ہو سکتے اور انکا یہ ڈیزائن بدیہی نہیں تھا انکے اجزاء مختلف طریقے سے بھی ترتیب دیے جا سکتے ہیں۔

حتی کہ اگر کائنات ازلی بھی ہوتی پھر بھی کچھ خارجی عناصر کا وجود لازمی تھا جو اسے محدود جسمانی خصوصیات مہیا کریں۔ چونکہ کائنات طبیعیاتی طور پر اپنے اندر ایک طرح کی محدودیت رکھتی ہے لہٰذا وہ اپنے وجود کے لئے خارجی علتوں کے ماتحت ہیں. مزید کائنات کا ایک مخصوص ڈیزائن ہے اسکی عمارت کے بنیادی اجزاء

موجودہ ترتیب سے الگ کسی اور صورت میں بھی ترتیب دے جا سکتے تھے۔اس طرح کائنات وجود نہیں بھی رکھ سکتی تھی، کائنات صرف اپنے وجود کی بناء پر اپنی وضاحت آپ نہیں ہو سکتی. ان نکات کی بناء پر ہم کائنات کے خود مختار ہونے یا خارجی عنصر کے ماتحت نہ ہونے کو باآسانی رد کر سکتے ہیں.

(2) کائنات کا وجود اور ہمارے حلقہ ءادراک میں آنے والی تمام اشیاء کسی اور چیز پر انحصار کرتے ہیں جو خود بھی کسی نہ کسی پر منحصر ہیں.

کائنات اور انسانی حلقہ ءادراک میں آنے والے مشاہدات کسی ایسی چیز پر منحصر نہیں ہو سکتے جو خود کسی پر منحصر ہو۔چونکہ کائنات اور جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اپنی وضاحت خود نہیں کر سکتے،اسی لیے انکی وضاحت کسی ایسے خارجی عنصر سے بھی نہیں ہو سکتی جو خود محتاج ہو. اس لیے کہ اس محتاج چیز جس کو اس وضاحت/توجیہہ کے لیے فرض کیا جائے گا اسکے اپنے وجود کی بھی وضاحت بھی درکار ہو گی اور اسکی وضاحت کو اپنے کی۔۔ یہ سلسلہ لا متناہی ہو گا جو اصل وجوہات کو بیان نہیں کر سکتا.اسی لیے محتاج یا منحصر چیزوں کی وضاحت کا صرف یہی طریقہ ہے کہ اسے ایسے عنصر کی طرف ریفر کیا جائے جو محتاج نہیں اور اس لیے لازمی ہے۔

اسکے بجائے کوئی اسی لا متناہی سلسلے پر اصرار کرے تو یہ غلط ہے،اگر کائنات کی وضاحت کوئی دوسری کائنات ہو اور اس طرح یہ سلسلہ لا محدود ہو اور وہ سب ایک دوسرے پر منحصر ہوں تو یہ چیز درکار وضاحت کے مسئلے کو حل نہیں کرے گی۔اگر کائناتیں لا متناہی بھی ہوں تو یہ سوال موجود رہے گا کہ یہ کائناتوں کا

لا متناہی سلسلہ کیوں وجود رکھتا ہے؟ چاہے کائنات ہمیشہ سے ہے یا نہیں، اس کو اپنے وجود کی وجوہات کے لئے کسی توجیہہ کی ضرورت ہے۔

ہم ایک مثال سے اس بات کو سمجھتے ہیں، فرض کریں لا متناہی تعداد میں انسان ہیں۔ ہر انسان اپنے والدین کے حیاتیاتی عمل کے نتیجے میں پیدا ہوا اور وہ والدین اپنے والدین سے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے منتہا تک۔ تب بھی یہ سوال اپنی جگہ معقول رہے گا کہ انسان آخر کیوں موجود ہیں؟ چاہے انسانوں کی ابتداء کوئی نہ ہو لیکن انسان در انسان کا یہ سلسلہ وضاحت کا محتاج ہے. چونکہ اس سلسلے میں ہر انسان وجود نہیں بھی رکھ سکتا تھا اور اسکی جسمانی صفات محدود ہیں جیسا کہ انسان محدود ہے اور اس نے یہ تحدید خود تخلیق نہیں کی تو لازماً وہ محتاج ہیں اور لازمی نہیں۔ انہیں اب بھی وضاحت درکار ہے۔ صرف یہ کہہ دینے سے کہ انسانوں کا سلسلہ لا محدود ہے اس وضاحت کی ضرورت کو ختم نہیں کرتا۔(158)

یہ نکتہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ محتاج و منحصر علتوں کا لا متناہی سلسلہ ممکن ہے۔ یہ بھی کسی طور پر عقلیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا. مثلاً اگر ہماری کائنات کسی اور کائنات پر منحصر ہو اور وہ کسی اور پر اور اس طرح کائنات در کائنات کا سلسلہ چلتا رہے۔ کیا اس کائنات کا وجود ہو سکتا تھا؟ اسکا جواب ہے نہیں کیونکہ اس کائنات کے وجود سے پہلے لا متناہی انحصاروں کی ضرورت ہو گی۔ یاد رکھیں چیزوں کی لا متناہی تعداد کا اختتام نہیں ہوتا اسی لیے یہ کائنات وجود نا رکھتی اگر انحصار لا متناہی ہوتے۔

(3) کائنات اور حلقہ ءادراک میں آنے والی تمام اشیاء نے اپنا وجود ایک ایسی ذات سے حاصل کیا ہے جو خود بخود موجود ہے اور اسی طرح دائمی اور خود مختار ہے: چونکہ کائنات اور انسانی حلقہ ءادراک میں آنے والی

اشیاء کسی نہ کسی خارجی عنصر کی محتاج ہوتی ہیں لہٰذا یہ وضاحت سب سے زیادہ عقلی ہے کہ تمام اشیاء کا وجود کسی خود مختار اور ابدی وازلی ذات کا محتاج ہے۔اسے خود مختار ہونا چاہیے کیونکہ اگروہ محتاج ہوتی تو اسکو اپنی وضاحت کی ضرورت ہوتی۔اسے ازلی بھی ہونا چاہیے کیونکہ اگروہ ازلی نا ہوتی (دوسروں لفظوں میں محدود ہوتی) تو محتاج ہوتی جیسا کہ محدود اشیاد کو اپنے وجود کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی لیے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ کائنات اور ہر مشاہدے میں آنی والی چیز ایسی ذات پر منحصر ہے جو کہ ازلی اور خود مختار ہے۔اسکی بہترین وضاحت خدا کے وجود سے ہوتی ہے۔

انحصاری کی یہ دلیل اسلامی علمی روایت سے بھی ثابت ہے. قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بارہا اس ذاتِ بے نیاز باری تعالیٰ کا ذکر ہے جس نے ہر چیز کو وجود بخشا. جیسا کہ

"خدا تمام چیزوں سے بے نیاز ہے"(159)

"اے انسانوں! تم لوگ اللہ کے محتاج ہو اور اللہ غنی (اور بے نیاز) ہے اور تمام تعریفیں اسی ہی کے لائق ہیں"(159)

ابنِ کثیرؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں "تمام انسانوں کو خدا کی ضرورت ہے جبکہ اسے کسی کی ضرورت نہیں. وہ یکتا اور تمام ضرورتوں سے بے نیاز ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں."(161)

مشہور فلسفی ابنِ سینا نے اس دلیل کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "خدا کی ذات واجب الوجود ہے یعنی خدا کا ہونا لازمی امر ہے. تمام چیزوں کا خالق خدا ہے لہٰذا وہ خدا کے محتاج ہیں اور ان کو ابنِ سینا نے ممکن الوجود کہا ہے."(161)

اور بھی بہت سے مشہور اسلامی سکالرز جیسا کہ الرازیؒ، الغزالیؒ اور امام الحرمین جوینیؒ نے بھی اسی انحصاری کی دلیل سے استدلال کیا ہے. غزالیؒ نے اس دلیل کا جامع خلاصہ پیش کیا ہے:

"واجب الوجود کا انکار ممکن نہیں. کسی ایک کا وجود کا ناگزیر ہے اور اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ کچھ چیز بھی وجود نہیں رکھتی وہ عقل اور لزوم کا مذاق اڑاتا ہے. یہ رائے کہ کسی واجب الوجود کا ہونا لازمی ہے ایک لازمی بنیاد ہے. اب یہ وجود جس کو اصولی طور تسلیم کیا گیا ہے دیکھنا یہ ہے کہ وہ لازمی ہے یا امکانی۔۔ مطلب اس ایک وجود کو لازمی طور پر خود مختار یا منحصر ہونا چاہیے۔ یہاں سے ہم یہ بحث کر سکتے ہیں کہ اگر تو یہ ذات جس کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے لازمی ہے تو لازمی ذات کا وجود ثابت ہو گیا۔ اگر اسکا وجود امکانی ہے تو ہر امکانی وجود کسی دوسرے لازمی وجود پر منحصر ہوتا ہے، امکانی کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ اسکا وجود ہونا یا نہ ہونا دونوں ممکن ہیں. جو کوئی بھی ایسی صفات رکھتا ہے اسکے وجود کا انتخاب یا تعین 'انتخاب کرنے والے پر منحصر ہے۔ اور یہ ایک لازمی امر ہے۔ چنانچہ ان لازمی مقدمات سے ایک لازمی ذات کا وجود ثابت ہے۔"(163)

خلاصہ یہ کہ اسلامی الٰہیات میں خدا کی صفات یہ ہیں؛(1) خود مختار (2) وہ ذات جس پر تمام اشیاء کا انحصار ہے۔(3) وہ ذات جو سب کی کفالت کرتی ہے.(4) ازلی و ابدی.(5) غنی/ خود کفیل (6) واجب الوجود (لازمی وجود)

مندرجہ بالا دلائل پر اٹھائے گئے اعتراضات:

کائنات خود مختار وجود رکھتی ہے[The universe exists independently]:]

ملحدین کی طرف سے ایک عام اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم کہتے ہیں کہ خدا خود مختار اور لازمی ہے تو یہ بات ہم کائنات کے بارے میں کیوں نہیں کہہ سکتے؟

ان وجوہات کی بناء پر ایک غیر ضروری اعتراض ہے: پہلی بات یہ کہ کائنات کا ہونا کوئی لازمی امر نہیں ہے، یہ وجود نہیں بھی رکھ سکتی تھی۔ دوسری بات کائنات میں ڈیزائن ہے اس کے بنیادی اجزا ایک مختلف طریقے سے ترتیب دے جاسکتے ہیں۔ کوئی ان اجزا کو کوارک(quarks) سمجھے یا کسی طرح کی کوانٹم فیلڈ یہ سوال اپنی جگہ رہے گا کہ اجزاء کی ترتیب موجودہ ڈھب میں کیوں ہے؟ چونکہ کوارک یا فیلڈ کی اس موجودہ ترتیب سے ہٹ کر ایک مختلف ترتیب کا وجود ہو سکتا ہے، اسکا مطلب ہے کائنات محتاج و منحصر ہے۔ (164) یہ اپنی ماہیت کے لئے کسی چیز کی محتاج ہے۔ کائنات کے اندر تمام چیزیں جو ہمارے ادراک میں ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کی کچھ جسمانی حدود ہوتی ہیں. چاہے چاند، ستارے، کہکشائیں اور جانور وغیرہ انکی ایک مخصوص بناوٹ، سائز اور جسمانی شکل ہے چنانچہ یہ تمام چیزیں جن پر کائنات مشتمل ہے محدود اور منحصر ہیں۔

کائنات ایک سفاک حقیقت ہے[The universe is just a brute fact]]

ایک اور حیلہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہمیں کائنات کے بارے میں سوال نہیں کرنا چاہیے. برٹرینڈ رسل نے فادر کوپلسٹن کے ساتھ اپنی مشہور ریڈیو بحث میں کہا تھا" مجھے یہ کہنا چاہیے کہ کائنات موجود ہے اور بس" (I

should say that the universe is just there, and that's all)(165) اس دلیل میں عقلی شکست خوردگی واضح ہے۔ ہوا میں معلق سبز گیندوں کی یہ مثال دیکھیے۔(166)

فرض کریں کہ آپ مقامی پارک میں چہل قدمی کرتے ہوئے بچوں کے کھیل کے میدان کے اوپر ایک سبز رنگ کی گیند ہوا میں تیرتی دیکھتے ہیں، آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟ کیا آپ اسکو میدان کا ضروری حصہ سمجھتے ہوئے نظرانداز کردیں گے؟ ظاہر ہے نہیں کریں گے، آپ یہ سوال کریں گے کہ یہ گیند کیوں وجود رکھتی ہے اور اپنی موجودہ حالت میں ہی کیوں ہے؟ اب اس گیند کو آپ کائنات جتنا بڑا کردیں یہ سوال موجود رہے گا: یہ گیند کیوں وجود رکھتی ہے اور اپنی موجودہ حالت میں ہی کیوں ہے؟ چنانچہ کائنات کے وجود کے بارے میں بھی سوال اسی طرح معقول ہے۔

مزید یہ اعتراض احمقانہ ہے کیونکہ یہ سائنس کو بھی بے وقعت کرتا ہے۔ سائنسی مطالعے کی ایک خصوصی فیلڈ ہے جو کہ کائنات کے وجود اور اس کے سربستہ رازوں کو کھوجنے کے لیے وقف ہے۔ اس فیلڈ کو کونیات (Cosmology) کہتے ہیں۔ یہ سائنسی دریافتوں کا ایک بالکل مستند شعبہ ہے لہٰذا یہ کہنا کہ کائنات محض ایک 'سفاکانہ حقیقت' ہے 'مسلمہ سائنسی طرزِ فکر اور اصولوں کا مذاق اڑانے والی بات ہے۔

سائنس بالآخر جواب تلاش کرلے گی ![Science will eventually find an answer!]

اس اعتراض کے مطابق جو کچھ اس باب میں پیش کیا گیا ہے وہ 'خلا کا خدا' مغالطے [God of the gaps fallacy] کی طرح ہے، ہماری سائنسی لاعلمی یا ناکامی کو وجود خدا کے ثبوت کے طور پر نہیں لیا جاسکتا کیونکہ ایک نہ ایک دن سائنس وضاحت/توجیہہ مہیا کردے گی۔ یہ ایک غیر متعلق اعتراض ہے کیونکہ محتاجی کی دلیل ((argument from dependency کا مقصد کسی سائنسی سوال کا جواب دینا نہیں ہے۔ کائنات کی توجیہہ/علت کا تعلق سائنس سے نہیں بلکہ مابعد الطبیعیات سے ہے، یہ محتاج یا منحصر چیزوں کی فطرت اور اثرات کو جاننے کی کوشش ہے۔ یہ دلیل تمام سائنسی وضاحتوں اور مظاہر پر لاگو کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم بہت سی کائناتوں کو بھی فطری مظاہر کی توجیہہ کے لیے پیش کردیں، وہ محتاج ہی رہیں گی۔ کیوں؟ کیونکہ اس توجیہہ (کائناتوں) کے اجزا کو مختلف طریقے سے ترتیب دیا جاسکتا ہے اور وہ اپنی وضاحت خود نہیں پیش کرسکتیں، یا وہ اپنے وجود اور اپنی محدود صلاحیتوں کے لیے خارج میں ایک وجود کی محتاج ہیں۔ اسی لیے وہ منحصر یا محتاج ہیں اور جیسا کہ اس تحریر میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ایک محتاج چیز کی وضاحت کے لیے دوسری محتاج چیز نہیں پیش کرسکتے۔

اگر سائنسدان کائنات کے وجود کی وضاحت کے لیے ایک خود مختار اور ازلی وجود کی دریافت کا دعوی بھی کرلیں، ہم ثبوت مانگیں گے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ مشاہداتی ثبوت انکے اس اپنے ہی دعوی کے متضاد ہوگا کیونکہ جو چیزیں حسی طور پر مشاہدے میں آتی ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ محدود طبیعی صفات رکھتی ہے لہٰذا منحصر ٹھہرتی ہیں۔

سائنس کبھی بھی ابدی و ازلی اور اور خود مختار چیز دریافت نہیں کرسکتی کیونکہ اسکا کام کا دائرہ صرف مشاہداتی اور منحصر چیزوں تک محدود ہے۔ اسی لیے یہ کہنا بے معنی ہے کہ سائنس ایک غیر سائنسی چیز دریافت

کر لے گی۔ سائنس کیا ہے۔ سائنس ایک طریقہ ہے جو جواب اور وضاحتیں مہیا کرتا ہے (ہماری یہ تحریر دیکھیے)۔ اور وضاحت صرف منحصر چیزوں کی ہی پیش کی جاسکتی ہے۔ اسکو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم جان سکتے ہیں کہ سائنس کا دائرہ منحصر چیزوں تک ہی محدود ہے وہ چیزیں جن کے متعلق ہم یہ سوال کر سکتے ہیں: یہ کیوں وجود رکھتی ہے؟ یہ اس طرح کیوں موجود ہے؟ چنانچہ سائنس جو جواب مہیا کرتی ہے وہ کسی دوسری محتاج/منحصر چیز سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ تاہم جیسا کہ ہم نے وضاحت کی آپ ایک محتاج وجود کی وضاحت ایک دوسرے محتاج وجود سے نہیں کر سکتے کیونکہ اس محتاج وجود کو بھی وضاحت درکار ہو گی (اگر آپ یاد کریں ہم اوپر یہ ڈسکس کر چکے ہیں کہ ایسی چیز کا وجود نہیں ہو سکتا جو کسی اور منحصر چیز پر منحصر ہو اور وہ کسی منحصر چیز پر اور یہ سلسلہ لا متناہی چلتا رہے)۔ چونکہ درکار توجیہہ/وضاحت خود مختار اور ازلی ہے اس لیے سائنس کبھی اس بحث میں شامل نہیں ہو سکتی کیونکہ سائنس کا دائرہ کار مشاہداتی اور منحصر چیزوں تک محدود ہے۔

ایک روحانی بات پر اختتام:

خدا کا یہ تعارف کوئی علمی مشق نہیں ہے بلکہ یہ خدا کی محبت اور چاہت کا احساس پیدا کرتی ہے. ہم نے اس باب میں صرف یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خدا ایک لازمی وجود/واجب الوجود ہے اور تمام اشیاء اسی کی وجہ سے وجود رکھتی ہیں۔ ہم انسان صرف فلسفیانہ قضیوں اور مسئلوں کے نتیجوں میں ہی خدا کے محتاج نہیں ہے بلکہ حقیقتاََ ہر حوالے سے اس ذات کے محتاج ہے چاہے وہ جسمانی ہو یا روحانی.

ایک چھوٹی سی کہانی اسی حوالے سے پیشِ خدمت ہے جو یہ بتاتی ہے کہ چونکہ ہم چار و ناچار اللہ تعالیٰ کے وجود کے ہی محتاج ہیں اور دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی صرف اللہ کے فضل سے ہی ممکن ہے لہذا ہمیں اللہ تعالیٰ کی ہی بندگی اختیار کرنی چاہیے اور اسی کی خوشنودی تلاش کرنی چاہیے:

''اک دن میں اپنے چھوٹے سے کتے کیساتھ اپنے کھیتوں کے دورے پر نکلا جو کہ کھیتی خراب کرنے والے بندروں کا سخت دشمن ہے۔وہ سخت گرمیوں کے دن تھے. میں اور میرا کتا گرمی کی شدّت کی وجہ سے صحیح سے سانس بھی نہیں لے پا رہے تھے. مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم میں سے کوئی کسی بھی لمحے گر کر بے ہوش ہو جائے گا. پھر اللہ کے فضل سے ایک درخت نظر آیا جس کے نیچے بہترین سایہ موجود تھا. میرا کتا خوشی سے ممیاتے ہوئے چھاؤں کی طرف چل دیا.

جب وہ درخت کے نیچے پہنچ گیا تو وہاں رکنے کے بجائے واپس میرے پاس ہانپتا ہوا آ گیا. اسکو ہانپتا دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تھکن سے چور تھا. میں سائے کی طرف چل دیا یہ دیکھ کر میرا کتا خوش ہو گیا. پھر میں نے کچھ دیر کے لیے اسے اپنے راستے پر چلتے رہنے کا تاثر دیا، بیچارہ جانور تھوڑا درد بھرا غرغرایا لیکن پھر دم دبا کر میرے پیچھے چل دیا.

وہ واقعی تھکن سے چور تھا لیکن کسی قیمت میرا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا. اس کی اس ادا نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا. اس جانور کی حد درجہ وفاداری کو کوئی کیسے سمجھے جبکہ وہ وفاداری کرتے ہوئے بغیر کسی دباؤ کے اپنی جان کی پرواہ بھی نہ کرے. یہ مجھ سے وفادار ہے صرف اس لئے کہ یہ مجھے اپنا آقا جانتا ہے اسلیئے اپنی زندگی کی بازی لگانے کو بھی تیار ہے. یا مرے اللہ، میں کراہ گیا، میری بیمار روح کو شفا بخش دے، مرے آقا

مجھے اس جاندار کی طرح اپنا وفادار بنادے جسے میں حقارت سے کتا کہتا ہوں. مجھے بھی وہ طاقت عطا فرمادے کہ میں بلا کم وکاست، بغیر سوال اٹھائے تیرے بتائے راستوں پر چلوں. میں اس کتے کا خالق نہیں لیکن یہ میرا ہی وفادار ہے اور وہ بھی بیشمار پریشانیوں کے ساتھ. یااللہ یہ تو ہے جس نے اس کتے کو یہ خوبی عطا فرمائی. اے مرے رب، یہ خوبیاں اسے بھی عطا فرمادے جو آپسے انکا سوال کرے، جیسے میں نے کیا، محبّت اور بے لوث اطاعت کی ہمّت. پھر میں واپس درخت کی پر سکون چھاؤں میں جا بیٹھا اور میرا چھوٹا سا ساتھی بھی مرے سامنے ایسے آبیٹھا جیسے کوئی سنجیدہ بات کرنا چاہتا ہو"(167)

حوالہ جات:

Analogy adapted from Wainwright, W.]. (1988) 158 Philosophy of Religion. 2nd. Edition. Belmont, CA: Wadsworrh Publishing.

The Qur’an, Chapter 3, Verse 97.159

The Qur’an, Chapter 35, Verse IS.160

Ibn Kathir, 1. (1999) Tafsir al-Qur'an al-'Adheem. 161
Edited by Saami As-Salaama. 2nd Edition. Riyadh: Dar Tayiba. Vol 6, p. 541.

Hossein, S. (1993) An Introduction to Islamic 162
Cosmological Doctrines. Albany: State University of New York Press, pp. 197-200.

Al-Ghazali, M. (1964) Fada'ih al-Batiniyya. Edited by 163
Abdurahman Badawi. Kuwait: Muasassa Dar al-Kutub al-Thiqafa, p. 82.

Craig, W. L. (2008) Reasonable Faith: Christian Truth 164
and Apologetics. 3rd Edition. Wheaton, Illinois: Crossway Books, p. 109.

Godwin, S. J. (no date) Transcript of the 165
Russell/Copleston radio debate. Available at: http://www.scandalon.co.uk/philosophy/cosmological_radio.htm [Accessed 4rh October 2016].

Adapted from Craig, W.L. Reasonable Faith. 166
Available at: http://www.reasonablefaith.orgl defenders-1-podcast/ transcript/ s04-0 1 [Accessed: 24rh October 2016].

Eaton, G. (2001) Remembering God: Reflections on 167
Islam. Lahore: Suhail Academy, pp.18-19.

اِخلاقیات کی غیر الہامی [سائنسی، تاریخی، فطرتی] بنیادوں کا داخلی محاکمہ

جدید زمانے کے مذہب مخالفین، خود کو عقل پرست کہنے والے اور چند سیکولر لوگ یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ اخلاقیات (خیر وشر، اہم وغیر اہم) یعنی قدر کا منبع الہامی کتاب نہیں ہونا چاہیئے (کیوں؟ بعض کے نزدیک اس لیے کہ مذہبی اخلاقیات ڈاگمیٹک ہوتی ہیں، بعض کے نزدیک اس لیے کہ ان کی عقلی توجیہہ نہیں ہوتی اور بعض کے نزدیک اس لیے کہ وہ سرے سے وحی کو علم ہی نہیں مانتے، مگر یہ 'کیوں' فی الحال ہمارے لیے اہم نہیں)۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ اچھا یہ بتاؤ کہ پھر اخلاقیات کی بنیاد کیا ہے تو انکے مختلف لوگ مختلف دعوے کرتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ہم اخلاقیات کی انہی معروف غیر الہامی بنیادوں کے اصولی مسائل اور داخلی تضادات پر روشنی ڈالیں گے۔

1)سائنس سے اخلاقیات کشید کرنے والوں کی خدمت میں

ہمارے یہاں کے ملحدین اور عقل پرستوں میں سائنسی تحقیقات کی بنیاد پر اخلاقیات یا قدر کا اثبات کرنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اس کی سرے سے کوئی بنیاد ہے ہی نہیں۔ جو لوگ اخلاقی معاملات طے کرنے کے لیے سائنسی تحقیقات پیش کرتے ہیں انہیں اتنی بنیادی بات کی خبر بھی نہیں کہ سائنسی تجربات کا دائرہ 'کیا ہے' (what is) جب کہ اخلاقیات کا 'کیا ہونا چاہیے' (what ought to be) ہے۔ (یہ الگ بحث ہے کہ سائنس کی بذات خود اپنی اقدار بھی ہیں مگر یہاں ہم بحث کو پیچیدہ نہیں کرنا چاہتے۔)۔ بنیادی منطق پڑھے لوگ بھی اس امر سے واقف ہی کہ 'کیا ہے' کے دعوے سے 'کیا ہونا چاہیے' کا دعوٰی منطقی طور پر اخذ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ دو الگ دائرے ہیں (بالکل اسی طرح جیسے 'ایک کلو' کا موازنہ 'ایک فٹ' سے نہیں کیا جا سکتا۔)مزید تفصیل۔ دوسرے لفظوں میں 'کیا ہے' کا دعوٰی 'کیا ہونا چاہیے' کی دلیل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ 'کیا ہونا چاہیے' کا دعوٰی اخذ کرنے کے لیے دلیل میں لازماً ایک نارمیٹو (normative) یعنی 'کیا ہونا چاہیے' کا دعوٰی موجود ہونا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ایسا استدلال دو نا قابل موازنہ دعووں کا غیر منطقی مجموعہ ہوگا۔ مثال کے طور پر یہ دعویٰ لیجئے کہ 'چرس کے استعمال سے انسانی موت واقع ہو جاتی ہے' (ایک پوزیٹو یا مثبت دعوٰی)۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ 'چرس نہیں پینی یا نہیں اُگانی چاہیئے، (نارمیٹو یا اخلاقی دعویٰ)؟ ہرگز نہیں، جب تک دلیل میں پہلے دعوے کے ساتھ یہ نارمیٹو دعٰوی 'فرض' نہ کر لیا جائے، کہ انسانی زندگی کو تلف نہیں کرنا چاہیئے یا انسان کو بچانا چاہیئے، اس وقت تک اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ 'چرس پینی چاہیئے یا نہیں'۔ چنانچہ عقلاً ایسا کوئی اخلاقی دعویٰ نہیں دکھایا جا سکتا جس کی پشت پر ایک مفروضہ نارمیٹو دعٰوی موجود نہ

ہو(اس اصول کا ایک اہم نتیجہ ذیل میں عقل کی بحث کے ضمن میں بیان ہوگا جس سے یہ دلیل مکمل ہوگی)۔

اس اصولی گفتگو سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ جو عقل پرست لوگ سائنسی تحقیقات کا حوالہ دے کر کسی فعل کے صحیح یا غلط ہونے کا اخلاقی جواز دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ کیسی فاش اور مضحکہ خیز منطقی غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ سمجھنا کہ قدر کے سوال میں سائنس ہماری رہنمائی کرے گی ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں، سائنسی تحقیقات اس حوالے سے عقل پرستوں کو کہیں نہیں لے جاسکتی، 'انسان کو قتل کرنا چاہیئے یا نہیں' سائنس اس بات کا جواب دینے کے لیے کلیتاً بے کار شے ہے(یہ الگ بات ہے کہ ہم سائنس کی مفروضہ اخلاقیات کو پہلے مان لیں، مگر اس صورت میں پھر اس اخلاقی چوائس اور ترجیح کا جواز پیش کرنا ہوگا)۔

2)تاریخی عمل سے اخلاقیات کشید کرنے والوں کی خدمت میں

جب اخلاقیات کیلیے سائنسی بنیاد کو منہدم کر دیا جائے تو یہ عقل پرست اخلاقی قضیوں کے جواز کیلیے 'تاریخی عمل سے تشکیل پانے والے انسان کے اجتماعی شعور' کا حوالہ دینے لگتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی تاریخ اور اجتماعی شعور سے اخلاقی سبق سیکھتا رہتا ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح، کیا فائدہ مند ہے اور کیا نقصان دہ وغیرہ (یعنی سچ بولنا، انسانیت کا احترام وغیرہ یہ سب تاریخی عمل سے سیکھے ہوئے اخلاقی تصورات ہیں)۔ اس اجتماعی شعور کے نتیجے میں انسان غلط کو ترک کرتا اور صحیح کو اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ان کے خیال میں اس

تاریخی عمل میں مذہب بھی کسی طور ان معنی میں شامل کیا جاسکتا ہے کہ مخصوص دور تک کے انسانوں نے اپنے تاریخی تجربات سے جو کچھ سیکھ لیا تھا چند اچھے اور بھلے لوگوں (جنہیں اہل مذہب انبیاء کہتے ہیں) نے ان اقدار کو معاشرے میں بطور عقیدہ متعارف کروادیا، مگر چونکہ انسانی شعور کی تعمیر کا یہ سفر جاری وساری ہے لہٰذا انسان کو ماضی کے ان اقداری تصورات کو قصہ پارینہ سمجھ کر بھول جانا چاہیے اور دورِ حاضر کی علمیت (یعنی سائنس وسوشل سائنس) کی روشنی میں اقدار اختیار کرنا چاہیے۔ یہ دلیل بلکہ کہانی سُنا کر وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ساری اخلاقی گتھیاں ہمیشہ کیلیے سلجھادی ہیں۔

مگر یہ کہانی اپنے اندر اس قدر غیر منطقی، باہم متضاد اور غیر ثابت شدہ مفروضات سموئے ہوئے ہے کہ ان کا احاطہ کرنے کیلیے ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ خوفِ طوالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہاں چند ایک کی نشاندہی کئے لیتے ہیں:

1) انسانی تاریخ ایک مسلسل عمل (continuous process) اور سفر کا نام ہے۔ ظاہر ہے یہ صرف ایک مفروضہ ہے جسے چند ایک فلسفیوں کے سوا دیگر نہیں مانتے۔

2) یہ تاریخی عمل یک جہتی خط مستقیم (linear path) پر سفر کرتا ہوا ایک عمل ہے، یعنی تاریخی عمل ہمیشہ پیچھے سے آگے کی طرف بڑھتا ہے نیز یہ سفر کبھی معکوس سمت میں نہیں چل سکتا۔ یہ بھی محض ایک مفروضہ ہے نیز اس کے خلاف بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی فخریہ انداز سے برہنہ حالت میں کھیلوں کا مظاہرہ کیا کرتے تھے مگر عیسائیت کے غلبے کے بعد لوگوں نے ایک طویل عرصے تک ایسا کرنا چھوڑے رکھا یہاں تک کہ تنویری فکر کے غلبے کے بعد یورپی اور امریکی معاشروں میں

یہ فعل دوبارہ راسخ ہونا شروع ہو گیا۔ اسی طرح دورِ جاہلیت کے عرب شرم کے باعث اپنی بچیوں کو زندہ در گور کر دیتے تھے، پھر ایک عرصے تک اسے برا سمجھا جاتا رہا، یہاں تک کہ یہ فعل دنیا میں دوبارہ ابورشن کے حق کے نام پر لوٹ آیا (آج انڈیا میں کئی ایسے گاؤں ہیں جہاں لڑکیاں معدوم ہوتی جا رہی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ خواتین پیدائش سے قبل بچے کی جنس لڑکی معلوم ہونے پر اسقاط حمل کرا لیتی ہیں)۔ اسی طرح سود کی اخلاقی شناعت کے حوالے سے معکوس سمت میں تبدیل ہوتے انسانی اخلاقی رویوں کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے۔

3) کیا اس دنیا میں مطالعہ تاریخ اور اس سے نتائج اخذ کرنے کا ایک ہی مخصوص طریقہ کار اور نظریہ ہے؟ ظاہر ہے ایسا تو ہرگز بھی نہیں، مثلاً ہیگل، مارکس، کومٹے، سپنسر، فوکو وغیرہ مختلف نظریات اور مفروضوں کی بنیاد پر تاریخی عمل کا مطالعہ کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک طرزِ عمل ایک مفکر کے مطابق اخلاقاً درست ہوتا ہے جبکہ دوسرے کے مطابق غیر اخلاقی قرار پاتا ہے۔ مثلاً 'جذبہ مسابقت' کو لیجئے، مارکس کے نزدیک یہ ظلم اور استحصال کو فروغ دیتا ہے جبکہ سپنسر اور دیگر سوشل ڈارونسٹ مفکرین کے خیال میں یہ انسانی فطرت کا عمدہ اور جائز ترین اظہار ہے۔

4) ان میں سے جو بھی منہج اختیار کر لیا جائے اسکی علمی حیثیت ایک رائے (perspective) سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو گی، اور یہ رائے کسی صورت غیر اقداری یا نیوٹرل نہیں ہو گی کیونکہ آپ اس کے 'اندر رہتے ہوئے' تاریخ کو دیکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے تاریخ کے مختلف ادوار اور دھاروں کے اندر رہنے والے لوگ تاریخ کو چند دیگر نظریات و آراء سے دیکھ کر مختلف نتیجے نکالیں گے نیز ان میں سے ہر ایک کو اپنے نظریہ سے نکلنے والی تاریخ ہم آہنگ دکھائی دے گی اور دوسرے کی لایعنی (یہ درحقیقت استقراء کا ایک

بنیادی مسئلہ ہے کہ ایک ہی قسم کے مشاہدات کی توجیہہ ایک سے زیادہ مفروضات کے ذریعے کرنا ممکن ہوتا ہے)

5) مطالعہ تاریخی عمل اور اس سے نتیجہ نکالنے کے مختلف مناہیج میں سے کون سا منہج درست ہے اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے گا، یہ فیصلہ کون اور کس بنیاد پر کرے گا؟ پھر کیا اس فیصلہ کرنے کا پیمانہ تاریخی عمل کے اندر ہو گا یا اس سے باہر؟ اگر کہا جائے کہ وہ پیمانہ تاریخی عمل کے اندر ہو گا تو یہ باہم متضاد بات ہے، اس لیے کہ جب 'تاریخ کیا ہے' بذات خود ایک منہج سے طے ہوتا ہے اور مختلف مناہیج و نظریات 'تاریخ کے مختلف تصورات' پیش کرتے ہیں تو یہ تاریخ اور اسکے مختلف تصورات بذات خود ان مناہیج پر فیصل حیثیت کیسے اختیار کر سکتے ہیں، یہ تو خود ان سے نکلے (outcome) ہیں؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ پیمانہ تاریخی عمل سے باہر ہو گا تو وہ کہاں سے آئے گا اور کون دے گا؟ نیز یہ بھی باہم متناقض بات ہے کہ ایک طرف تو آپ یہ دعوی کر رہے ہیں کہ علم تاریخی عمل سے آئے گا مگر اسکی صحت طے کرنے کا پیمانہ اس سے باہر ہے، سوال یہ ہے کہ جب امکانِ علم ہی تاریخ سے آتا تو اس سے باہر جانے کا امکان کہاں سے آیا؟

6) اگر کوئی ایک منہج طے کر ہی لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تاریخی عمل درست سمت میں جا رہا ہے یا غلط سمت میں، اس کا فیصلہ کیسے ہو گا؟ ظاہر ہے تاریخی عمل سے وجود میں آنے والا اجتماعی شعور بذات خود اپنا جواز نہیں بن سکتا جب تک کہ یہ 'فرض' نہ کر لیا جائے کہ 'یہ ٹھیک ہوتا ہے اسے مان لو'۔ پس جب کسی پیمانے پر یہ طے ہی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عمل ٹھیک سمت میں جا رہا ہے یا نہیں، تو تاریخی عمل کو اخلاق اعمال کے جواز کے طور پر پیش کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

7)فرض کرلیں اگر یہ تاریخی عمل درست ہے بھی، تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے بطور فرد اسے کیوں قبول اور اختیار کرلینا چاہیے؟ آخر بطور آزاد ہستی میں اسے رد کرکے اس کے خلاف رویہ کیوں نہ اختیار کروں (خصوصاً اُس صورت میں کہ جب یہ معلوم ہی نہیں کہ حاضر وموجود درست ہے بھی یا نہیں)؟

3)'تصور فطرت' سے اخلاقیات کشید کرنے والوں کی خدمت میں

بہت سے عقل پرست انسانی فطرت کو بھی اخلاقی اعمال کے جواز کے طور پر پیش کرتے ہیں (یعنی فلاں عمل فطرت کا تقاضا ہے یا فطرت کے خلاف ہے، لٰہذا ایسا کرنا یا نہیں کرنا چاہیئے وغیرہ)۔ آگے بڑھنے سے قبل یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ لفظ 'فطرت' دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، ایک پوزیٹو (مثبت) اور دوسرا نارمیٹو (معیاری)۔ پوزیٹو معنی میں فطرت سے مراد 'کسی کام کو کرنے کی صلاحیت' (ability to do something) ہوتی ہے، ان معنی میں سچ بولنا، محبت کرنا، کسی کی مدد کرنا، دوسرے انسان کی جان لے لینا، محرم رشتوں سے بدکاری کرنا، جھوٹ بولنا، نفرت کرنا، دھوکہ دینا وغیرہ تمام فطری کام ہیں اس لیے کہ انسان میں یہ سب کرنے کی 'صلاحیت' موجود ہے۔ نارمیٹو معنی میں فطرت سے مراد 'نارمل، معیاری یا جائز رویہ، ہوتا ہے، یعنی یہ سوال اٹھایا جائے کہ سچ بولنا نارمل ہے یا جھوٹ، محبت جائز عمل ہے یا نفرت، کسی کو قتل کردینا اہم ہے یا بچالینا، محرم رشتوں کا تقدس ہونا چاہیئے یا ان کے ساتھ بدکاری، مزامیر پر موسیقی کی سماعت درست ہے یا اسکا نہ سننا وغیرہ۔ چنانچہ جب اخلاقی اعمال کا جواز فطرت سے پیش کیا جاتا ہے تو لفظ فطرت اس دوسرے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، یعنی یہ دعٰوی کیا جاتا ہے کہ ' نارمل

وابنارمل، معیاری وغیر میعاری، جائز وناجائز انسانی رویوں اوراحساسات کا فیصلہ مطالعہ فطرت کی روشنی میں کرنا ممکن ہے۔

مگر انسانی فطرت کو ماٰخذ اخلاق پیش کرنے میں نہایت بنیادی نوعیت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس انسانی فطرت کی روشنی میں خیر وشر، جائز وناجائز کا فیصلہ کرنے کا دعویٰ کیا جارہا ہے وہ 'انسانی فطرت کیا ہے' اس کا تعین کیسے ہوتا ہے؟ اسکی تعیین کا ایک طریقہ وہ ہے جو اجتماعیت پسند مفکرین بتاتے ہیں کہ فطرت انسانی کا فیصلہ تاریخی عمل سے وجود میں آنے والے انسانی شعور سے ہوتا ہے، مگر اس فکر کی بنیادی خامیاں اوپر بیان کردی گئیں۔ اسکا دوسرا طریقہ وہ ہے جو انفرادیت پسند مفکرین پیش کرتے ہیں جن کے خیال میں انسانی فطرت کا تعین انسان کو زمان ومکان سے ماوراء (asocial and ahistorical) تصور کرکے کیا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر ہم انسان کو معاشرے اور وقت سے ماقبل اور ماوراء اور ان سے علیحدہ کرکے ایک آزاد ہستی کے طور پر تصور کریں تو وہ اسکی 'حالت اصلی' یا 'فطری حالت' ہوگی، اس اصلی حالت میں انسان جو کرے گا یا کرنا چاہے گا وہی اس کی فطرت کا جائز اظہار ہوگا (اس طریقے کے تحت انسانی فطرت کی تمیز قائم کرنے کی ایک کوشش مشہور فلسفی جان رالز کی کتاب theory of justice میں ملتی ہے، مگر اجتماعیت پرست مفکرین کے نقد کے بعد رالز کو اپنی اس پوزیشن سے رجوع کرنا پڑا، اس دلچسپ بحث کے مطالعے کیلیے دیکھئے کتاب Liberal and Communitarians by Stephen Mulhall and Adam Swift)۔ یہ دلیل دینے والوں کا مقصد یہ کہنا ہوتا ہے کہ چونکہ معاشرے میں رہنے کی وجہ سے انسان کی فطرت بہت سے خیالات، میلانات، معاشرتی رویوں اور سیاسی جکڑبندیوں کی وجہ سے مسخ

ہو جاتی ہے لہٰذا اصل فطرت کی دریافت کیلیے ضروری ہے کہ اسے معاشرے سے علیحدہ کرکے اور کاٹ کر دیکھا جائے۔اس طریقہ مطالعہ میں بہت سے بنیادی نوعیت کی خامیاں وکمزوریاں ہیں:

1)سب سے بڑامسئلہ یہ ہے کہ یہ طریقہ ایک ایسی شے جو کٹی ہوئی ہے ہی نہیں اسے کٹی ہوئی فرض کرکے نتیجے نکالنے کی کوشش کرتا ہے، یعنی جو ہے یہ جزو اسے کلیت سے علیحدہ فرض کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک لا متصور شے کو متصور کرنے کی لا حاصل کوشش کے سواء کچھ نہیں۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی معاشرے کی، ماقبل معاشرہ انسان کا نہ تو کوئی تاریخی ریکارڈ موجود ہے کہ جس کی روشنی میں یہ طے کیا جاسکے کہ وہ 'اصلی انسان' کیسا تھا اور نہ ہی ایسا فرض کرنے کی کوئی علمی بنیاد ہمارے پاس موجود ہے۔ معلوم انسانی تاریخ میں تو انسان ہمیشہ معاشرے کے اندر ہی پایا گیا ہے اور اسی کے اندر سے وہ اپنی شناخت، نظریات و رجحانات دریافت کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار اور مختلف قسم کے معاشروں میں پیدا ہونے والے لوگ کے 'فطری و غیر فطری' کے رجحانات و میلانات مختلف ہوتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہزارہا سال کی انسانی تاریخ اور معاشرتی وسیاسی عمل سے گزر جانے اور ان سے نجانے کن کن طریقوں سے متاثر ہو جانے کے بعد آج کون سا شخص اور کس بنیاد پر یہ دعوی کرسکتا ہے کہ فطرت نے اسے کیسا بنایا تھا؟ آخر 'کون' اور 'کس بنیاد پر' یہ طے کرے گا کہ 'اس کے 'میلانات اور رجحانات 'فطری' (بمعنی حالت اصلی کا اظہار) ہیں؟ یہ کس طرح طے ہوگا کہ آج جو ہمارے میلانات ہیں ان میں سے 'کون سے 'میلانات اور 'کس حد تک 'اصلی ہیں جبکہ دیگر معاشرتی حالات کی پیداوار ہیں؟ درحقیقت معاشرے سے ماقبل انسان کا تصور بدیہی طور پر ایک لغو (absurd) تصور ہے۔

2) درحقیقت اپنی مخصوص تاریخی و معاشرتی جکڑبندیوں کا شکار ہر شخص اس طریقہ کار کے تحت اپنی 'حالت اصلی' کا ایک مختلف تصور قائم کرے گا اور ان مختلف تصورات 'حالت اصلی' میں تمیز قائم کرنے کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہوسکتی۔ مثلاً رالز ہی کی مثال لیں، اسکے خیال میں انسان کی اصلی حالت یہ ہے کہ وہ خود کو 'آزاد'، قائم بالذات، اپنے ذاتی مفادات کے حصول کا حریص انسان تصور کرے'۔ ظاہر ہے اس تصور کو اصلی کہنے کی کوئی علمی دلیل نہیں، رالز نے انسان کی حالت اصلی کے بارے میں یہ رائے اس لیے قائم کی کیوں کہ وہ جس مغربی معاشرے میں پیدا ہوا وہاں فرد کی آزادی اور مفادات کے تحفظ کو بنیادی فوقیت دی جاتی ہے لہٰذا رالز نے اسی کو حالت اصلی 'فرض' کرلیا۔ اسکے برعکس ایک قبائلی معاشرت کے انسان کیلیے ذاتی آزادی اور مفاد کوئی معنی نہیں رکھتے، وہ خود کو قبیلے کا رکن تصور کرتا ہے اور اسی کو حالت اصلی سمجھے گا۔ اسی طرح رالز کی ملحدانہ عقل کے برعکس ایک مسلمان کی عقل اسے یہ بتاتی ہے کہ اسکی حالت اصلی (فطرت) 'خدا کا بندہ' ہونا ہے (وہ اَلَستُ بِرَبِّکُم قَالُوابَلٰی کا نعرہ بلند کرتا ہے)۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان عقل پرستوں کے پاس آخر وہ کون سا علمی پیمانہ و بنیاد ہے جس کے ذریعے یہ ان مختلف تصورات فطرت میں تمیز قائم کرکے 'اصلی حالت' کا تعین کرسکتے ہیں؟ اور جب ایسا کوئی پیمانہ ہے ہی نہیں تو پھر اس دعوے سے زیادہ لغو بات اور کیا ہوگی کہ 'فلاں کام انسانی فطرت کے مطابق یا خلاف ہے، لہٰذا اسے کرنا یا نہیں کرنا چاہیئے؟

4) 'عقلیت' سے اخلاقیات کشید کرنے والوں کی خدمت میں:

درج بالا گفتگو کے بعد اس قضئیے پر تفصیلی بحث کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی، البتہ ایک اصولی بات سمجھ لینی چاہیے کہ تصورِ عقل دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، جوہری اور آلاتی substantive and instrumental rationality۔ جوہری عقلیت کا معنی یہ ہے کہ ہم عقل کے سامنے یہ سوال رکھیں کہ خیر و شر کیا ہے، حقیقت کا سراغ کیسے لگایا جائے، مقاصدِ حیات کی تعیین و ترتیب کس طرح طے ہو۔ اسکے مقابلے میں آلاتی عقل کا معنی یہ ہے کہ عقل سے کسی 'طے شدہ' مقصد کے حصول کا طریقہ معلوم کیا جائے۔ چنانچہ یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ دماغی عقل میں جوہری عقلیت کی صلاحیت نہیں، یعنی وہ اس بات کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتی کہ خیر و شر کیا ہے نیز مقاصد حیات اور انکی باہمی ترتیب کیا ہو۔ دماغی عقل کے لیے صرف یہ ممکن ہے کہ آپ اسے کسی طے شدہ مقصد کے 'ذریعہ حصول' کے طور پر استعمال کریں، یعنی عقل یہ تو نہیں طے کر سکتی کہ مقصد ادائیگی حج وہ یا فٹ بال کھیلنا، البتہ عقل اس امر میں ضرور مددگار ہو سکتی ہے کہ ادائیگی حج یا فٹ بال کا بہترین انتظام کیسے ہو۔ اسی بات کو امام اشعریؒ و غزالیؒ نے فتنہ اعتزال کے تناظر میں صدیوں پہلے بتا دیا تھا کہ عقل خیر و شر کے تعین کی اہلیت نہیں رکھتی یہ خالصتاً شرعی اوصاف ہیں۔ یعنی جو بات مغربی فلسفیوں کو بیسویں صدی میں سمجھ آئی، امام غزالیؒ نے ہزار سال قبل ہی اسکی وضاحت کر دی تھی۔ مزید تفصیل۔

چند مغربی فلسفیوں نے اخلاقیات کی خالصتاً عقلی توجیہات پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے جن میں سر فہرست نام کانٹ کا ہے۔ اسکی فکر کا حاصل یہ ہے کہ ہر وہ خواہش جسے ایک انسان مقصد میں ٹکراؤ آئے بغیر سب کو پورا کرنے کی اجازت دے سکتا ہے وہ جائز ہے۔ مگر کانٹ کی فکر کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ یہ آزادی کو مفروضے کے طور پر قبول کرتی ہے نیز یہ محض ایک ساخت ہے جس کے اندر سوائے انسانی

خواہشات کسی شے کا گزر نہیں، دوسرے لفظوں میں کانٹ کے خیال میں اخلاقیات کا مافیہ ہم آہنگی کے ساتھ خواہشات کا حصول ہے۔ پھر کانٹ کے اس فریم ورک میں خواہشات کی ترتیب قائم کرنے کا کوئی پیمانہ نہیں، یعنی یہ اصول فرد کو یہ نہیں بتاتا کہ 'اسے کیا چاہنا چاہیئے'، یہ بس اتنا بتاتا ہے کہ ہر وہ فعل جو ہم آہنگی کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے وہ جائز ہے۔ یہ اور اس قسم کے مزید خامیوں کی بنا پر کانٹ کے اخلاقی فلسفے کو علمی دنیا میں اصولاً رد کر دیا گیا (یہ اور بات ہے کہ عملاً اسے قانون کے دائرے میں اب بھی کسی نہ کسی درجے میں برتا جارہا ہے)۔

عقل سے اخلاقیات اخذ کرنے کی مشکلات کو ایک مزید زاویے سے دیکھیں۔ اوپر اس بات کی وضاحت کی گئی کہ اخلاقی دعٰوی اخذ کرنے کیلیے دلیل میں اخلاقی دعوی موجود ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر ایک نارمیٹو دعوے کے اثبات کیلیے آپ کو دوسرا نارمیٹو دعوی چاہئے، پھر اس دوسرے کا جواز آپ تیسرے سے دیتے ہیں، اور اگر آپ ہر پچھلے نارمیٹو دعوے پر 'یہ کیوں نہ مانا جائے' what is its justification? کا سوال اٹھاتے چلے جائیں تو آخر میں ایک ایسا نارمیٹو دعوی بچے گا جسے آپ کی عقل بدیہی self-evident، یعنی اپنی دلیل از خود ماننے پر مجبور ہو گی، یعنی آپ کہیں گے کہ بدیہی دعوی ایک شخص کا ایمان ہوتا ہے جسے وہ 'عقل' اور 'اِخلاق کے پیمانے' کے طور پر مانتا ہے۔ درحقیقت جب عقل پرست مذہبی لوگوں کو کہتے ہیں تم عقل کی بات نہیں مانتے تو اسکا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ 'تم ہماری عقل کی طے کردہ تعریف کیوں نہیں مان رہے؟'۔ ان عقل پرستوں کے ہاں عقل کا معنی انسان کو قائم بالذات اور اسکی لامتناہی خواہشات کی تسکین کو مقصد حیات مان لینا ہے۔ یہی کلمہ خبیثہ انکی مزعومہ اخلاقیات کی اصل بنیاد ہے، جو انکی اس خود ساختہ عقل کی تعریف کو نہ مانے یہ اس پر جاہل، وحشی،

غیر مہذب اور غیر عقلی کے القابات چسپاں کر دیتے ہیں۔ انکے یہاں عقل اور قدر کا مطلب انسانی آزادی میں اضافہ ہے اور چونکہ آزادی کی عملی شکل اور تجسیم سرمایہ capital ہے لہٰذا سرمایہ ہی انکے یہاں ہر عمل کی قدر متعین کرنے کا اصلی پیمانہ ہے۔ جو خواہشات اور اعمال بڑھوتری سرمائے میں زیادہ ممد و مددگار ہوتی ہیں مغربی (سرمایہ دارانہ) معاشروں میں انکی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے اور ان کا اجتماعی نظم فرد کو انہی خواہشات و اعمال کو اختیار کرنے پر راغب اور مجبور کرتا ہے۔ خواہشات کی جو ترتیب فرد کو حصول سرمائے کا مکلّف نہیں بناتی یہ نظام ایسی ترتیبِ خواہشات رکھنے والے شخص کو سزا دیتا ہے (جس کی شکلیں آمدن میں انتہائی حد تک کمی، معاشرتی اخراج، معاشرے میں شمولیت کے مواقع میں کمی وغیرہ کی صورت ہوتی ہے)۔ چونکہ سرمائے میں اضافے کی یہ جدوجہد حرص و حسد کے عمومی فروغ کے بغیر ممکن العمل نہیں، لہٰذا حرص و حسد اور شہوت کا فروغ ہی انکے نزدیک فطری انسانی کیفیات ہیں اور یہی عقلیت کا وہ پیمانہ ہیں جنہیں اختیار کرکے فرد اپنا مقصد (آزادی میں اضافہ) حاصل کرنے لائق بنتا چلا جاتا ہے۔ جو جتنا زیادہ حریص، دنیا پرست اور شہوت سے مغلوب ہوتا ہے ان معاشروں میں اتنی ہی زیادہ کامیابی سے ہمکنار ہوتا چلا جاتا ہے۔

جدید انسان کی سرکشی کی عجیب کہانی:

اٹھارویں صدی کے ملحد فلاسفہ نے یہ بلند و بانگ دعوی کرکے مذہب کو رد کر دیا تھا کہ ہم حقیقت، سچ، معنی، قدر، عدل اور حسن کو وحی کی بنیاد پر قبول کرنے کے بجائے انسانی عقل پر تعمیر کریں گے، انکا

دعوٰی تھا کہ حقیقت، سچ، معنی، قدر، عدل اور حُسن کی جو تشریح ہم دریافت کر کے بیان کریں گے چونکہ وہ عقلی ہوگی، کسی مفروضے پر نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہوگی، لہٰذا دنیا کے سب انسان اسے ماننے پر مجبور ہونگے۔ مگر پھر کیا ہوا، دوسو سال کی فلسفیانہ لم ٹٹول اور نتیجہ: ''انسان اپنے کلیات سے حقیقت، سچ، معنی، قدر، عدل اور حسن جان ہی نہیں سکتا''۔

اس مقام پر انسان کو اصولاً اپنی علمی کم مائیگی اور دامن کی تنگی کو پہچان کر اپنے رب کے حضور جبین نیاز خم کر دینی چاہیے تھی کہ اس نے اپنے پالن ہار کے آگے سرکشی کر کے خود خدا بننے کا جو دعوی کیا تھا اس دعوے کے حصول میں چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔ مگر یہ کیسا عجیب معاملہ ہے کہ جو شکست اسکی آنکھیں کھول دینے کیلیے بہت کافی ہو جانی چاہئے تھی اس نے اپنے رب کی اسی نشانی کو اپنی سرکشی میں مزید اضافے کا ذریعہ بنالیا۔ بجائے اپنی شکست قبول کرنے کے آج کا جدید انسان اب یہ کہتا ہے کہ حقیقت، سچ، معنی، قدر، عدل اور حسن نامی کوئی شے ہوتی ہی نہیں، یہ محض اضافی و بے معنی تصورات ہیں۔ وہ زندگی کو ایک بے معنی کھیل تماشا سمجھتا ہے مگر غور نہیں کرتا کہ زندگی کو کھیل تماشا سمجھنا بذات خود ایک ایمان ہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حقیقت اور سچ کچھ نہیں مگر یہ نہیں سمجھ رہا کہ اسکا مطلب یہ دعوی کرنا ہے کہ سب کچھ ٹھیک اور سچ ہے (یعنی جو بھی چاہو اور کر لو وہ ٹھیک ہے)۔ اسی 'بے معنویت' کی طرف وہ انسانیت کو دعوٰی دیتا ہے۔ آج اپنے اس لغو دعوے کو وہ اپنی 'تلاش' قرار دے رہا ہے، جبکہ فی الحقیقت یہ دعوی صرف اور صرف اس کی 'شکست' (retreat) کا باغیانہ اعتراف ہے۔ مگر اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ موت اٹل ہے، اپنے رب کے حضور اسکی حاضری کا وقت بالکل قریب ہے، پھر کیا حال ہوگا اس وقت کہ جب اپنے دفاع کیلیے اسے پورا

موقع دیا جائے گا مگر کہنے کیلیئے اسکے پاس الفاظ ہی نہ ہونگے ؟...ہاں توبہ کا دروازہ ہر آن کھلا ہے اور اسکا رب بڑا کریم اور رحیم ہے۔

تحریر ڈاکٹر زاہد مغل

مسئلہ شر والم اور اسلام

انسانی وحیوانی ہمدردی کے حقیقی اور بجا احساس کے سبب بہت سے ملحد یہ استدلال کرتے ہیں کہ ایک قادر و رحیمِ مطلق خدا کا وجود دنیا میں شر والم کے وجود سے ناموافق ہے۔ اگر وہ 'الرحمٰن' ہے، تو اس کی خواہش ہو گی کہ دنیا میں شر والم کا خاتمہ ہو جائے، اور اگر وہ قادرِ مطلق ہے تو یہ خاتمہ اس کے اختیار میں ہونا چاہیے۔ مگر چونکہ شر والم دنیا میں موجود ہیں، اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ یا اس کی رحمت کامل نہیں یا اس کی قدرت مطلق نہیں یا پھر دونوں۔

مسئلہ شر والم کا یہ استدلال نہایت کمزور ہے کیونکہ اس کی بنیاد دو بڑے غلط مفروضوں پر ہے۔

پہلا مفروضہ خدا کی ماہیت سے متعلق ہے۔ یہ خدا کے صرف قادرِ مطلق اور رحیمِ کامل ہونے سے استدلال کرتا ہے اور اس طرح خدا کی ان دو صفات کو الگ کر کے دوسری تمام صفات کو نظر انداز کر دیتا ہے جنہیں قرآن میں وحی کیا گیا ہے۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ خدا نے ہمیں دنیا میں شر والم کی وجود کی کسی معقول وجہ سے مطلع نہیں فرمایا [یہ مفروضہ پروفیسر ولیم لین کریگ کے مسئلہ شر پر بحث سے مستعار لیا گیا ہے۔ مورلینڈ، ج۔ پ اور کریگ (۲۰۰۳)۔ نصرانی نظریات کی فلسفیانہ بنیاد۔ باب ۲۷]۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلامی روایات ہمیں بہت سے وجوہات سے مطلع کرتی ہیں جن کیلیے خدا نے شر والم کے وجود کی اجازت دے رکھی ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان دونوں مفروضوں سے بحث کی جائے گی۔

1۔ کیا خدا صرف 'رحیمِ کامل' اور 'قادرِ مطلق' ہے؟

قرآن کے مطابق، خدا 'القدیر' ہے، یعنی قادرِ مطلق، اور رحیمِ کامل جس سے مراد نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ اسلام انسانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک خدائے قوت و خدائے رحم و خیر پر ایمان لائیں۔ مگر ملحد اسلام کے خدا کے متعلق اس جامع تصور کو نہایت غلط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ خدا محض قادرِ مطلق اور رحیمِ کامل ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اور بھی بہت سے نام اور صفات ہیں۔ کلی طور پر ان اوصاف کو بذریعہِ وحدانیتِ خدا ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً خدا کے ناموں میں سے ایک 'الحکیم' ہے یعنی حکمتِ کامل رکھنے والا۔ چونکہ حکمت خدا کی ذات کا جزوِ لاینفک ہے، چنانچہ اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس کے تمام ارادے حکمتِ ربانی کے مطابق ہوتے ہیں۔ جب کسی چیز کی تشریح اس میں مضمر حکمتِ ربانی سے کی

جاتی ہے تو اس کے وجود کی کوئی معقول وجہ کا ہونا ناگزیر ہے۔ اس طرح، ملحدین کا خدا کو صرف دو صفات تک محدود کر دینا ایک یکطرفہ باطل مفروضہ کھڑا کرنے کا موجب بنتا ہے۔

کتاب "The Young Atheist's Handbook" کا مصنف الوم شاہا، خدائی حکمت کے ذریعہ دنیا میں شر والم کے وجود کی توجیہ کو ایک عقلی حیلہ گردانتے ہوئے کہتا ہے:

"مسئلہ شر عام معتقدین کی اکثریت کو واقعتاً لاجواب کر دیتا ہے۔ میرے تجربے میں، ان کا جواب عموماً ان خطوط پر ہوتا ہے، "خدا پراسرار طریقوں سے کام کرتا ہے"۔ کبھی وہ کہتے ہیں، "رنج والم ہماری آزمائش کا خدائی طریقہ ہے" جس کا واضح جواب یہ ہے کہ، "خدا کو اس طریقۂ شر سے ہی ہماری آزمائش کیوں لینا تھی؟" جس کا جواب ہوتا ہے "خدا پراسرار طریقوں سے کام کرتا ہے"۔ آگے آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔" (شاہا، آ۔ "The young atheist's Handbook" ص۔۵۱)

الوم باقی ملحدین کی طرح مغالطہ بوجہ جہالت (Argumentum ad ignorantum) کا شکار ہے، یعنی جہالت کی بنا پر استدلال کرنا۔ خدائی حکمت تک رسائی نہ ہو سکنے کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ اس حکمت کا کوئی وجود ہی نہیں۔ یہ ایک بچگانہ استدلال ہے۔ بہت سے بچوں کو ان کے والدین ان کی کسی طلب پر ڈانٹ دیتے ہیں، مثلاً بہت زیادہ مٹھائی کھانے پر۔ بچے عام طور پر رو پڑتے ہیں اور چیختے چلاتے ہیں کیونکہ ان کی دانست میں ان کے ماں باپ ان پر زیادتی کر رہے ہیں، لیکن بچے کی رسائی اس اساسی حکمت تک نہیں ہوتی۔ جب میں بچہ تھا، میرے والدین مجھے اپنے دادا کی شراب پینے کی کوشش کرنے پر ہمیشہ ڈانٹ دیتے تھے۔ چشم تصور میں ملاحظہ کیجیئے کہ ایک متحرک و متجسس بچہ اپنے دادا کو اس گاڑھی، سنہری، ریشمی جام کی

چسکیاں لیتے ہوئے محوِ نظارہ ہو۔ مجھے اس کی شدید طلب تھی! تاہم، جب بھی میں اس پر کشش مشروب کو چھپ کر پینے کی کوشش کرتا، بہت بڑی مصیبت میں پڑ جاتا۔ میں کبھی سمجھ نہ پایا کہ آخر کیوں؟ چنانچہ اپنے والدین کے بارے میں منفی خیالات میرے ذہن میں گردش کرتے۔ کئی سال گزرنے کے بعد، مجھے اب احساس ہے کہ وہ مجھے میرے دادا کی شراب پینے کی اجازت کیوں نہیں دیتے تھے؛ وہ میرے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ ۴۰ فی صد الکحل پر مشتمل شراب میرے ننھے پیٹ یا جگر کے لیے کسی طرح بھی مفید نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ جب میں چھوٹا تھا مجھے اس حکمت تک رسائی نہ تھی جس بنا پر میرے والدین مجھے روکتے تھے، بایں حال اپنے تئیں ان کے بارے میں میری منفی سوچ بالکل حق بجانب تھی۔ یہ خلاصہ ہے خدا کی جانب اس ملحد رویہ کا جو دنیا میں شر والم کو سمجھنے میں اپنایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں، یہ دعوی خدا کی ذات کی ایک غلط تعریف پر مبنی ہے۔ چونکہ خدا ایک ماورا، عالمِ کُل اور حکیم ہستی ہے، اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ محدود انسان خدائی حکمت کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ محض یہ بھی کہنا کہ ہم خدا کی حکمت کو مکمل سمجھ سکتے ہیں خدائی صفات کا دعوی ہے اور یہ بات خدا کی ماورائیت کے برخلاف ہے یا یہ نتیجہ برآمد کرتی ہے کہ خدا بھی انسانوں کی طرح محدود ہے۔ یہ استدلال کسی بھی ایمان والے کو متاثر نہیں کرتا، کیونکہ کوئی مسلمان بھی اس طرح کے تخلیق شدہ محدود خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ مزید خدائی حکمت کی طرف رجوع کرنا ہرگز کوئی عقلی حیلہ نہیں ہے کیونکہ یہ کسی پر اسرار لا معلوم شے کی طرف رجوع نہیں۔ بلکہ یہ استدلال خدا کی فطرت کو صحیح معنوں میں سمجھتے ہوئے منطقی نتیجے تک پہنچتا ہے۔ جیسے کہ میں ذکر کر چکا، خدا کے پاس مکمل تصویر ہے اور ہمارے پاس صرف اس کا ایک جزو۔

اگرچہ میں ان کے باشعور مخلوق کے رنج و تکالیف پر جذبہِ ہمدردی کا قدردان ہوں، لیکن اسکے ساتھ کچھ ملحد ایک پوشیدہ قسم کی نفس پرستی اور انانیت کا شکار ہوتے ہیں۔ یعنی وہ خصوصی کوشش کرتے ہیں کہ وہ دنیا کو اپنے سوا کسی اور کے نقطہء نظر سے نہ دیکھنے پائیں۔ البتہ ایسا کرتے ہوئے وہ ایک جذباتی اور روحانی مغالطہ سر زد کرتے ہیں۔ وہ خدا کو انسانی لباس پہنا کر ایک محدود انسان بنا ڈالتے ہیں۔ وہ از خود فرض کر لیتے ہیں کہ خدا اسی طرح دیکھتا ہوگا جس طرح ہم، چنانچہ اسے شر کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ اگر وہ اسے پنپنے کی اجازت دیتا ہے، تو اس کی تشکیک و تردید کر دینی چاہیے۔

مسئلہ شر و الم عموماً ایک ذہنی تعصب کو آشکار کرتا ہے جسے انانیت کہا جاتا ہے۔ ایسا شخص اپنے سوا کسی اور کے نقطہ نگاہ سے کسی بھی مسئلہ پر غور نہیں کر سکتا۔ کچھ ملحدین اسی ذہنی تعصب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ چونکہ دنیا میں شر و الم کی کوئی معقول توجیہ ان کی سمجھ سے بالاتر ہے چنانچہ باقی تمام لوگ بشمول خدا، اسی مشکل سے دوچار ہوں گے۔ لہذا وہ خدا کے منکر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک خدا کی دنیا میں شر و الم کو پنپنے کی اجازت دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور اگر خدا کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں، تو خدا کی رحمت اور قدرت فقط ایک وہم ہے۔ پس خدا کے روایتی تصور کی نکیر ہو جاتی ہے۔ جبکہ اس طرح یہ ملحدین جو کچھ بھی کر پائے وہ فقط یہ ہے کہ اپنے خود ساختہ نظریات کو خدا پر صادر کر دیا۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی اصرار کرے کہ خدا کو لازماً ویسا ہی سوچنا چاہیے جیسا انسان سوچتے ہیں۔ یہ بات اس لیے ناممکن ہے کہ خدا اور انسانوں کا تقابل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خدا ماورا ہستی ہے جو باتمام و کمال علم و حکمت رکھتا ہے۔

بندے کا خدا سے موازنہ کرنا چیزوں کو مجموعی طور پر سمجھنے کی صلاحیت سے ان کی محرومی کو عیاں کرتی ہے۔ اس مقام پر ایک ملحد غالباً یہ دعوی کرے گا کہ اِس کا مطلب ہے کہ انسان خدا سے زیادہ رحیم ہے۔ یہ دعوی

بھی ان کے اپنے نقطہ نظر سے فروتر چیزوں کو سمجھنے کی صلاحیت سے محرومی کو مزید واضح کرتا ہے، اور ان کی اس بات کو سمجھنے میں ناکامی کو افشا کرتا ہے کہ خدا کے احکام اور ارادے اس ربانی حکمت کے مطابق ہوتے ہیں جس تک ہماری مکمل رسائی ممکن نہیں۔ خدا شر اور مصائب کا وجود بلا ضرورت نہیں چاہتا۔ خدا ان چیزوں کو ہونے سے اس لیے نہیں روکتا کیونکہ اسے وہ نظر آتا ہے جو ہمیں نہیں آتا، یہ نہیں کہ وہ شر والم کو بلا ضرورت پہنچنے دینا چاہتا ہے۔ خدا کے پاس مکمل تصویر ہے اور ہمارے پاس صرف اس کا ایک جزو۔ اس بات کا ادراک عقلی و قلبی سکون میں سہولت فراہم کرتا ہے کیونکہ ایک مومن سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی دنیا میں ہوتا ہے وہ خدا کی برتر حکمت کے مطابق ہوتا ہے جو بالآخر ایک بالاتر خیر پر منتج ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا انکار ہی وہ چیز ہے جو ایک ملحد کو غرور و تکبر اور انانیت اور بالآخر مایوسی کے دلدل میں دھنسا دیتی ہے۔ وہ اس امتحان میں ناکام ہوتا ہے اور اس کی خدا کے بارے میں یہ غلط فہمی اسے خدا کی ذات سے غافل کر دیتی ہے اور وہ خدائی حکمت، رحمت اور خیر کا منکر ہو جاتا ہے۔

اس نقطے پر شاید ملحد ردِ عمل میں مذکورہ بالا مسئلہ سے کنی کترانے کا ایک ذہین طریقہ قرار دے کہ اگر ایک ایمان والا خدائی حکمت کی طرف رجوع کر سکتا ہے یہ کہ اس کی حکمت اتنی عمیق ہے کہ اسے سمجھا نہیں جا سکتا، تو پھر ہم کسی بھی 'پراسرار' چیز کی توضیح اسی حکمتِ ربانی سے کر سکتے ہیں۔۔ مجھے اس جواب سے ہمدردی ہے تاہم مسئلہ شر والم کے سیاق وسباق میں یہ ایک غلط دلیل ہے۔ یہ ملحد ہی ہیں جو اس معاملے میں خدا کی صفات سے استنباط شروع کرتا ہے؛ یعنی اس کی قدرت اور رحمت سے۔ ان سے صرف یہ کہا جا رہا ہے کہ انہیں خدا کی دوسری صفات مثلاً حکمت کو بھی محلِ نظر رکھنا چاہیے، وگرنہ ان کا استدلال معتبر نہ ہو گا۔ اگر وہ خدائی حکمت کو شاملِ بحث کریں تو انہیں یہ ثابت کرنا ہو گا کہ حکمتِ ربانی شر والم سے بھری دنیا سے

کیونکر متصادم ہے۔ یہ ثابت کرنا ناممکن ہوگا کیونکہ ہماری عقلی اور عملی زندگی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں جن میں ہم اپنی عقلی کمتری کو قبول کرتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں جن میں ہمیں ایسی حکمت کا اقرار کرنا پڑتا ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ ہم روزمرہ ایسی حقیقتوں کو تسلیم کرتے جو ہماری پہنچ سے بعید ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر، جب ہم کسی طبیب کے پاس جاتے ہیں، ہم طبیب کو ایک ماہر اور مختار تسلیم کر لیتے ہیں۔ ہم طبیب کی تشخیص پر اسی بنیاد پر بھروسا کرتے ہیں۔ ہم بلا کسی جھجک طبیب کی تجویز کردہ دوا بھی لے لیتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی اور بہت سی مثالیں یہ واضح طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ خدا کی حکمت کی طرف اشارہ کرنا مسئلہ سے جان چھڑانا نہیں ہے۔ بلکہ یہ خدا کا درست تصور پیش کرنا اور خدا کو صرف دو صفات تک محدود کرنے سے اجتناب کرنا ہے۔ کیونکہ وہ الحکیم ہے، اور اس کے نام اور صفات کاملِ مطلق ہیں، چنانچہ یہ لازم ہے کہ اس کے ہر عمل کے پیچھے حکمت کارفرما ہوتی ہے، قطع نظر اس کے کہ ہمیں اس حکمت کا پتا یا سمجھ ہو یا نہ ہو۔ ہم میں سے بہتوں کو نہیں معلوم کہ جراثیم کس طرح کام کرتے ہیں، لیکن محض ہماری ناسمجھی کسی چیز کے وجود کی نفی نہیں کر دیتی۔

قرآن اس بات کو سمجھانے کیلیے نہایت عمیق واقعات اور قصے بیان کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی خضر علیہ السلام سے دورانِ سفر ملاقات کے قصے کو ہی لے لیجیے۔ (سورۃ الکھف) موسیٰ علیہ السلام ان کو ایسی چیزیں کرتے دیکھتے ہیں جو بظاہر بہت ظالمانہ اور مضر ہوتی ہیں لیکن سفر کے اختتام پر اس حکمت کو واضح کر دیا جاتا ہے جسے سمجھنے سے موسیٰ علیہ السلام قاصر رہے:

"موسیٰ نے کہا یہی تھا جس کی تلاش میں ہم تھے چنانچہ وہیں سے اپنے قدموں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے واپس لوٹے۔ پس ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا، جسے ہم نے اپنے پاس کی خاص رحمت عطا فرما

رکھی تھی اور اسے اپنے پاس سے خاص علم سکھا رکھا تھا۔اس سے موسیٰ نے کہا کہ میں آپ کی تابعداری کروں؟ کہ آپ مجھے اس نیک علم کو سکھا دیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔اس نے کہا آپ میرے ساتھ ہر گز صبر نہیں کر سکتے۔اور جس چیز کو آپ نے اپنے علم میں نہ لیا ہو اس پر صبر بھی کیسے کر سکتے ہیں؟ موسیٰ نے جواب دیا کہ انشاءاللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور کسی بات میں، میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔ اس نے کہا اچھا اگر آپ میرے ساتھ ہی چلنے پر اصرار کرتے ہیں تو یاد رہے کسی چیز کی نسبت مجھ سے کچھ نہ پوچھنا جب تک کہ میں خود اس کی نسبت کوئی تذکرہ نہ کروں۔ پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک کشتی میں سوار ہوئے، تو اس نے کشتی کے تختے توڑ دیئے، موسیٰ نے کہا کیا آپ اسے توڑ رہے ہیں تاکہ کشتی والوں کو ڈبو دیں، یہ تو آپ نے بڑی (خطرناک) بات کر دی۔اس نے جواب دیا کہ میں نے تو پہلے ہی تجھ سے کہہ دیا تھا کہ تو میرے ساتھ ہر گز صبر نہ کر سکے گا۔موسیٰ نے جواب دیا کہ میری بھول پر مجھے نہ پکڑیے اور مجھے اپنے کام میں تنگی میں نہ ڈالیے۔ پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک لڑکے کو پایا، اس نے اسے مار ڈالا، موسیٰ نے کہا کہ کیا آپ نے ایک پاک جان کو بغیر کسی جان کے عوض مار ڈالا؟ بے شک آپ نے تو بڑی ناپسندیدہ حرکت کی۔ وہ کہنے لگے کہ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ہمراہ رہ کر ہر گز صبر نہیں کر سکتے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا اگر اب اس کے بعد میں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو بیشک آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا، یقیناً آپ میری طرف سے (حد) عذر کو پہنچ چکے۔ پھر دونوں چلے ایک گاؤں والوں کے پاس آ کر ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے ان کی مہمان داری سے صاف انکار کر دیا، دونوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گرا ہی چاہتی تھی، اس نے اسے ٹھیک اور درست کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) کہنے لگے اگر آپ چاہتے تو اس پر اجرت لے لیتے۔اس نے کہا بس یہ جدائی ہے میرے اور تیرے

درمیان، اب میں تجھے ان باتوں کی اصلیت بھی بتادوں گا جس پر تجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ کشتی تو چند مسکینوں کی تھی جو دریامیں کام کاج کرتے تھے۔ میں نے اس میں کچھ توڑ پھوڑ کرنے کاارادہ کرلیاکیونکہ ان کے آگے ایک بادشاہ تھاجو ہر ایک (صحیح سالم) کشتی کو جبراً ضبط کرلیتا تھا۔ اور اس لڑکے کے ماں باپ ایمان والے تھے۔ ہمیں خوف ہوا کہ کہیں یہ انہیں اپنی سرکشی اور کفر سے عاجزوپریشان نہ کردے۔ اس لئے ہم نے چاہا کہ انہیں ان کاپروردگار اس کے بدلے اس سے بہتر پاکیزگی والااور اس سے زیادہ محبت اور پیار والا بچہ عنایت فرمائے۔ دیوار کا قصہ یہ ہے کہ اس شہر میں دو یتیم بچے ہیں جن کا خزانہ ان کی اس دیوار کے نیچے دفن ہے، ان کا باپ بڑانیک شخص تھاتو تیرے رب کی چاہت تھی کہ یہ دونوں یتیم اپنی جوانی کی عمر میں آکر اپنا یہ خزانہ تیرے رب کی مہربانی اور رحمت سے نکال لیں، میں نے اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کیا، یہ تھی اصل حقیقت ان واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔"] قرآن، سورۃ ۱۳، آیات ۶۵ تا ۸۲۔ [

خدائی حکمت کا ہماری محدود حکمت سے موازنہ کے علاوہ یہ قصہ ہمیں کلیدی اسباق اور باطنی بصیرت بھی فراہم کرتا ہے۔ پہلا سبق یہ ہے کہ مشیتِ ایزدی سمجھنے کیلے عاجزی ضروری ہے۔ موسیٰ خضر سے یہ جانتے ہوئے ملے کہ ان کے پاس کچھ ایسا الہامی علم تھا جو خدا نے موسیٰ کو نہیں دیا تھا۔ موسیٰ نے ان سے علم سیکھنے کی عاجزانہ گزارش کی مگر خضر علیہ السلام نے جواباًان کی صبر کی استطاعت پر شک کا اظہار کیا، بااین حال موسیٰ علیہ السلام نے اصرار کیااور وہ سیکھنا چاہتے تھے۔ (اسلامی روایات میں موسیٰ علیہ السلام کا روحانی مقام ومرتبہ نہایت بلند ہے۔ وہ ایک نبی اور رسول تھے، اس کے باوجود وہ خضر علیہ اسلام کے پاس عاجزی سے گئے)۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ دنیا میں شر والم کے معاملے سے جذباتی ونفسیاتی طور پر نبرد آزما ہونے کیلئے صبر درکار ہے۔ خضر کو معلوم تھا کہ موسیٰ ان کے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر پائیں گے کیونکہ انہیں ایسے کام کرنے

تھے جو موسیٰ کے نزدیک شر تھے۔ موسیٰ نے صبر کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار ان کے اعمال پر سوال اٹھائے اور اپنے ادراک میں شر پر غصے کا اظہار کیا۔ بہر حال واقعہ کے اختتام پر خضر علیہ السلام نے یہ کہنے کے بعد کہ موسیٰ صبر نہیں کر پائے اپنے اعمال کے پسِ پردہ حکمتِ ایزدی سے پردہ اٹھا دیا۔ اس کہانی سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں شر و الم اور اسے سمجھنے کی صلاحیت سے محرومی سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمیں لازماً عاجزانہ و صابرانہ رویہ اختیار کرنا ہو نا ہو گا۔

مذکورہ بالا آیات کی تفسیر کرتے ہوئے، معروف مفسر ابن کثیر کہتے ہیں کہ خدا نے خضر علیہ السلام کو دنیا میں ظاہری شر و الم کی مخفی حقیقت کے علم سے نوازا تھا جبکہ موسیٰ علیہ اسلام کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا۔ اس آیت کے متعلق کہ ''آپ میرے ساتھ ہر گز صبر نہیں کر سکتے''، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس سے مراد ہے: ''آپ میرا ساتھ نہیں نبھا سکتے، میرے کام آپ کو اپنے علم کے خلاف نظر آئیں گے، میرا علم آپ کو نہیں اور آپ کو جو علم ہے، وہ اللہ نے مجھے نہیں سکھایا'' (ابن کثیر (۱۹۹۹) تفسیر القرآن العظیم، کتاب ۵، ص ۱۸۱)

دراصل خدا کی حکمت لا متناہی اور کامل ہے جبکہ ہمارے پاس محدود علم و حکمت ہے۔ یا یوں کہیے کہ خدا کے پاس کامل علم و حکمت ہے جبکہ ہمارے پاس اس کے کچھ جزئیات ہیں۔ ہم چیزوں کو اپنے جزی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ نفس پرستی کے جال میں پھنس جانا ایسا ہی ہے جیسے کسی پہیلی کے ایک حصے کو دیکھ کر یہ سمجھ لینا کہ آپ کو پوری پہیلی سمجھ آگئی ہے۔ چنانچہ ابن کثیر بیان کرتے ہیں کہ آیت ''اور جس چیز کو آپ نے اپنے علم میں نہ لیا ہو اس پر صبر بھی کیسے کر سکتے ہیں؟'' کا مطلب ہے کہ ایسی خدائی حکمت موجود ہے جس تک ہم رسائی حاصل نہیں کر سکتے: ''ناممکن ہے کہ آپ اپنی معلومات کے خلاف میرے افعال دیکھیں اور پھر صبر

کر سکیں۔ اور واقعہ میں آپ اس حال میں معذور بھی ہیں۔ کیونکہ خدائی حکمت اور مصلحت آپ کو معلوم نہیں"۔ (ایضا)

یہ نظریہ کہ ہر چیز خدائی حکمت کے مطابق ظہور پذیر ہوتی ہے بہت تقویت بخش اور مثبت ہے۔ یہ اس لیے کہ خدا کی حکمت اس کی ذات کے دوسرے پہلوؤں سے متصادم نہیں، جیسے اس کا خیر و کمال۔ چنانچہ شر والم بالآخر ایک باطنی مقصد کا حصہ ہیں۔ قدیم مفسرین میں چودھویں صدی کے عالم ابن تیمیہ اس نقطہ کا خلاصہ نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے: "خدا خالص شر تخلیق نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی ہر تخلیق میں ایک پر حکمت مقصد ہوتا ہے جو خیر پر منتج ہوتا ہے۔ البتہ اس میں کچھ لوگوں کے لیے کچھ شر ہو سکتا ہے، اور یہ جزوی و نسبتی ہوتا ہے۔ جہاں تک تعلق ہے کل شر یا مطلق شر کا، تو خدا اس سے بری ہے۔" (ابن تیمیہ، آ۔ (۲۰۰۴) مجموع الفتاوی شیخ السلام احمد بن تیمیہ، کتاب ۱۴، ص ۲٦٦)

اس سے معروضی اخلاقی حقیقتوں کے تصور کی نفی نہیں ہوتی۔ باوجود اس کے کہ ہر چیز اخروی خیر کے مطابق ہے اور شر "جزوی" ہے، اس سے شر کی واقعی حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگرچہ ہر شے اساسی خیر کے مطابق ہوتی ہے، اور شر جزوی ہوتا ہے، اس سے معروضی / واقعی شر کے تصور پر کوئی ضرب نہیں پڑتی۔ شرِ واقعی، شرِ مطلق کے ہم معنی نہیں ہے، بلکہ یہ کچھ خاص سیاق و سباق اور متغیرات پر مبنی شر ہے۔ چنانچہ کوئی چیز کچھ متغیرات یا سیاق کی بنا پر حقیقی شر ہو سکتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ کسی پر حکمت اور بھلے باطنی مقصد سے ہم آہنگ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ رویہ معتقدین میں ایک مثبت نفسیاتی ردِ عمل پیدا کرتا ہے کیونکہ پیش آنے والے تمام شر اور مصائب کسی باطنی مقصد کیلئے ہوتے ہیں۔ ابن تیمیہ رح اس نقطے کا نہایت عمدہ خلاصہ بیان کرتے ہیں: "اگر خدا تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، تو وہ خیر و شر کی تخلیق اس پر حکمت مقصد کیلئے

کرتا ہے جس بنا پر اس کے احکام خیر اور کامل ہوتے ہیں۔" (ابن تیمیہ (۱۹۸٦) منہاج السنہ۔ بالواسطہ محمد رشد سالم۔ ریاض: جامعہ الامام محمد بن سعود السلامیہ۔ کتاب ۳، ص ۱۴۲۔)

ہنری لاوسٹ "Essay sur les doctrines sociales et politiques de Taki-d-Din Ahmad b. Taimiya" میں یہی موقف بیان کرتا ہے: "خدا در اصل پیش بین و مدبرِ کامل ہے۔ شر کا دنیا میں کوئی حقیقی وجود نہیں۔ جو کچھ خدا کی منشا ہوتی ہے وہ ایک بالا انصاف اور لامتناہی خیر کے مطابق ہوتی ہے، مگر صرف اس صورت میں کہ اس کا جائزہ کلی اور جامع نقطہ نظر سے لیا جائے نہ کہ حقیقت کے متعلق اس ناقص اور نامکمل علم سے جو مخلوق کے پاس ہے۔۔۔" (اخذ من ہوور، ج (۲۰۰۷) ابن تیمیہ کی امیدِ مسلسل کی ثودیسیا۔ لیدن، برل، صفحہ 4)

2۔ کیا خدا نے کوئی وجہ بتائی ہے کہ اس نے شر والم کی اجازت کیوں دی؟/ کیا خدا شر والم کا کوئی جواز فراہم کرتا ہے؟

دوسرے مفروضے کا مدلل اور کافی جواب یہ ہو گا کہ دنیا میں شر والم کے متعلق وہ مضبوط دلائل فراہم کر دیے جو خدا نے ہمیں بتائے ہیں۔ اسلام کی بھرپور فکری میراث ایسی معقول وجوہات سے بھری پڑی ہے:

1۔ ہمارا مقصد عبادت ہے

انسانوں کا بنیادی مقصد صرف وقتی خوشی سے لطف اندوز ہونا نہیں بلکہ خدا کی معرفت اور عبادت کے ذریعہ ایک گہرا باطنی اطمینان حاصل کرنا ہے۔ اس خدائی مقصد کی تکمیل ایک ابدی سعادت اور حقیقی خوشی پر منتج ہو گی۔ چنانچہ اگر یہی ہمارا بنیادی مقصد ہے تو باقی تمام انسانی تجربات ثانوی ہیں۔ قرآن کہتا ہے، ''ہم نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو سوائے اس کے کہ میری عبادت کریں''۔ (قرآن، سورۃ ۵۱، آیت ۵۶)۔

ایسے شخص کا تصور کیجئے جس کو کبھی کسی دکھ یا تکلیف سے واسطہ نہیں پڑا، اس کے برعکس وہ ہر وقت عیش میں رہتا ہے۔ یہ شخص اپنی تن آسانی کی وجہ سے خدا کو بھول گیا ہے لہذا اس مقصد کو پورا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے جس کیلئے اسے پیدا کیا گیا تھا۔ اس کا موازنہ کیجئے اس شخص سے جس کے تلخ تجربات اسے خدا تک پہنچا دیتے ہیں اور وہ اپنے زندگی کے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسلام کے روحانی روایت میں، وہ شخص جس کے تلخ تجربات اسے خدا تک لے گئے اس شخص سے بہتر ہے جسے کبھی کوئی پریشانی درپیش نہ آئی اور جس کی عیش و آسائشیں اسے خدا سے دور لے گئیں۔ (خدا کیوں چاہتا ہے کہ ہم اسکی عبادت کریں؟)؟)

2۔ زندگی ایک امتحان ہے

خدا نے ہمیں ایک امتحان کیلئے بھی تخلیق کیا ہے، اور اس شر و الم کے تجربات اس امتحان کا حصہ ہیں۔ اس امتحان میں کامیابی ہماری جنت کی ابدی زندگی کی ضامن ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے موت اور زندگی کو تخلیق کیا ''تاکہ وہ تمہارا امتحان لے کہ تم میں سے کون بہترین اعمال کرتا ہے، وہ نہایت زبردست اور بہت معاف کرنے والا ہے۔'' (قرآن، سورۃ ۶۷، آیت ۲)

بنیادی سطح پر ملحد زمین پر ہمارے وجود کے مقصد کو سمجھنے میں غلطی کرتا ہے۔اس دنیا کو آزمائش ومبتلا کا اکھاڑا بنایا گیا ہے کہ جس میں ہمیں مکمل آزادی دے کر پرکھا جاسکے اور ہمارے اندر چھائیوں کو پروان چڑھایا جاسکے۔مثال کے طور پر، ہم صبر کو کیسے پروان چڑھا سکتے ہیں جب ہم صبر آزما حالات سے نبرد آزما ہی نہ ہوں؟ہم دلیر کیسے بن سکتے ہیں اگر کوئی خطرات ہی درپیش نہ ہوں؟ہم مہربان کیسے ہو سکتے ہیں جب کسی کو رحمت کی ضرورت ہی نہ ہو؟زندگی کا ایک امتحان ہونا ان سوالات کا جواب ہے۔ہمیں اپنی اخلاقی اور روحانی ترقی کیلئے ان آزمائشوں کی ضرورت ہے۔ہم یہاں تفریح کرنے کے لیے نہیں ہیں،اس کیلئے جنت ہے۔

چنانچہ زندگی ایک امتحان کیوں ہے؟ چونکہ خدا خیرِ کامل ہے،وہ چاہتا ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی ایمان لے آئے اور اس کے نتیجہ میں جنت کی سعادت بھری ابدی زندگی پائے۔خدا نے واضح کر دیا ہے کہ وہ ہم سب کیلئے ایمان ہی پسند کرتا ہے:"اور وہ اپنے بندوں کیلئے کفر پسند نہیں کرتا۔"(قرآن، سورۃ ۳۹، آیت ۷)

یہ واضح کرتا ہے کہ خدا نہیں چاہتا کہ کوئی دوزخ میں جائے۔تاہم اگر وہ اس کا اطلاق کر دے اور ہر ایک کو جنت بھیج دے تو یہ انصاف کے اصولوں کی صریح خلاف ورزی ہو گی کہ خدا موسیٰ اور فرعون اور ہٹلر اور عیسیٰ سے یکساں سلوک کرے۔ایسی کسی ترکیب کی ضرورت ہے جس کے تحت لوگ لیاقت کی بنا پر جنت میں داخل کیے جائیں۔یہ وہ مقصد ہے جس وجہ سے زندگی کو ایک امتحان بنایا گیا ہے۔زندگی صرف ایک ترکیب ہے جس سے پرکھا جاسکتا ہے کہ ہم میں سے کون ابدی مسرت کا حقدار ہے۔اس وجہ سے زندگی آزمائشوں سے بھری پڑی ہے جس سے ہمارا امتحان ہوتا ہے۔

اس ضمن میں اسلام نہایت امید افزا ہے کیونکہ یہ رنج والم اور تکالیف کو امتحان جانتا ہے۔ ہم لطف اندوز بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ہمیں ایک مقصد کیلئے تخلیق کی کیا گیا ہے اور وہ مقصد خدا کی عبادت ہے۔ قوت بخش اسلامی نظریہ یہ ہے کہ آزمائشوں کو خدا کی محبت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، ''جب خدا اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے آزماتا ہے''۔ (ترمذی)

خدا کی اپنے محبوب بندوں کو آزمانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ آزمائشیں ابدی جنت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اور جنت میں داخلہ نتیجہ ہے خدا کی محبت اور رحمت کا۔ خدا قرآن میں اسے واضح کرتا ہے: ''کیا تم یہ گمان کر بیٹھے ہو کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے، حالانکہ اب تک تم پر وہ حالات نہیں آئے جو تم سے اگلے لوگوں پر آئے تھے۔ انہیں بیماریاں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ یہاں تک جھنجوڑے گئے کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان والے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سن رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔'' (قرآن، سورۃ ۲، آیت ۲۱۴)

اسلامی روایات کی خوبصورتی یہ ہے کہ خدا نے، جو کہ ہمیں ہم سے بہتر جانتا ہے، پہلے ہی ہمیں خبر دے دی ہے کہ ہمارے پاس ان آزمائشوں کو سر کرنے کی صلاحیت موجود ہے: ''اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا''۔ (قرآن، سورۃ ۲، آیت ۲۸۶)

تاہم، اگر ہم اپنی بھرپور کوشش کے باوجود ان آزمائشوں سے کامیابی سے نبرد آزما نہیں ہو پاتے تو خدا کی رحمت اور عدل کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیں اس زندگی یا ہماری منتظر ابدی زندگی میں اس کا پورا بدلہ ضرور دے گا۔ (خدا ہمارا امتحان کیوں لینا چاہتا ہے؟)

3۔خدائے علیم

رنج والم ہمیں خدا کی صفات سے روشناس کرتی ہیں جیسے الحافظ اور الشافی۔ مثلاً، بیماری کی تکلیف کے بغیر ہم خدا کی شافی ہونے کی صفت کی قدر نہ کر سکتے۔ خدا کی معرفت اسلامی روحانی روایت میں ایک بہت بڑا خیر ہے، جو ان تکالیف اور مصائب کا جواز پیدا کرتا ہے چونکہ یہ ہمیں اپنے بنیادی مقصد کو حاصل کرنے کا ضامن ہے جو ہمیں بالآخر جنت میں لے جائے گا۔

4۔ برتر خیر

شر والم برتر خیر کا جواز بنتے ہیں، اس لیے انہیں دوسرے درجے کی خیر بھی کہا جاتا ہے۔ خیر کا اول درجہ مادی لذتیں اور خوشیاں ہیں، اور شر کا اول درجہ مادی تکالیف اور دکھ ہیں۔ دوم درجے کی خیر میں شجاعت، عاجزی اور صبر شامل ہیں۔ تاہم اس دوم درجے کی خیر (مثلاً شجاعت) کو حاصل کرنے کیلیے پہلے درجے کے شر کا ہونا لازمی ہے (مثلاً بزدلی)۔ قرآن کے مطابق، برتر اچھائیاں جیسے شجاعت اور عاجزی کی قدر و قیمت شر کے برابر نہیں ہو سکتی: "آپ فرما دیجیے (اے نبی) کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں گو آپ کو ناپاک کی کثرت بھلی لگتی ہو اللہ تعالٰی سے ڈرتے رہو اے عقل مندو! تاکہ تم کامیاب ہو۔" (قرآن، سورۃ ۵، آیت ۱۰۰)

5۔ آزادیِ ارادہ

خدا نے ہمیں آزادیِ ارادہ دی ہے، اور آزادیِ ارادہ میں شر اعمال کا انتخاب کی اجازت بھی شامل ہے۔ یہ ذاتی شر کی وضاحت ہے، جو کہ وہ شر ہے جو انسان کرتے ہیں۔ پوچھا جا سکتا ہے: "ہمیں خدا نے ارادے کی

آزادی سے اصلا کیوں نوازا؟"۔ دنیا میں امتحان صرف آزادیِ ارادہ کی صورت میں ہی معنی خیز ہو سکتا ہے۔ ایسا امتحان بے معنی ہے جس میں طالبِ علم کو ہر سوال کا درست جواب دینے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ اسی طرح، زندگی کے امتحان میں، انسانوں کو یہ آزادی دینا ضروری ہے کہ جو چاہیں کریں۔ خیر و شر اپنا مطلب کھو دیتے اگر خدا یہ یقینی بنا دیتا کہ ہم ہمیشہ خیر کو اختیار کریں۔ ذرا سوچیے: کوئی آپ سے بندوق کی نوک پر صدقہ کروائے۔ آپ پیسے تو دے دیں گے پر کیا ان کی کوئی اخلاقی حیثیت ہو گی؟ بالکل نہیں کیونکہ اس کی قدر صرف تب ہو سکتی ہے جب کوئی آزاد بندہ اپنی مرضی سے صدقہ دے۔

6۔ دنیا سے استغنا

اسلامی روایات کے مطابق خدا نے ہمیں اس لیے تخلیق کیا ہے تا کہ ہم اس کی عبادت کریں اور اس کا قرب حاصل کریں۔ اس کا ایک بنیادی اصول یہ ہے ہم اس فانی دنیا سے بے پرواہو جائیں۔ 'دنیا' جو کہ رزیل اور نیچی ہے حدود و قیود، شر و الم اور خواہشات و نفس پرستی کی جاہ ہے۔ تکالیف دنیا کی اس بے وقعتی کو واضح کرتی ہیں، ان سے ہمیں اس استغنا میں مدد ملتی ہے اور ہم خدا سے اور قرب حاصل کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: "دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے"۔ (البیہقی شعوب الامان، الی الحسن البصری، روایہ عن محمد ﷺ) اسلام کے مطابق سب سے بڑی برائی خدا کے شریک ٹھہرانا ہے؛ چنانچہ دنیا سے استغنا خدا سے قرب کے روحانی مقصد اور بالآخر جنت کو حاصل کرنے کیلئے لازمی ہے۔

قرآن بہت واضح کر دیتا ہے کہ دنیا فانی اور وقتی کھیل تماشا ہے: خوب جان رکھو کہ دنیا کی زندگی صرف کھیل تماشا زینت اور آپس میں فخر (و غرور) اور مال و اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے آپ کو زیادہ بتلانا ہے،

جیسے بارش اور اس کی پیداوار کسانوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر جب وہ خشک ہو جاتی ہے تو زرد رنگ میں اس کو تم دیکھتے ہو پھر وہ بالکل چورا چورا ہو جاتی ہے۔" (قرآن، سورۃ ۵۷، آیت ۲۰)

دنیا کے اس تصور کو تخلیق کے مثبت پہلوؤں سے خلط نہیں کرنا چاہیے جسے عربی میں عالم اور خلق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تصورات خدا کی تخلیق کی خوبصورتی اور حسن سے متعلق ہیں۔ ان کا مقصد لوگوں کو فکر و تدبر پر ابھارنا ہے جو خدا کی قوت، رحمت اور حکمت کو جاننے کا ذریعہ بنتا ہے۔

7۔ معصوم لوگوں کی تکالیف عارضی ہوتی ہیں

اگرچہ بہت سی برتر بھلائیوں کا حصول مدِ نظر رکھا گیا ہے، یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ بہت سے لوگ بغیر کسی تشفی کے مسلسل تکالیف میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس لیے اسلام کے مطابق خدا نہ صرف دنیا میں شر و الم کا جواز ہی نہیں دیتا بلکہ ان کی جزا بھی بتاتا ہے۔ بالآخر، تمام ان تمام مومنین کو جنہوں نے معصوم ہونے کے باوجود مصائب جھیلے ابدی راحت بھری زندگی دی جائے گی جو انہیں وہ تمام مصائب بھلا دے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "۔۔۔ایک شخص جنتیوں میں سے ایسا لایا جائے گا جس کی زندگی سب سے زیادہ تکلیف میں گزری ہو گی، اس کو جنت میں ایک غوطہ دیا جائے گا پھر اس سے پوچھا جائے گا: آدم کے بیٹے! کیا تو نے کبھی کوئی دکھ دیکھا ہے، کیا کوئی دور تجھ پر تکلیف کا گزرا ہے؟ وہ اللہ کی قسم کھا کر کہے گا کبھی نہیں میرے رب! کبھی کوئی تکلیف مجھ پر نہیں گزری اور میں نے کبھی کوئی تکلیف نہیں دیکھی۔" (مسلم)

8۔ روحانی زاویہ

دہریت کے مطابق شر کا کوئی مقصد نہیں۔ یہ دنیا کی اور بہت سی اندھی قوتوں میں سے ایک ہے جو اپنا شکار بغیر کسی تمیز و تخصیص کے چنتی ہے۔ چنانچہ شر والم کا شکار ہونے والے ان لوگوں کے پاس کوئی ایسا جذباتی و عقلی زاویہ نظر نہیں جو ان کی تکالیف کو کم کرنے میں مدد ہو اور ان کے تجربات کو ایک موزوں سیاق میں ڈھال سکے۔ کوئی پوری زندگی تکالیف میں رہ کر بالآخر بس قبر میں پہنچ جاتا ہے اور اسکے پاس کوئی امید نہیں ہوتی، اس کی تمام تر تکالیف، قربانیاں اور دکھ بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ شر کو پچھلے مادی علل کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، اور شر کا شکار ہونے والوں کے پاس کوئی راہ نہیں بچتی۔ وہ اس کی نسبت کسی ارادہ کے عمل دخل سے نہیں کر سکتے، چاہے وہ انسانی ہو یا خدائی، کیونکہ ہر چیز بس ایک اندھی، بے ترتیب اور غیر منطقی مادی واردات و واقعات تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ الحاد کے منطقی نتائج نہایت افسردہ کن ہیں۔

اسلامی روایات میں ایسے نظریات، اصولوں اور افکار کی بہتات ہے جو ایک مومن کی زندگی کو سہل بناتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مومنین کو امید اور صبر سے قوت بخشی۔ تمام تکالیف جو ہمیں پیش آتی ہیں ہماری روحانی طہارت کا سبب بنتی ہیں، جو ہماری ابدی نجات کا سبب بنتی ہیں جہاں ہم وہ تمام تکالیف بھول جائیں گے: ”جو مصیبت بھی کسی مسلمان کو پہنچتی ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کے گناہ کا کفارہ کر دیتا ہے (کسی مسلمان کے) ایک کانٹا بھی اگر جسم کے کسی حصہ میں چبھ جائے۔“ (بخاری)

”مومن کا ہر معاملہ عجیب ہے۔ اس کا ہر معاملہ اس کے لیے بھلائی کا ہے۔ اور یہ بات مومن کے سوا کسی اور کو میسر نہیں۔ اسے خوشی اور خوشحالی ملے تو شکر کرتا ہے۔ اور یہ اس کے لیے اچھا ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی نقصان پہنچے تو (اللہ کی رضا کیلیے) صبر کرتا ہے، یہ (بھی) اس کیلیے بھلائی ہوتی ہے۔“ (مسلم)

یہاں تک کہ قدرتی آفات اور جان لیوا بیماریوں کو بھی امید، رحمت اور مغفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسلام کا بیماریوں کے متعلق نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ ایک صورت کی طہارت ہیں جو بیمار کیلئے جنت کی ابدی زندگی میں ممد ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے بیماریوں کی عیادت کی تلقین کی: ''بھوکوں کو کھلاؤ، بیماروں کی عیادت کرو اور غلاموں کو آزاد کرو''۔ (بخاری) جو لوگ بیماروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں وہ رحمت اور مغفرت اور بالآخر جنت سے نوازے جاتے ہیں۔ بہت سے احادیث رسول اس بات پر شاہد ہیں۔ مثلاً خدا کے رسول نے فرمایا کہ اگر کوئی مومن طاعون یا پیٹ کی بیماری سے فوت ہو جاتا ہے تو وہ شہید تصور ہوگا اور تمام شہداء جنت میں جائیں گے۔ (مسلم) بہت سی احادیث میں ان لوگوں کیلئے رحمت، ثواب اور مغفرت کا ذکر ہے جو بیماروں کی عیادت اور تیمارداری کرتے ہیں؛ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی بھی بیمار کی تیمارداری کرتا ہے ''وہ رحمت میں غوطہ زن ہوتا ہے جب تک وہ بیٹھ نہیں جاتا اور جب وہ بیٹھ جاتا ہے وہ رحمت میں ڈوب جاتا ہے۔'' (مسند احمد)

محمد ﷺ نے ہمیں سکھایا کہ جو بیمار کی تیمارداری کرے گا خدا کو اپنے ساتھ پائے گا:

''اللہ تبارک و تعالیٰ روز قیامت ارشاد فرمائیں گے اے ابن آدم میں بیمار تھا تو نے میری مزاج پرسی نہ کی؟ وہ عرض کرے گا باری تعالیٰ! میں بھلا کیسے آپکی مزاج پرسی کرتا آپ تو ربّ العٰلمین ہیں (بیمار ہونے سے منزّہ ہیں بیمار ہونا تو مخلوق کی صفت ہے)۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا تمھیں معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اسکی مزاج پرسی نہیں کی، اگر تم اسکی عیادت کرتے تو اسکو (اسکے اجر کو) میرے پاس پاتے۔'' (مسلم)

حتی کہ سونامی کی طرح قدرتی آفات کی صورت میں بھی، مومن جو اس کا شکار ہوں جنتی گردانے جائیں گے کیونکہ ڈوبنے کی وجہ سے وفات کو اسلام میں شہادت کا درجہ حاصل ہے۔ حضور ﷺ نے اس بارے میں فرمایا: ''جو بھی ڈوب جائے شہید ہے''۔ (ایضا) اسلامی علمائے نے یہ اخذ کیا ہے اگر کوئی مسلمان زلزلہ کے دوران کسی عمارت کے نیچے دب کر مر جائے (کچھ نے جہاز اور گاڑی کے حادثہ کو بھی شامل کیا ہے)، تو وہ جنتی تصور ہوگا۔ محمد ﷺ نے فرمایا کہ شہید کی قسموں میں سے ایک وہ ہے ''جو عمارت کے منہدم ہونے سے فوت ہو جائے''۔ (ایضا)

کیا خدا شر والم کے بغیر دنیا تخلیق نہیں کر سکتا تھا؟

ایک کلیدی اعتراض جو کیا جاتا ہے یہ ہے کہ ''لیکن خدا شر والم کے بغیر بھی تو دنیا تخلیق کر سکتا تھا''۔ یہ اصل استدلال کی ہی ایک دوسری شکل ہے۔ دوسرے لفظوں میں ''خدا نے دنیا میں شر والم کو اجازت کیوں دے رکھی ہے؟ چنانچہ اس پر وہی جواب منطبق ہوگا: خدائی حکمت۔ جو یہ اعتراض کرتا ہے صرف اس لیے کرتا ہے کہ وہ اولاً سے اس بات کا علم ہی نہیں کہ دنیا میں شر والم کیوں ہیں، وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک رحیم اور قدیر خدا کو شر والم کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ بہر حال اس بات پر پہلے ہی اس مقالہ میں بحث ہو چکی ہے۔

'مسئلہِ 'شر والم کسی مومن کے لیے سرے سے مسئلہ ہی نہیں کیونکہ شر والم کو خدا کی برتر حکمت، کمال اور خیر پر منتج کیا جاتا ہے۔ اسلام کی روحانی تعلیمات امید، صبر اور امن کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ الحاد کا منطقی نتیجہ

یہ ہے بندہ ناامیدی میں ڈوب جاتا ہے اور اس کے پاس شر والم کے وجود کا کوئی تسلی بخش حل موجود نہیں رہتا۔ یہ جہالت ان کی اس انانیت کا نتیجہ ہے جو انہیں چیزوں کو دوسروں کے نقطہ نظر سے دیکھنے سے محروم رکھتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے میں اپنے والدین کو برا خیال کرتا تھا جب وہ مجھے اپنے دادا کی شراب پینے سے باز رکھتے تھے۔

ترجمہ: تحریر حمزہ اینڈر ریس، دی ڈیوائن ریلٹی ترجمہ عمر جمیل خان

قرآن مجید یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہم تمام انبیاء اور پیغمبروں پر ضرور ایمان لائیں اور یہ یقین رکھیں کہ یہ تمام نفوسِ قدسیہ اللہ کے چُنے ہوئے بندے تھے جن کو ابدی سچائی 'خدا' نے انسانیت کی طرف اپنا تعارف کروانے کے لیے بھیجا۔ قرآن مجید نے بہت سے رسولوں اور نبیوں کا ذکر کیا ہے جن سے ہم اپنے گھروں اور سکولوں سے ہی شناسائی رکھتے ہیں۔ اس اللہ کی کتاب میں ہمیں حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، داؤدؑ، ذکریاؑ، الیاسؑ، یعقوبؑ اور یوسفؑ علیہم السلام کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن رسولوں اور نبیوں میں ایک اہم فرق ہوتا ہے۔ نبی اس ذات کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بناتے ہیں اور وہ لوگوں کو سچائی کی طرف بلاتا ہے۔ جبکہ رسول کو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب یا صحیفہ بھی دیتے ہیں۔ انبیاء اور رسول دونوں کا مقصد انسانیت میں خالقِ حقیقی کا تصور، تقویٰ اور خدا ترسی اجاگر کرنا ہوتا ہے جبکہ رسولوں کے پاس چونکہ خدا کا نازل کردہ پیغام بھی ہوتا ہے تو وہ اس پیغام کو سکھلانے کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں تاکہ پیغام کا صحیح مطلب اور مفہوم لوگوں تک پہنچایا جائے۔ رسول اور پیغمبر اللہ کے پیغام کا چلتا پھرتا عملی نمونہ ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر انسانیت خدا کے پیغام کا حقیقی مفہوم سمجھ سکتی ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وحیِ الٰہی انسان کو بتاتی ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور نبی یہ بتاتے ہیں کہ کیسے کرنا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم ؐ کا اسمِ مبارک پانچ بار آیا ہے (401) اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب جبریلؑ کے ذریعے سے آپ کے قلبِ اطہر پر نازل کی گئی۔ قرآن کریم نے صراحتاً یہ بتا دیا ہے کہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم ؐ آخری نبی اور رسول ہیں۔ (402)

جب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہے تو یہ لازم آئے گا کہ یہ بھی مانا جائے کہ اس کا ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی ہے۔ لہٰذا حضور صلّی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور ان پر وحی کا نازل ہونا حق ہے۔ مندرجہ بالا ثابت شدہ حقیقت کے ساتھ ساتھ حیاتِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلم، ان کی تعلیمات اور ان کا اعلیٰ کردار بھی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

اگر ہم حیاتِ نبوی اور کردارِ نبوی (صلّی اللہ علیہ وسلم) کا تجزیہ کریں تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اگر یہ کہا جائے کہ معاذاللہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم غلط بیانی کرتے تھے اور اوہام کا شکار تھے تو آج تک نسلِ انسانی میں کسی نے سچ نہیں بولا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کو یہ کہے اس نے اس کو نہیں جنا اور ایک کھلی حقیقت کا انکار کر دے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات معاشرت، روحانیت، معاشیات اور نفسیات جیسے مضامین کا احاطہ کرتی ہیں اور انسانیت کو رہنمائی مہیا کرتی ہیں۔ اگر حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ارشادات کو صحیح اور مکمل طریقے سے دیکھا جائے تو کوئی بھی غیر جانبدار آدمی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ذاتِ اقدس کوئی معمولی ہستی نہیں۔ معاملات کو دیکھا جائے تو ایک ایسا کردار اس کے سامنے آتا ہے جو مشکل سے مشکل حالات میں بھی رواداری، برداشت اور انکساری کا دامن نہیں چھوڑتا۔ یہ پیغمبرانہ اوصاف تاریخ جن کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حیاتِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عرب دنیا، بلکہ تمام دنیا اور اقوامِ عالم پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس انسانی ترقی، انصاف، رواداری کی وجہ بنی۔

محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کا انکار گویا اپنی ماں کا انکار کرنا ہے:

جیسا کہ گزشتہ تحریر میں اس پر بحث پیش کی گئی کہ علم کا وہ واحد ذریعہ جس کے ذریعے انسان اس عورت کو اپنی ماں کہتے ہیں جس نے انہیں جنا ہو گواہی ہے۔یعنی کسی نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ یہ عورت تمھاری ماں ہے۔اگرچہ آپ کے پاس ولادت کا سرٹیفکیٹ، ہسپتال کے ریکارڈ، DNA ٹیسٹ کا ریکارڈ ہو تو بھی یہ روایت شدہ علم ہی کہلائے گا کیونکہ آپ نے کسی کے کہنے پر یقین کرنا ہے۔کسی بھی شخص کے پاس ایسا ثبوت نہیں ہے جو عملی طور پر یہ ثابت کرے کہ یہ عورت اس شخص کی ماں ہے۔اگر وہ اپنا ٹیسٹ خود کرواتا ہے تو تب بھی اس کو کسی ماہر کی گواہی کو ماننا ہو گا کہ فلاں عورت اس کی پیدائش کا سبب ہے تو لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ خالص علمی نقطۂ نگاہ سے اس شخص کا اپنی ماں کو تسلیم کرنا چند گواہیوں پر دلالت کرتا ہے۔ہمارے پاس اس سے زیادہ مستند گواہیاں یہ نتیجہ نکالنے کے لیے موجود ہیں کہ محمد صلّی اللہ علیہ وسلمؐ اللہ کے آخری رسول ہیں۔تو یہ کہنا بالکل حق ہو گا کہ رسول صلّی اللہ علیہ وسلمؐ کا انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنی حقیقی ماں کا انکار کر دے۔

دلیل:[[The argument

رسولِ خدا محمد صلّی اللہ علیہ وسلمؐ نے آج سے 1400 سال پہلے ایک نہایت ہی مختصر مگر جامعیت سے بھرپور پیغام کے ساتھ اپنی نبوت کا اعلان کیا وہ پیغام تھا ''لا الٰہ الّا اللہ محمد الرسول اللہ''۔آپ 40 برس کی عمر میں نبوت کے مقام پر فائز ہوئے اس سے پہلے وہ اپنا کچھ وقت غارِ حرا کی تنہائی میں غور و فکر اور مراقبہ میں گزارا کرتے تھے۔آپ کی نبوت کا آغاز قرآن مجید کی کچھ آیات نازل ہونے کے ساتھ ہوا، قرآن کا پیغام نہایت مختصر تھا کہ ہمارا مقصدِ زندگی معبودِ حقیقی کی عبادت کرنا ہے۔اسلام میں عبادت ایک نہایت جامع حیثیت رکھتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی محبت، توجہ اور تمام اعمال کا مرکز اللہ کی ذات کو رکھے۔

رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام اور ان کی نبوت کی سچائی کو جانچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم حقیقت پسندی سے اس ضمن میں موجود روایات اور تاریخی بیان کا بغور جائزہ لیں تا کہ ایک متوازن نتیجے تک پہنچا جاسکے۔ قرآن پاک اسی حوالے سے ایک نہایت عقلی طریقہ بتاتا ہے جس سے نبی کے دعوی کو چیک کیا جاسکتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نہ جھوٹے تھے، نہ مجنوں اور دیوانے تھے اور نہ ہی اوہام کا شکار انسان تھے۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے تھے بلکہ جو اللہ کا پیغام ان تک پہنچتا تھا، وہ بندگانِ خدا تک ویسا ہی پہنچا دیتے تھے۔ قرآن پاک گواہی دیتا ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور لحاظہ سچے ہیں۔

اور تمہارے ساتھ کے رہنے والے محمد ﷺ مجنون نہیں ہیں۔ (سورت التکویر آیت 22)(403)

یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے نہ راہ (حق) سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ ہولئے۔ (سورۃ النجم آیت 2) (404)

محمد ﷺ خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں اور آپس میں رحم دل، (اے دیکھنے والے) تو ان کو دیکھتا ہے کہ (خدا کے آگے) جھکے ہوئے سر بسجود ہیں اور خدا کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں۔ (کثرت) سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں۔ اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔ (وہ) گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تا کہ کافروں کا جی جلائے۔ جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک

عمل کرتے رہے ان سے خدا نے گناہوں کی بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے (سورۃ الفتح، آیت 29) (405)

ہم ان آرگومنٹس کا خلاصہ اس انداز میں بیان کر سکتے ہیں:

1۔ محمد ﷺ یا تو جھوٹے اور مجنوں / بھکے ہوئے تھے یا سچ بولتے تھے۔

2۔ محمد ﷺ جھوٹے اور بھکے نہیں ہو سکتے۔

3۔ چنانچہ محمد ﷺ سچ بولتے تھے۔

1۔ کیا (معاذاللہ) حضور صلّی اللہ علیہ وسلم جھوٹے تھے؟

اولین تاریخی ماخذ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم ایک مضبوط اور اعلیٰ کردار کے حامل انسان تھے۔ حتّٰی کہ اپنے جانی دشمنوں میں بھی ''صادق'' کے لقب سے مشہور تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ (معاذاللہ) حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے کذب بیانی کی، ایک نہایت ہی بے بنیاد اور ناقابلِ یقین الزام ہے۔(406)

حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نے اس وقت کے معاشرتی اور معاشی ڈھانچوں کی بنیاد ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ساتویں صدی میں مکہ کی معیشت کا انحصار تجارت اور کاروبار پر تھا۔ مکہ کے سردار کعبے میں موجود 360 بتوں کے ذریعے اس وقت کے بت پرست تاجروں کو اپنی طرف راغب کرتے تھے۔ پیغمبرِ خدا کا توحید پر مبنی پیغام سادہ تھا لیکن اس نے ساتویں صدی کے عربوں کے اس شرک کو بہت قوت کیساتھ چیلنج کیا جس

کی وجہ سے اس نظام کے پروردہ افراد آپ کے مخالف ہو گئے۔ اولاً یہ لوگ آپ کا مذاق اڑانے لگے اور یہ سوچنے لگے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا کوئی اثر نہ ہو گا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ آپکا پیغام جڑ پکڑ رہا ہے اور عالی حسب و نسب کے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں تو انہوں نے آپ صلّی اللہ علیہ وسلم کو ذہنی اور جسمانی طور پر اذیت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

اس پیغام سے روکنے کے لیے آپ پر طرح طرح کے ظلم کیے گئے، آپ کا معاشرتی مقاطعہ کیا گیا، آپ کو فاقہ کشی پر مجبور کیا گیا، آپ پر پتھر برسائے گئے یہاں تک کہ آپ کے نعلینِ مبارک خون سے بھر گئے، آپ کو اپنے پیارے شہر سے ہجرت اور جلاوطنی پر مجبور کر دیا گیا۔ آپ کے دوستوں پر بھی ظلم و ستم کیا گیا جس کی وجہ صرف اور صرف یہی خدائی پیغام یعنی توحید پرستی تھی۔ اسی پر آشوب دور میں آپ کی اولین رفیقۂ حیات بھی وفات پا گئیں۔(407) یہی دیکھا گیا ہے کہ ایک جھوٹا شخص دنیاوی فوائد کے لیے جھوٹ بولتا ہے لیکن اس کے برعکس حیاتِ نبوی کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ باوجود اس کے کہ آپ کو دنیاوی دولت اور مراتب کی پیشکش کی گئی اور آپ کو بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا لیکن آپ صلّی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا پیغام پھیلانا نہ چھوڑا۔(408)

اسلامی علوم اور عربی کے مایہ ناز مستشرق پروفیسر منٹگمری واٹ اپنی کتاب "Muhammad at Mecca" میں یہ کہتے ہیں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کو بہروپیا یا جھوٹا (معاذاللہ) کہنا ایک خلافِ عقل اور نامعقول بات ہے: "ان کا عزم و استقلال جس کے ذریعے وہ کسی بھی مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے، ان پر ایمان لانے اور انکو اپنا لیڈر ماننے والوں کا اعلیٰ اخلاقی کردار اور ان کی عظیم کامیابیاں۔۔ یہ سب

کے سب محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کے عظیم اور لازوال کردار کی دلیل ہیں اور یہ گمان کرنا کہ وہ (معاذاللہ) ایک بہروپیا ہیں مزید مشکلات کو جنم دیتا ہے نہ کہ حل کرتا ہے۔"(409)

2۔ کیا آپ مجنوں/بھکے ہوئے(deluded) تھے؟

یہ دعوی کہ آپ ﷺ مجنوں تھے اس کا آسان مطلب یہی ھے کہ وہ خود کو خدا کا پیغمبر بتلا کر لوگوں کو گمراہ کر رھے تھے۔ اگر کوئی مجنوں ھو تو اس کو بغیر کسی ثبوت کے اپنی بات کے سچ ھونے پر یقین کامل ھوتا ھے۔ جو بندہ مجنوں ھو وہ اپنی کی ھوئی ھر بات کو سچ سمجھتا ھے چاھے اس کی بات حقیقت میں جھوٹی ھی کیوں نہ ھو۔

آپ ﷺ کی زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آئے کہ اگر آپ ﷺ واقعی معاذاللہ مجنوں ھوتے اور اور ساری باتیں جو آپ ﷺ نے اسلام کی شکل میں پیش کیں وہ آپ ﷺ کے اپنے ذہن کی اختراع ھوتیں تو آپ ﷺ ان موقعوں کو اپنے حق میں ضرور استعمال کرتے لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔ جیسا کہ آپ ﷺ کے بیٹے ابراہیم کی وفات سورج گرہن والے دن ھوئی۔ اور بہت سے لوگوں نے کہا کہ سورج گرہن اس لئے ھوا کیونکہ آج نبی کے بیٹے کی وفات ھوئی ھے۔ اگر آپ ﷺ چاھتے تو ان کی تائید کر سکتے تھے اور اس بات کا آپ ﷺ کو ہی فائدہ ھوتا۔ اور آپ ﷺ کے موقف کی تائید ھوتی۔ لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے ان کی باتوں کا یہ کہ کر رد کیا کہ سورج اور چاند گرھن کسی کی وفات کی وجہ سے نہیں ھوتے بلکہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ھیں۔ جو بھی انہیں دیکھے قیام کرے اور نماز پڑھے۔(410)

نبی ﷺ نے بہت سی پیش گوئیاں ایسی کیں جو آپ ﷺ کے معاشرے میں آپ ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد واقع ہونی تھیں۔ اور وہ ساری باتیں ویسی ھی ھوئیں جیسا آپ ﷺ نے کہا تھا۔ کسی بہکے ہوئے مجنوں کیلیئے یہ سب ممکن نہیں۔ مثلا:

ا۔ منگولوں کا حملہ:

آپ ﷺ کی وفات کے تقریبا چھ سو سال بعد منگولوں نے مسلم سرزمین پر حملہ کیااور لاکھوں لوگوں کو قتل کیا۔ بغداد کی تباہی اس جنگ کا سب سے بڑا نقصان تھا۔ بغداد اس وقت علم و تہذیب کا عظیم الشان مرکز تھا۔ منگول 1258 میں بغداد پر حملہ آور ھوئے اور پورا ایک ہفتہ قتل وغارت کا بازار گرم کیے رکھا۔ گلیاں خون سے بھر گئیں۔ ھزاروں کتابوں کو جلا دیا، دس لاکھ لوگوں کو قتل کیا۔ یہ اسلامی تاریخ کا اندوہناک واقعہ ھے۔

منگول غیر عرب تھے، چپٹی ناک، چھوٹی آنکھیں کے مالک تھے اور بالوں سے بنے موزے پہنتے تھے۔ منگولوں کے حملے کی پیش گوئی آپ ﷺ نے ان کے حملے سے کئی سو سال پہلے ہی ان الفاظ میں کر دی تھی: "قیامت تب قائم نہیں ھو گی جب تم لوگ غیر عرب خوز اور کرمانیوں سے جنگ نہ کر لو۔ ان کے چہرے سرخ، ناک چپٹی اور آنکھیں چھوٹی ھوں گی۔ ان کے چہرے کوٹی ہوئی ڈھال کی طرح تہ بتہ ہوں گے، انکے لباس اور جوتے بالوں سے بنے ھوں گے" (411)

ب۔ اونچی عمارتیں بنانے میں مقابلے بازی:

کسی شخص نے پوچھا: قیامت کب قائم ہو گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس سے پوچھا گیا وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نھیں جانتا۔ بولا: پھر اس کی نشانیاں بتا دیجیئے. آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم دیکھو گے کہ وہ بدو جن کو پہننے کیلیئے جوتے اور کپڑے بھی میسر نہیں، اونچی اونچی عمارتوں کے بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے"۔(412)

اگر اس پیش گوئی کی تفصیل میں جائیں تو اس میں عرب کے مخصوص بدوؤں کا ذکر ھے۔ حالانکہ آپ ﷺ زیادہ محفوظ اور جنرل انداز میں بھی یہ بات کہہ سکتے تھے کہ "تم اونچی اونچی عمارتیں بنتی دیکھو گے"۔ اس طرح یہ بات تمام دنیا کیلیئے ھو جاتی اور اس کے سچا ھونے کے بھی زیادہ امکانات ھوتے۔ آج ھم دیکھتے ھیں کہ واقعی وہ عرب بدو جو اونٹ اور بھیڑ بکریاں پالتے تھے، وہ اونچی اونچی عمارتیں بنا رھے ھیں۔ دبئی کا برج خلیفہ 828 میٹر کی بلندی کے ساتھ دنیا کی سب سے اونچی عمارت ھے۔ تھوڑے ھی عرصے بعد ہی سعودیہ کی ایک شاھی فیملی نے اس سے اونچی (1000 میٹر) عمارت کنگڈم ٹاور بنانے کا اعلان کیا جو 2019 میں مکمل ہو گی۔ اونچی عمارتیں بنانے کا مقابلہ عربوں میں جاری و ساری ہیں۔(414)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ پچاس ساٹھ سالوں پہلے تک ان لوگوں کے پاس رہنے کو گھر نھیں تھے۔ زیادہ تر لوگ خانہ بدوش تھے اور جھگیوں میں رھتے تھے۔ بیسویں صدی میں تیل کی دریافت نے اس علاقے کے حالات بدلنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اگر تیل دریافت نہ ھوتا تو شاید اب بھی یہ علاقہ بنجر صحرا ھوتا جیسا کہ نزول قرآن کے وقت تھا۔ اگر واقعی آپ ﷺ اندازے یا تکے کی بنیاد پر بات کر رہے ھوتے تو کیا یہ زیادہ عقلی بات نہیں تھی کہ آپ یہ پیشن گوئی اپنے وقت کی سپر پاورز روم یا پیرس کے بارے میں کرتے کیونکہ وہ اس وقت اس قابل تھے کہ اونچی عمارتیں اور محلات بنا سکیں۔(415)

مکہ میں موجود زیر زمین سرنگیں اور پہاڑوں سے بھی اونچی عمارات:

سرنگوں اور پہاڑوں سے اونچی عمارات کے بارے میں آپ ﷺ نے ان الفاظ میں خبر دی: ''جب تم مکہ میں سرنگیں اور پہاڑوں سے بھی اونچی عمارتیں بنتی دیکھو تو سمجھ جانا اب وقت قریب آگیا ھے''۔(416)

ایسی سرنگوں اور عمارات کی تصاویر آپ انٹرنیٹ پر بھی باآسانی دیکھ سکتے ھیں۔

آپ ﷺ کی تعلیمات، کردار، اور اس کے انسانی معاشرے پر گہرے اثرات اس بات کا ثبوت ھیں کہ آپ ﷺ مجنون نہیں تھے، اللہ کے سچے نبی ھیں اور آپ نے ہمیشہ سچ بولا۔

3۔ کیا آپ دونوں یعنی جھوٹے اور مجنون تھے؟

کسی آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ جھوٹا بھی ہو اور مجنون بھی۔ جھوٹ ارادے سے بولا جاتا ہے جبکہ مجنون وہ ہے جو اس بات کے سچا ہونے پر یقین رکھتا ہے جو درحقیقت سچی نہیں ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کا رد ہیں اور دونوں ایک ھی وقت میں درست نہیں ھوسکتیں۔ یہ بہتان کہ آپ ﷺ جھوٹے بھی تھے اور مجنوں بھی منطقی لحاظ سے ناممکن ہے۔

آپ ﷺ سچے تھے[[He was speaking the truth

اوپر کی گئی بحث سے یہ ثابت ھوتا ھے کہ آپ ﷺ سچے تھے اور ھمیشہ سچے ھی رھیں گے۔ یہ نتیجہ مشہور مورخ ڈاکٹر ولیم ڈریپر (William Draper) نے بھی بہت ہی معقول انداز میں پیش کیا ہے: ''جسٹینین (مشہور رومی حکمران) کی وفات کے چار سال بعد، 569 عیسویں عرب کے شہر مکہ میں

ایک ایسا شخص پیدا ہوا جو اس دنیا کے سب سے عظیم انقلاب کا باعث بنا، بہت سی سلطنتوں کا مذہبی لیڈر، دنیا کی ایک تہائی انسانوں کی روز مرہ زندگی کا رہنما، وہ پیغمبر کے ٹائٹل کی اہلیت رکھتا ہے"۔(419)

دو بڑے اعتراض:

1۔تاریخی حکایت کا اعتراض[Legend]:

دلیل کے خلاف جو اعتراض پیش کیا جاتا ہے اس میں ایک یہ بھی ہے کہ نبی ﷺ کی نبوت کے دعویٰ کی وضاحت کے لیے کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ یہ اضافی صورت یوں بیان کی جاتی ہے کہ نبی ﷺ کا دعویٰ ایک حکایت پر مبنی ہے۔ بہ الفاظ دیگر، معروف تاریخ میں اس کا کوئی حوالہ نہیں پایا جاتا۔ یہ اعتراض اس تاثر پر قائم ہے کہ وہ بیانیے اور گواہیاں جو نبی محمد ﷺ کی زندگی کا احاطہ کرتی ہیں، قابل یقین نہیں اور نہ ہی ان کی غیر جانبدارانہ /آزادانہ تصدیق کی جاسکتی ہے۔ قصہ مختصر، اس حوالے کے حامی اسلامی تاریخ پر اعتبار نہیں کرتے۔

"حکایت" والا اعتراض نہ صرف غیر معقول ہے (کہ محمدی انقلاب اور اسکے دنیا پر پڑنے والے اثرات کو جھٹلانا دنیا کی پوری تاریخ کو جھٹلانا ہے، نبوی تعلیمات اور پھر اسکی بنیاد پر کھڑی ہونے والی اسلامی تہذیب جس نے ہزاروں سال تک دنیا کے اسی فیصد انسانوں پر حکمرانی کی، انہیں جینے کا سلیقہ و شعور سکھلایا، کیا اسکے اثرات اور نقوش صرف عربوں کی تاریخ اور خطے تک محدود ہیں؟) بلکہ نبی ﷺ کی زندگی کے ماخذوں کے حوالے سے محققین کی تاریخی حوالوں کی سند جانچنے کے پیمانے سے بھی ناواقفیت کا مظہر ہے۔ تاریخ کو محفوظ کرنے کے لیے اسلامی طریقہ کار دو عناصر پر مشتمل ہے: اسناد، جنھیں "روایت کا سلسلہ" بھی کہا جاتا

ہے،اور متن، جس کا مطلب ہے حدیث یا بیان۔ کسی روایت یا بیان کے سلسلے کو جانچنے کے لیے ایک ٹھوس طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔اس جانچ کی اسلامی سائنس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں (اسلامی علمی روایت میں اسے ''علم الحدیث : روایتوں کا علم'' کہا جاتا ہے)،تاہم اس کا ایک مختصر خلاصہ اس کے ٹھوس پیمانوں پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔

1. کسی روایت کے سلسلے کے مستند ہونے کے لیے لازمی ہے کہ ہر راوی کے حوالے سے بہت سے عقلی پیمانے پورے ہوں،ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

2. راوی کے نام، عرفیت، لقب، والدین اور پیشے کا پتہ ہونا چاہیے۔

3. اصلی راوی کا یہ کہنا ضروری ہے کہ اس نے وہ روایت براہِ راست نبی کریم ﷺ سے سنی تھی۔

4. اگر راوی نے کسی اور راوی کی روایت بیان کی ہے، تو دونوں کا ایک ہی زمانے میں زندہ ہونا اور ایک دوسرے سے ملنے کے امکان کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔

5. روایت کو سننے اور اسے آگے بیان کرتے وقت، راوی کا اسے سمجھنے اور یاد کرنے کے لیے جسمانی اور دماغی طور پر اہل ہونا ضروری ہے۔

6. راوی کا متقی اور نیک ہونے کے حوالے سے مشہور ہونا لازمی ہے۔

7. راوی کے لیے ضروری ہے کہ اس پر کبھی جھوٹ بولنے، جھوٹی گواہی دینے اور کوئی جرم سرزد ہونے کا الزام نہ ہو۔

8.راوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے قابل بھروسہ افراد کے خلاف نہ بولا ہو۔

کسی بیان کی حدیث کو قبول کرنے کے لیے مختلف عقلی پیمانوں پر پورا اترنا لازمی ہے۔ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

حدیث صاف اور سادہ زبان میں ہونی چاہیے، کیونکہ بلااعتراض نبی محمد ﷺ کا اندازِ گفتگو ایسا ہی تھا۔ایسی حدیث جو ایسے عوامل کے حوالے سے ہو جو عام طور پر مشہور ہوں اور ان پر عمل کیا جاتا ہو، لیکن حقیقت میں مشہور نہیں تھے اور ان پر عمل نہیں ہوتا تھا تو ایسی حدیث کو رد کر دیا جاتا ہے۔ایسی حدیث جو بنیادی قرآنی تعلیمات کے خلاف ہو اسے رد کر دیا جاتا تھا۔ مشہورِ زمانی تاریخی حقائق سے مطابقت نہ رکھنے والی حدیث کو رد کر دیا جاتا تھا۔(420)مزید تفصیل کیلئے یہ لنکس دیکھیے:1،2،3،5،4

2۔بہتری کے لیے جھوٹ بولنے کی لاجک:

اس بحث میں جو ایک اور اعتراض سامنے آتا ہے وہ وہ دلیل کی موزونیت کے حوالے سے ہے۔مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ نبی محمد ﷺ نے غیر اخلاقی پہلو سے جھوٹ نا بولا ہو وہ ایک بڑی بھلائی کے لیے جھوٹ بول کر خود کو نبی کہلوانا چاہ رہے ہوں۔ایک معاشرتی مصلح کے طور پر وہ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ جس اخلاقی طور پر پست اور پسماندہ معاشرے میں رہ رہے تھے اس کو بدلنے کے لیے یہ انتہائی قدم اُٹھانا ضروری ہے۔اس طرح وہ مجنوں بھی نہیں ٹھہریں گے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ سچ نہیں بول رہے، اور اخلاقی طور پر بھی انھیں جھوٹا نہیں سمجھا جائے گا۔ وہ اخلاق کی اصلاح کرنے والے ہوں گے اور زیادہ تر

فلاح کاروں کی طرح ایک بڑی بھلائی کے لیے دو برائیوں میں سے سب سے کم درجے والی برائی کا انتخاب کرنا ہو گا۔

یہ دلچسپ اعتراض کچھ وجوہات کی بنا پر بے موزوں ہے۔ اول تو یہ بات ہی غیر عقلی ہے کہ ضروری اخلاق تبدیلی لانے کے لیے نبوت کا دعویٰ ضروری ہے۔ بلکہ حقیقت میں حضور ﷺ کا یہ دعویٰ کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے انکے لیے معاشرے میں کوئی مضبوط مقام حاصل کرنے کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ ان پر طنز کیا گیا، تمسخر اڑایا گیا اور گالیاں دی گئیں۔ ایک فلاح کار ایسا کوئی دعویٰ نہیں کرے گا، خاص طور پر اس وقت جب یہ دعویٰ مقصد کے حصول کی راہ میں مزید رکاوٹیں پیدا کرنے کا موجب ہو۔ دوسرا حضور ﷺ کو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن پھر بھی انھوں نے اپنے پیغام کے حوالے سے نہ تو کوئی سمجھوتہ کیا اور نہ ہی اسے پسِ پشت ڈالا۔ انھیں مشروط سیاسی قوت کی پیشکش کی گئی، جس کے ذریعے وہ معاشرے کی اخلاقی صورت سنوار سکتے تھے، لیکن انھوں نے اس قوت کی پیشکش کو ٹھکرا دیا کیونکہ اسے قبول کرنے کا یہ مطلب تھا کہ وہ اپنے مقدس پیغام کو ترک کر رہے ہیں جس کے مطابق سوائے اللہ کے دوسرا کوئی پرستش کے لائق نہیں اگر وہ محض ایک اخلاقی فلاح کار ہوتے تو وہ اپنا لائحہ عمل تبدیل کرتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

محمد ﷺ کی تعلیمات ایسی نہیں ہیں جو کسی فریب میں مبتلا شخص یا کاذب کی ہوتی ہیں۔ اپنی دیگر بہت سی تعلیمات کے ساتھ ساتھ انھوں نے انسانیت کو بھائی چارے، رحمدلی، عاجزی، امن، محبت اور دوسروں کے حوالے سے حقوق و فرائض بتائے۔ آپ ﷺ کا کردار مثالی تھا۔ آپ اچھائی کی انتہا پر پہنچے، دردِ دل رکھنے والے، عاجز، قوتِ برداشت سے بھرپور، منصف، اور انسانیت کی عظیم جھلک دکھلانے والے، پرہیز گار اور

نیک تھے۔آپ کی راہنمائی کی بدولت دنیا پر بے مثال اثرات مرتب ہوئے۔آپ ﷺ کی پر اثر قیادت، برداشت کی متاثر کن تعلیمات، انصاف، ترقی، عقیدے کی آزادی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں راہنمائی اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ کسی فریب میں مبتلا نہیں تھے، بلکہ وہ سچے انسان تھے۔ جتنا زیادہ ہم پیغمبرانہ دانائی کا مطالعہ،اور غور وفکر کریں اتنا ہی ہم محمد ﷺ کی محبت اور تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

تحریر حمزہ اینڈرئیس، دی ڈیوائن ریلٹی، ترجمہ محمد وقاص، دانش

حوالہ جات

The name Muhammad is mentioned four times and 401 Ahmad (another one of his names) is mentioned once. See http://corpus.quran.com/search.jsp?q=muhammad and http://corpus.quran.com/search.jsp?q=ahmad [Accessed 24th October 2016].

Muhammad is not the father of anyone of you men; "402 he is God's messenger and the seal of the Prophets: God knows everything." The Qur' an, Chapter 33, Verse 40.

The Qur'an, Chapter 81, Verse 22.403

The Qur' an, Chapter 53, Verse 2.404

The Qur'an, Chapter 48, Verse 29.405

Lings, M. (1983) Muhammad: His Life Based on the 406
Earliest Sources, p. 34.

Ibid, p. 52.407

Ibid, pp. 53 – 79.408

Watt, W. M. (1953) Muhammad at Mecca. Oxford: 409
Oxford University Press, p. 52.

Narrated by Bukhari.410

Narrated by Muslim, hadith no 2810,2811, 2812..411

Narrated by Muslim.412

Burj Khalifa. (2016) Facts & figures. Available at: 413
http://www.burjkhalifa.ae/en/the-
tower/factsandfigures.aspx [Accessed 1″ October 2016].

Carrington, D. (2014) Saudi Arabia to Build World's 414 Tallest Tower, Reaching 1 Kilometer into the Sky. Available at:

http://edition.cnn.com!20 14/04/ 17 /world/meast/saudi-arabia-to-build-tallest-building-ever! [Accessed 1″ October 2016].

Zakariya, A. (2015). The Eternal Challenge: A Journey 415 Through The Miraculous Qur'an. London: One Reason, pp. 69-70.

Narrated by Ibn Abi Shaybah.416

Narrated by Tabarani, in the chapter Kitab al-Fitan. 417 The Islamic scholars have graded the authenticity of this tradition as weak. However, it does not mean it is impossible that the Prophet ~ said these words. There is still a relatively high possibility.

For example, see Brody, G., Stoneman, Z., and 418
Sanders, A. Effects of Television Viewing on Family Interactions: An Observational Study. Family Relations 29, no. 2 (1980): 216-

.20

Draper,]. W. (1905) History of the Intellectual 419
Development of Europe. New York and London: Harper and Brothers Publishers. Voll, pp. 329-330.

See M. M Azami. (1978) Studies in Early Hadith 420
Literature. Indianapolis, Indiana: American Trust Publications.

نظریہ ارتقاء کو الحاد کی معقولیت کیلئے استعمال کیوں نہیں کیا جاسکتا؟

"زندگی کے بارے میں یہ تصور اپنے اندر بڑی شان و شوکت رکھتا ہے جس کے مطابق اس کے آغاز میں خالق نے کئی قسم کی قوتیں چند مخلوقات یا کسی ایک مخلوق کو عطا کیں اور کشش کے اٹل ضابطوں کے زیرِاثر ،یہ کرّہ جوں جوں اپنے محور پر گردش کرتا جاتا ہے، یہ بے حد سادگی سے شروع ہونے والی متناہی مخلوقات وجود میں آتی ہیں جو کہ بے حد حسین اور نہایت حیرت انگیز واقع ہوئی ہیں،اور مزید ہوتی چلی جارہی ہیں"۔ (چارلس ڈارون)

"خدا پر ایمان اور ارتقاء کے سائنسی نظریے کا آپس میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے۔خدا پر ایمان کا اصل اختلاف تو اس فلسفیانہ حاشیہ کاری یا من گھڑت اختراع سے ہے جو ارتقاء کے سائنسی اصول پر تھوپا گیا ہے[philosophical gloss or add-on to the scientific doctrine of evolution]،یعنی یہ دعویٰ کہ ارتقاء ایک ایسا عمل ہے جو کسی سمت کے بغیر،خدا یا کسی بھی ہستی کی

راہنمائی، یا اسکے بنائے ہوئے ضابطے کے بنا چلا جا رہا ہے"۔ (مشہور فلسفی ایل ون پلانٹنگا (Alvin Plantinga) کا مقالہ "سائنس، مذہب اور فطرت پرستی: اختلاف دراصل ہے کہاں")

میڈیا پر جاری ڈارون ازم اور کریشن ازم کی آئے دن کی بحثوں کے باعث یہ بالکل ممکن ہے کہ آپ جذباتی تقریروں میں ہی گم ہو کر رہ جائیں۔ لیکن ان لفّاظیوں سے ہٹ کر، اگر غور کیا جائے تو یہ سادہ سی حقیقت سامنے آجائے گی کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا خدا کے وجود کے انکار سے کوئی لینا دینا نہیں۔آپ سوچ رہے ہوں گے میری اس بات سے کیا مراد ہے؟ زندگی کے وجود میں آنے کی توجیہہ کے لیے ڈارون کے تجویز کردہ بے ترتیب تغیّر اور فطری چناؤ کے اندھا دھن عمل [blind mechanism of random mutation and natural selection] کو خدا کے متبادل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ماہر ریاضی جان لینیکس (John Lennox) اپنی کتاب " :Undertaker: Has Science Buried God? میں لکھتے ہیں:

"ایک خاص نقطہ نظر کے حامل افراد کے لیے اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کہ فطرت کی قوتوں اور اس کے افعال کو اندھا دھن تصور کیا جائے۔ زیادہ تر فطری افعال واقعی ایسے ہی نظر آتے ہیں۔ کمزور اور طاقتور نیوکلائی قوتیں، برقی مقناطیسیت اور کششِ ثقل کے پاس کوئی ذہنی یا جسمانی آنکھیں تھوڑی ہیں جن سے وہ دیکھ سکتی ہوں۔ اور گھڑی، گاڑی، سی ڈی پلیئر یا کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک پر نظر ڈالیں، وہ بھی آپ کو بصارت سے محروم ہی ملیں گے۔ اور اس سے بڑھ کر، وہ نا صرف دیکھ نہیں سکتے بلکہ ان کو کوئی شعور بھی نہیں، بلکہ زیادہ درست بات یہ ہوگی کہ ان میں شعور و فکر کی صلاحیت ہی نہیں کیونکہ ان میں دماغ نہیں پایا جاتا۔ یہ خودکار سلسلے جو اگرچہ کہ خود نابینا ہیں، لیکن یہ ایسے اشخاص کی تخلیق ہیں جن کے بارے میں نابینا

ہونے کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ خودکار سلسلے بہت ذہانت کے ساتھ تخلیق کیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسے افعال جن کے اندر کسی درجے میں بے ترتیبی پائی جاتی ہے ان پر بھی یہ بات پوری طرح ٹھیک بیٹھتی ہے''۔

لینیکس بطور مثال ایک سادہ سی ذہنی مشق پیش کرتے ہیں جسے میں کچھ یوں بیان کروں گا۔ ''تصور کیجیے گاڑیوں کی ایک ایسی فیکٹری ہے کہ جس میں تمام کام خودکار روبوٹ کرتے ہیں۔ کیا ہم یہ دیکھ کر کہ یہاں سارا کام خودکار روبوٹ کرتے ہیں یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ گاڑیاں تیار کرنے کا عمل ایک عقل و شعور سے عاری کام ہے؟۔ ایسا دعویٰ کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم پہلے یہ بھی تسلیم کریں کہ تمام روبوٹ، ان کو چلانے والے سافٹ ویئر پروگرام اور فیکٹری خود، کسی صاحبِ عقل کی تخلیق نہیں۔ لیکن کوئی ذرا بھی معقول شخص یہ جان سکتا ہے کہ اصلاً ایسا نہیں ہے اور انسانی ذہانت اس میں واضح طور پر کارفرما ہے۔

یہ سوال کہ آیا زندگی کو کسی ذہین ہستی نے وجود بخشا یا اس کا بنانے والا ذہانت سے عاری ہے، سائنس سے متعلق ہے ہی نہیں۔ بلکہ یہ سائنس سے ماوراء یا مابعدالطبیعات * سے متعلق ہے۔

کیونکہ بائیولوجی کا موضوع تو زندگی کے چلتے ہوئے سلسلے میں اسباب و علل سے متعلق مسائل ہیں نا کہ اس اوّلین سبب کا تعین کہ جس سے زندگی کی ابتداء ہوئی' اس کا موضوع ہے۔ دوسرے لفظوں میں سائنسی طریقوں کی مدد سے یہ دکھایا جانا ناممکن ہوگا کہ فطرت کے قوانین اور افعال (جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ ارتقاء کے عمل کی راہنمائی کرتے ہیں) کیسے وجود میں آئے۔ ان قوانین اور افعال کے وجود میں آنے کے سوال کا تعلق اس اوّلین سبب سے ہے اور ایسے بنیادی سوالات سائنس کی مدد سے نہیں بلکہ ماورائے

سائنس یا موجودات((ontological☆ کے علم سے دیے جا سکتے ہیں۔آسان الفاظ میں یہ نقطہ نظر کہ ڈارون کے پیش کردہ ارتقاء کے عمل میں اور ارتقا کے عمل کی رہنمائی کرنے والے فطرت کے قوانین کی تخلیق میں بھی کسی قسم کی ذہانت کارفرما نہیں ایک فلسفیانہ موشگافی[philosophical add-on] ہے سائنس نہیں۔

(☆آنٹالوجی((Ontology مابعد الطبیعات(جو کہ خود فلسفے کی ایک اہم ترین شاخ ہے)کی وہ شاخ ہے جو وجود کی فطرت سے بحث کرتی ہے۔

☆"ماوراء سائنس" کی اصطلاح ان اصولوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو سائنس کے لیے اگرچہ بنیادی نوعیت کے حامل ہیں لیکن بذاتِ خود سائنس کے ذریعے ان کی تصدیق ممکن نہیں۔)

خدا کے وجود پر یقین رکھنے والے ایسے افراد جو ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو تسلیم کرتے ہیں وہ اس کے ماورائے سائنس ہونے کا نظریہ[meta-scientific view]اختیار کرتے ہیں یعنی اس کے پیچھے ایک برتر ذہین ہستی کے کارفرما ہونے کے نظریے کے قائل ہیں(بالکل ویسے ہی جیسے روبوٹ،ان کے سافٹ ویئر،اور فیکٹری بذاتِ خود انسانوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں)۔دوسری طرف ملحد حضرات کو یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ انتہائی پیچیدہ طبعی قوانین اور افعال بس خود سے قائم و دائم ہیں۔

درحقیقت ایسے مذہبی حضرات کی کثیر تعداد ہے جو خدا پر ایمان رکھنے والے ہیں اور ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔جان لینکس ایسے کئی اشخاص کا ذکر کرتے ہیں۔

”برطانیہ میں مثال کے طور پر دنیا کی مشہور کیو گارڈنز (Kew Gardens) لندن کے سابق ڈائریکٹر سر گِلین پرانس (Ghillean Prance) فیلو آف دی رائل سوسائٹی (FRS)،سر برائن ہِیپ (Brian Heap) دی رائل سوسائٹی کے سابق نائب صدر (FRS)، کیمبرج یونیورسٹی کے جیولوجی کے پروفیسر باب وہائٹ ((Bob White، FRS)، کیمبرج یونیورسٹی کے پالیو بائیولوجی [Paleobiology] کے پروفیسر سائمن کانوے مورس (Simon Conway Morris) (FRS)، لندن یونیورسٹی کے ایوولوشنری بائیولوجی کے پروفیسر سام بیری (Sam Berry) اور کیمبرج یونیورسٹی کے فراڈے انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈینس الیگزینڈر (Denis Alexander)، یہ سب دورِ حاضر کے ممتاز ارتقائی بائیولوجی کے ماہرین ہیں جو خدا پر یقین رکھتے اور درحقیقت عیسائی ہیں۔

امریکہ میں انسانی جینوم کے پراجیکٹ (Human Genome Project) ڈائریکٹر فرانسز کولنز (Francis Collins) ہیں جو کہ خدائی تصور کے حامل ارتقاء کے عمل کو بائیولوگوس [Biologos] کا نام دیتے ہیں۔ یہ تمام حضرات ارتقاء کے عمل سے الحاد یا خدا کے انکار کی دلیل ڈھونڈنے کی کسی بھی کوشش کو پوری شدت سے رد کرتے ہیں۔

بلکہ شاید چارلس ڈارون نے خود اس سلسلے میں پوری دردمندی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اپنی سوانح حیات میں وہ لکھتے ہیں:

"خدا کے وجود پر ایمان کی ایک اور دلیل مجھے کہیں زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے اور اس کا تعلق جذبات سے نہیں بلکہ عقل سے ہے۔ یہ تصور کرنا محال، بلکہ ناممکن ہے کہ یہ انتہائی زبردست کائنات، اور یہ انسان کہ جس کے پاس دور دراز ماضی اور مستقبل میں کہیں آگے تک نظر ڈالنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، محض ایک اندھے اتفاق، یا ضرورت کی پیداوار ہیں۔ اس زاویے سے غور کرتے ہوئے میں خود کو مجبور پاتا ہوں کہ اس اوّلین سببِ تخلیق میں ایک انسانی ذہن سے کسی درجے مماثلت رکھنے والی ذہانت کی موجودگی کو تسلیم کروں اور اس طرح میں مستحق ہوں کہ میرا شمار بھی خدا پر یقین رکھنے والوں میں کیا جائے"۔

ماہرِ فزکس اسٹیفن برَ [Stephen Barr] 'جدید فزکس اور قدیم ایمانیات' میں جان لینکس کی طرح رچرڈ ڈاکنز کی خدا کے انکار اور ارتقاء کے موضوع پر کتاب "نابینا گھڑی ساز" کے جواب میں اس ہی نوعیت کی دلیل پیش کرتے ہیں:

"اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ فطری سلسلہ افعال کے بارے میں سائنسی روداد [scientific accounts of natural processes] کہیں بھی یہ تصور پیش نہیں کرتی کہ صریح بد نظمی سے ایک مربوط نظم وضبط وجود میں آیا، یا ساخت سے محروم حالت سے ساخت کا ظہور ہوا۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ سائنسی روداد ہمیں یہ بتاتی ہے کہ فطرت میں پائی جانی والی اشیاء کے اندر ایک نظم وضبط پوشیدہ ہے جو بتدریج ظاہر ہوتا چلا جاتا ہے، ہاں ایسا اکثر ایک غیر محسوس اور خفیہ انداز میں واقع ہوتا ہے۔ جب ہم نے بے ہنگم نظر آنے والی صورتحال، یا ایسی چیزیں جو بنا کسی خاص ساخت کے پائی جاتی ہیں خود بخود اور اچانک ایک منظم ترتیب میں خود کو ڈھال لیتی ہیں' کو دیکھا ہم نے ایسے ہر معاملے میں یہ جانا کہ وہ جو بظاہر بے ہنگم نظر آرہا تھا وہ درحقیقت اپنے اندر ایک زبردست ترتیب رکھتا تھا۔۔ مشہور ملحد

بائیولوجسٹ رچرڈ ڈاکنز اس بات کی تعریف نہیں کرتے لگتے کہ ان کا نابینا گھڑی ساز[blind watchmaker]پالے[ ]Paley]کی گھڑی سے کہیں زیادہ زبردست واقع ہوا ہے۔ پالے کو ایک گھڑی زمین پر پڑی ہوئی ملتی ہے اور وہ سوال اٹھاتا ہے کہ ایسی چیز بھلا اتفاقیہ طور پر یہاں کیسے پائی جاسکتی ہے۔ ڈاکنز ایک عظیم الشان خودکار فیکٹری دیکھتا ہے جو اندھادھن گھڑیاں بنائے چلی جارہی ہے اور اپنے تیئں سمجھتا ہے کہ اس نے پالے کے سوال کا تسلی بخش جواب دے دیا ہے۔ لیکن یہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ ایک گھڑیاں بنانے والی فیکٹری کے بارے میں کیسے اس وضاحت کی ضروری درکار نہیں ہوسکتی جو ہمیں ایک گھڑی کے بارے میں چاہیے۔ جب ایک گھڑی کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیوں کر وجود میں آئی تو کیا یہی سوال گھڑیاں بنانے والی فیکٹری کے بارے میں نہیں اٹھتا؟''

جو حضرات اس موضوع پر مزید گہرائی میں جانا چاہیں، وہ یہ مکالمہ دیکھ لیں Does Evolution Undermine God? – Professor Pritchard & Subboor Ahmad پروفیسر پریچرڈ یونیورسٹی آف برمنگھم میں لائف سائنس کے پروفیسر ہیں اور خود کو card-carrying Darwinist کہتے ہیں۔ صبور احمد حمزہ اینڈرئیس کے دعوت پروجیکٹ کے ممبر ہیں، بیالوجی میں سپیشلسٹ اور فلاسفی میں پوسٹ گریجویشن کررہے ہیں۔ اس مکالمہ میں خالص سائنسی حوالے سے ایولوشن پر بحث کی گئی ہے اور یہ ارتقاء کے متعلق عوامی سوچ اور اصل علمی حقیقت میں فرق کو بھی واضح کرتا ہے۔ ایک اور اہم ویڈیو مکالمہ نظریہ ارتقاء کے الحاد کیساتھ تعلق اور نظریہ ارتقاء کے ذریعے انکار خدا کی معقولیت پر ہے جو صبور احمد کا ایتھیس الائنس آف امریکہ کے سابق صدر کیساتھ ہوا۔ اس لنک سے دیکھا

جاسکتا ہے۔ مزید صبور احمد کی ہی ایک تقریر نظریہ ارتقاء، ڈارون ازم اور اسلام کے موضوع پر ہے یہ بھی نظریہ ارتقاء کے متعلق جدید ذہن کے بہت سے اشکالات کو دور کرنے میں معاون ہے۔

تحریر سکاٹ ینگرن ترجمہ احسان محمدی، علی حارث

الحاد کو کس طرح ایک خاص قسم کا استثناء درکار ہے۔!

'یہ ایک حیران کن بات ہے کہ کوئی بندہ اتنا بیوقوف ہو کہ وہ اس بات کا قائل ہو کہ یہ خوبصورت زمین ایٹموں (atoms) کے اتفاقی ملاپ (concourse) کے ذریعے پیدا ہوئی یا ہو سکتی ہے۔ (جون رے John Ray، انگریز نیچری (1627-1705) جس کو بہت سے سائنسدان موجودہ علمِ حیاتیات کا بانی تصور کرتے ہیں)

ایک مزاحیہ کالم بعنوان ''جرم کے پانچ بڑے بیوقوفانہ بہانے'' کے نام سے لکھا گیا، جس میں ہالی ووڈ فنکارہ ونونہ رائیڈر (Winona Ryder) کی مشہورِ زمانہ چوری کا بھی ذکر کیا گیا جس کی پاداش میں اس کو 2002ء میں تین سال ٹرائل اور 480 گھنٹے سماجی خدمات کی سزا سنائی گئی۔ اس (فنکارہ) کا دعویٰ تھا کہ اس نے یہ چوری فلم کا ایک کردار ادا کرنے کے لیے کی تاہم وہ کبھی اس فلم کا نام ظاہر نہ کر سکی جس کے لیے وہ مفروضہ تیاری کر رہی تھی۔ ادکارہ کے دلائل اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ چور کے خلاف دی جانے والی

قانونی سزا بعض ""خصوصی صورتوں"" میں مشہور اداکاراؤں کے لیے ساقط ہو سکتی ہے۔ایسے احمقانہ دلائل حیران کن نہیں ہونے چاہئیں اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہ ہالی ووڈ سے آئے ہیں اور ایک ایسے شخص کے دلائل ہیں جو انتہائی شدت سے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لیکن وہ خاص رعایتیں جن کا تقاضہ الحاد کرتا ہے، قدرے زیادہ مضحکہ خیز ہیں۔جب کوئی اس بات پر غور کرتا ہے کہ الحاد بنیادی دلائل سے بھی خاص قسم کا استثناء چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے سائنسی ہونے کے دکھاوے کو برقرار رکھ سکے۔کوئی بھی بحث جو اس قسم کے دلائل پر مبنی ہو ظاہر ہے عقلی طور پر مضبوط قرار نہیں دی جاسکتی۔اور اسی لحاظ سے الحاد کی حمایت میں دیے جانے والے بہت سے دلائل میں مسائل یا پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ملحد اکثر یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے دلائل کو خصوصی رعایت یا استثناء مل سکتا ہے... بغیر یہ بتائے کہ کیوں؟

زندگی کی ابتداء اور ذہن:

مثلا یہ سوال زندگی بے جان مادے سے کس طرح وجود میں آئی؟اپنی تحریر ""زندگی خدا کے بغیر کیوں وجود میں نہیں آسکتی"" میں میں نے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ ماہرِ طبیعات پاؤل ڈیوس (Paul Davis) اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جینیاتی کوڈ (Genetic Code) کا زندگی کی دو زبانوں (آر این اے اور ڈی این اے) کے درمیان معلومات رسانی کا کام کرنا ایک معمّہ ہے۔دماغ یا ذہن کے بغیر کوڈ اور زبانیں کیسے وجود میں آسکتی ہیں؟

پیری مارشل(Perry Marshall)اپنی کتاب Evolution 2.0 میں اسکی سائنسی وضاحت کرتے ہیں کہ کیوں ڈی این اے لغوی طور پر ایک زبان ہے۔ یہ کوئی الپ ٹلپ کوڈ نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:
"رٹگرز [Rutgers]یونیورسٹی کے پروفیسر سنگچل جی(Sungchul Ji)اپنے ایک کمال مقالے بعنوان "ڈین این اے(DNA)کی لسانیت: الفاظ، جملے، گرائمر، صوتیات اور معنویات" کے آغاز میں رقمطراز ہیں: "حیاتیاتی نظام اور سلسلے محض علمِ طبیعات اور علمِ کیمیا کے اصولوں پر نہیں پرکھے جا سکتے بلکہ ان کے لیے علم علامات [semiotics]کے اصولوں کی بھی ضرورت ہے جو کہ لسانیاتی اشاروں اور علامات پر مشتمل ہوتا ہے۔"

جی(Ji)نے انسانی زبان کی تیرہ خصوصیات کی شناخت کی ہے۔ ان کے مطابق DNA میں ان تیرہ خصوصیات میں سے دس موجود ہیں۔ خلیے ڈی این اے میں تبدیلیاں کرتے ہیں، ایک دوسرے سے بات چیت بھی کرتے ہیں اور حقیقی طور پر ایک زبان جس کو جی نے " cellese" کا نام دیا' بولتے ہیں جو کہ مالیکیول کا خود کو منظم کرنے والا نظام ہے، ان میں کچھ جینیاتی بنیادوں پر خلیوں میں چلنے والے عمل کے لیے ضروری معلومات فراہم کرتے ہیں، کچھ علامت کا کام کرتے ہیں اور کچھ اِس سارے کھیل میں محرّک [trigger]کا کردار ادا کرتے ہیں۔

انسانی زبان اور خلیوں کی زبان کے درمیان کیا جانے والا یہ موازنہ کوئی الپ ٹلپ مثال نہیں، یہ بلا مبالغہ اور لغوی ہے۔ انسانی زبان اور خلیوں کی زبان دونوں تہہ بہ تہہ علامات کا استعمال کرتی ہے۔ ڈاکٹر جی(Ji) اپنے ایک پرچے میں اس مماثلت کو یوں بیان کرتے ہیں: "بیکٹیریائی جراثیموں کے درمیان ہونے والے کیمیائی مکالمے میں دوسرے کی بات یعنی الفاظ اور جملوں کو مطلب پہنانا بھی شامل ہوتا ہے اور اپنی پہنچانا

بھی، جو کہ لسانیاتی پیغام رسانی کی بنیادیں ہیں۔" یہی بات جینیاتی مواد(genetic material)پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ خلیوں کے درمیان اشاروں کے ذریعے سے جو گفتگو ہوتی ہے وہ بھی اسی طرز کی ہوتی ہے۔

الحاد زندگی کی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے بے شعور کیمیائی اور طبیعاتی نظاموں کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن الحاد کے لیے ناقابلِ حل مسئلہ یہ ہے کہ ایسے بے دماغ نظاموں کو اس ڈی این اے کا خالق نہیں ٹھہرایا جاسکتا جو کہ ایک زبان ہے جو اشاروں اور علامات کو منظم انداز میں بالکل انسانی زبان کی طرح استعمال کرتی ہے۔ جس طرح اخبار جس سیاہی اور کاغذ کی کیمسٹری پر مشتمل ہوتا ہے وہ اخبار پر موجود الفاظ کے حروف کی ترتیب کی وضاحت نہیں کرسکتی اسی طرح ڈی این اے مالیکیول کی کیمسٹری بھی اس کے اندر الفاظ کی ترتیب کے بارے میں کچھ نہیں بتاسکتی۔ مائیکل پولینی(Micheal Polany)جو کہ یونیورسٹی آف مانچسٹر (UK)میں شعبہ ُطبیعیاتی کیمیا(Physical Chemistry)کے سابق چیئرمین رہ چکے ہیں اور طبیعیاتی کیمیا کے ضمن میں نظری(theoratical)خدمات کے حوالے سے مشہور ہیں، اس بات پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں "جس طرح"، جس طرح ایک پرنٹ شدہ صفحے کا اس صفحے کی کیمسٹری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اسی طرح ڈی این اے مالیکیول کی بنیادی ترتیب اس میں کام کرنے والی کیمیائی قوتوں سے لاتعلق ہوتی ہے"۔

چنانچہ یہ سمجھنا یا فرض کرنا کہ بے دماغ کیمیائی اور طبیعیاتی عمل کے ذریعے کوئی اخبار لکھا جاسکتا ہے، اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا یہ کہنا کہ ایسے کسی بے دماغ عمل کے ذریعے ڈی این اے کا ایسا نظم وجود میں آسکتا ہے۔!

اسی طرح الفاظ کی ترتیب کسی بھی زبان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اصولی طور پر کسی بے دماغ کیمیائی یا طبیعیاتی عمل کے ذریعے حاصل کی جا سکے۔ ورنر گٹ (Werner Gitt) جرمن وفاقی ادارہ برائے طبیعیات اور ٹیکنالوجی میں ڈائریکٹر، پروفیسر اور شعبۂ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے صدر رہ چکے ہیں۔ اپنی کتاب ''بغیر بہانے کے (Without Excuse) میں وہ اس چیز کے کردار کے بارے میں لکھتے ہیں جس کو وہ ''عالمگیر معلومات'' (Universal Information) گردانتے ہیں:

''عالمگیر معلومات ہمیشہ کسی موجود چیز کی تجریدی نمائندگی ہوتی ہیں۔ یہ معلومات کبھی بھی اپنے آپ سے کوئی چیز یا واقعہ نہیں ہوتی بلکہ بنائی گئی علامات ہوتی ہیں جو پیش کی جانی والی چیزوں کی نمائندگی کرتی ہیں ۔ مختلف زبانیں عموماً علامات کا مختلف مجموعہ استعمال کرتی ہیں اور ایک ہی شے یا نظریہ کو بیان کرنے کے لیے مختلف علامات کی ترتیب رکھتی ہیں۔ ان مثالوں کو دیکھیں:

''ایک ناول میں پائے جانے والے الفاظ جو کہ حروف پر مشتمل ہوتے ہیں، کرداروں اور ان کے اعمال کے متبادل کا کام دیتے ہیں۔''

''موسیقی کی لکیریں جو نوٹس پر بنائی جاتی ہیں اس موسیقی کا متبادل ہوتی ہیں جو بعد میں آلاتِ موسیقی کے ذریعے بجایا جاتا ہے۔''

''بینزین (Benzene) کا کیمیائی فارمولا اس کیمیائی مادے کا متبادل ہے جو ایک صراحی میں علمِ کیمیا کے تجربہ خانے میں پڑا ہوتا ہے۔''

”ڈی این اے مالیکیول کے جینیاتی کوڈون(genetic codon) جو کہ تین حروف پر مشتمل ہوتے ہیں، مخصوص امینوایسڈ(Amino Acid) کے متبادل کا کام کرتے ہیں جو کہ ایک مخصوص ترتیب میں جڑ کے پروٹین بنانے کا کام دیتے ہیں۔“

کسی کوڈ یا زبان میں علامات کا متبادل کردار ایسی چیز ہے جو باشعور اور ذہین دماغ کی سرگرمی کے بغیر ممکن نہیں۔ ورنر گٹ بڑی مہارت سے اس اہم نکتے کو بیان کرتے ہیں:

”چند الفاظ کا مجموعہ کئی انداز میں مل کر لاتعداد یا بے شمار الفاظ بنا سکتا ہے۔ یہ الفاظ بے شمار جملے بنا سکتے ہیں اور یہی جملے کوئی بڑی عبارت بنانے کے کام آتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان کے حروف a، c اور t کو ایک لفظ ” cat“ بنانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (ایک دودھ پلانے والا جانور جو خرخراتا ہے اور میاؤں میاؤں کرتا ہے)۔“”انہی حروف کو انگریزی زبان کا لفظ ’ act‘ بنانے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے (ایک ایسا لفظ کہ جو سیاق و سباق کے پیشِ نظر کئی معنی اپنا سکتا ہے جیسے کہ ” caught in the act“ (رنگے ہاتھوں پکڑا گیا)،” (“the second act of the play کھیل/ڈرامے کا دوسرا کردار)،” (“act of Congress کانگریس کا قانون)،” perform a heroic act“ (ایک بہادرانہ کام کرنا اور اسی طرح) قابلِ غور بات یہ ہے کہ حروف a، c اور t کا اس چیز سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے جو یہ مل کر بناتے ہیں یا جو ان کے مرکب سے بنتی ہے۔ یہ حروف صرف اسی وقت بامعنی اور فائدہ مند بنتے ہیں یا ان حروف کو معنی اسوقت ملتا ہے جب کوئی ذہن ان کو طے شدہ معنی اور متفقہ ترتیب میں ملاتا ہے۔

قصہ مختصر، ایک حرف یا علامت صرف اس چیز کی نمائندگی کر سکتی ہے جو کہ ایک باشعور اور ذہین دماغ نے پہلے سے طے کیا ہوتا ہے۔ علامتی نمائندگی یا علامتی اظہار کے لیے ذہنی کھپت لازمی ہے۔ وہ ماہرینِ حیاتیات جو الحاد سے انتہاء پسندانہ نظریاتی وابستگی نہیں رکھتے' وہ یہ تسلیم کرنے میں بے تکلف واقع ہوئے ہیں کہ زندگی کی تخلیق کے پیچھے کوئی ذہن (باشعور اور ذہین دماغ) کارفرما ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی (Harvard University) کے نوبل انعام یافتہ ماہرِ حیاتیات جارج والڈ (George Wald) نے جو کہ اگرچہ نظریاتی طور پر مذہب سے منسلک نہیں ہیں "کائنات میں زندگی اور سوچ" (Life and Mind in the Universe) کے عنوان سے منعقد ہونے والی کانفرنس برائے کوانٹم بیالوجی میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

"مجھے حال ہی میں اس بات کا احساس ہوا ہے، اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ میری سائنسی ادراک کے لیے ایک جھٹکا تھا کہ ان دونوں سوالوں (بے جان مادہ سے ذہن کی ابتداء اور زندگی کی ابتداء) میں مناسبت/ہم آہنگی دیکھی جاسکتی ہے۔ البتہ اس میں یہ احتمال ہے کہ شعور، بجائے زندگی کے ارتقاء کے تسلسل میں آخر میں نمودار ہونے کی بجائے، ہمیشہ سے سانچے ڈھالنے والی قوت کی شکل میں موجود تھا، یعنی طبیعیاتی زندگی کے مبداء و کیفیت کی حیثیت سے۔ جس (شعور) کی طبیعاتی حقیقت اس طبعیاتی ذہن (دماغ) پر مبنی ہے۔ یہ شعور ہی ہے جس نے طبعیاتی کائینات بنائی ہے جس میں زندگی پلتی ہے اور یہاں تک ارتقاء کرتی ہے، وہ جاندار پیدا ہوتے ہیں جو: خود جانتے ہیں، تخلیق کرتے ہیں: سائنس، آرٹ ;اور ٹیکنالوجی بنانے والے ہیں۔"

مائیکروسافٹ کے بانی بل گیٹس لکھتے ہیں: ”انسانی ڈی این اے ایک کمپیوٹر پروگرام کی طرح ہے لیکن اس سے بہت بہت زیادہ بہتر جو ہم نے اب تک بنایا ہے“۔ یہاں تک کہ دنیا کا سب سے من پھٹ ملحد ماہر حیاتیات رچرڈ ڈاکنز بھی اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ڈی این اے کمپیوٹر کی زبان سے بہت ملتی جلتی ایک زبان ہے۔ اپنی کتاب ”جنت سے نکلا ہوا دریا: زندگی کا ڈارونی نقطہ نظر“““ (River ouf of Eden : A Darwinian View of Life) میں ڈاکن لکھتا ہے: ”جینیاتی ہدایات (یعنی جین کے کام کرنے کے لیے دی جانے والی ہدایات) پراسرار طور پر کمپیوٹر کو دی جانے والی ہدایات کی طرح ہیں۔ نہ سمجھ میں آنے والی اصطلاحات کا اختلافات ایک طرف، سالماتی حیاتیات (Molecular Biology) کے ایک شمارے کے صفحات کمپیوٹر انجنیئر نگ کے شمارے کے صفحات کے ساتھ بدلے جاسکتے ہیں۔“ اسی طرح ایک اور جگہ ڈاکن لکھتا ہے: ”کیا وجہ بنی کہ علمِ جینیات (Genetics) انفارمیشن ٹیکنالوجی (I.T) کی ایک شاخ بن چکی ہے۔ جینیاتی کوڈ حقیقت میں کمپیوٹر کے کوڈ کی طرح ڈیجیٹل ہے۔ یہ کوئی مبہم مثال نہیں، بلکہ واقعی حقیقت ہے۔“

الحاد اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتا کہ ایک کوڈ/زبان کسی ذہن کے بغیر کیسے بن سکتی ہے۔

اس چیز کو فرض کرنے کے لیے کہ ایک کوڈ یا زبان بغیر کسی ذہن یا سوچے سمجھے عمل کے بغیر پیدا ہو سکتی ہے الحاد اس اصول سے ایک خاص قسم کا استثناء چاہتا ہے جس کے مطابق علامات اور اشاروں پر مشتمل زبان صرف اور صرف سوچے سمجھے عمل اور ذہانت کے نتیجے میں وجود پا سکتی ہے اور ملحد اس بات کی وضاحت کرنے سے بھی قاصر ہیں کہ انہیں یہ استثنا کیوں دیا جائے۔؟ اگرچہ ویونہ رائڈر کی اپنی چوری کے متعلق دی

جانے والی وضاحت (جو تحریر کے شروع میں پیش کی گئی) مضحکہ خیز طور پر فضول ہے لیکن اس نے پھر بھی "کوئی دلیل" تو پیش کی۔

ملحد اس اصول سے استثناء چاہتے ہیں جس کے مطابق صرف دماغ کے ذریعے کوڈ اور زبانیں بن سکتی ہیں کیونکہ یہ قبول کرلینا کہ ڈی این اے کوڈ (زبان) کسی دماغ کے ذریعے وجود میں آئی، الحاد کے لیے تباہ کن ہے لیکن وہ اس استثنا کی کوئی معقول وجہ نہیں رکھتے۔

ڈی این اے کی زبان کا بغیر کسی ذہن یا سوچ کے وجود پالینے کا مفروضہ گھڑنے کی منطقی ضرورت آخر کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ یہ حقیقت ہے کہ ملحد کسی ابدی اور دائمی شعور کے وجود کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اگرچہ یہ علوم کائنات آسٹروفزکس (astrophysics) اور کونیات (cosmology) سے سب سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے (جیسا کہ ان تحاریر میں تفصیل پیش کی گئی: زمین کے کسی اتفاق کے طور پر پیدا ہو جانے کے کیا امکانات ہیں؟ اور "جدید طبیعیات الحاد کو کیوں مسترد کرتی ہے"؟)

یہ انکار منطقی ضرورت نہیں بلکہ انکی نظریاتی ضرورت ہے جیسا کہ اپنی تحریر میں میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ قابل ذکر اور مشہور ملحد ماہرین حیاتیات بھی جیسا کہ فرانسس کرک (Francis Crick) جو کہ DNA Double Helix کی دریافت کی وجہ سے مشہور ہیں اور رچرڈ ڈاکن ((God Delusion کے مصنف بھی بہت اچھی طرح یہ بات سمجھتے ہیں کہ بے جان سے جاندار کا وجود کسی ذہن کی کاروائی ہے۔ اس لیے وہ مختلف توجیہات کرنے پر مجبور ہیں اس مضمون میں اس پر تفصیل موجود ہے کہ

کس طرح کرک (Crick) نے اپنی کتاب "Life Itself" میں اس مفروضے یعنی "Directed Panspennia" کی تصدیق کی ہے جس کے مطابق زندگی خلائی مخلوق (Aliens) نے بنائی اور اپنی اُڑن طشتری میں زندگی کو زمین پر لے آئے۔" اور ایک وڈیو میں رچرڈ ڈاکن بھی اسی نظریے کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں، دیکھنے کے لیے یہاں کلک کریں۔

کیا آپ زندگی کی ابتداء کی وضاحت کے لیے خلائی مخلوق کا اُڑن طشتری میں زندگی کو زمین پر لے کر آنے والے نظریے سے متفق نہیں؟ پریشان مت ہوں۔ الحاد دوسری وضاحتیں بھی دیتا ہے جیسا کہ Piggyback side on crystals؟ عجیب لگتا ہے؟ مایہ ناز ملحد مائیکل روس (Michael Ruse) اپنے ایک انٹرویو میں اس مفروضے کو بیان کر رہے ہیں۔ وڈیو دیکھنے کے لیے یہاں کلک کریں۔

مایہ ناز ملحد نظریاتی ماہر حیاتیات (theoratical biologist) سٹوارٹ کاؤفمین (Stuart Kaufmann) بے جان سے جاندار کی تخلیق کو حرارتی مرکبات کے چوتھے فرضی قانون (fourth law of thermodynamics) کا نتیجہ گردانتا ہے (ابھی تک حرارتی مرکبات کے صرف تین قوانین موجود ہیں) لیکن ہم دیکھیں گے کہ یہ مفروضہ بھی ایک نہایت خاص قسم کی چھوٹ کا تقاضہ کرتا ہے۔ ولیم ڈیمبسکی نے اپنی کتاب No free lunch... Why specified complexity can not be purchased without intelligence میں کاؤفمین کے مفروضے کا جواب دیا ہے۔

"۔ان مجوزہ (قوانین) سے کاؤفمین کے اخذ کردہ نتائج سے جو چیز بڑی آسانی سے واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ قوانین اپنی ساخت یعنی شکل اور کردار کے لحاظ سے روایتی تینوں قوانین برائے حرارتی مرکبات سے بہت مختلف ہیں۔ روایتی قوانین برائے حرارتی مرکبات مخصوص بات بیان کرتے ہیں، یعنی یہ صرف اس چیز کا تعین کرتے ہیں کہ ایک طبیعیاتی عمل (physical system) میں کیا نہیں ہو سکتا۔ پہلا قانون برائے حرارتی مرکبات بتاتا ہے کہ ایک آئسولیٹڈ سسٹم میں مکمل توانائی نہ بڑھتی ہے اور نہ کم ہوتی ہے۔ دوسرے قانون کے مطابق آئسولیٹڈ سسٹم کی انقطاعِ توانائی (Entropy) کم نہیں ہو سکتی۔ تیسرے قانون کے مطابق چند محدود کاروائیوں سے آئسولیٹڈ سسٹم کا درجۂ حرارت بالکل صفر تک نہیں لے جایا جاسکتا۔ کاؤفمین نے جو قوانین جواز کے طور پر پیش کیے ہیں وہ بالکل بھی اس طرح نہیں ہیں۔ بلکہ یہ فطرت میں پیچیدگی کے ظہور کی کیفیتی وضاحت فراہم کرتے ہیں، تاہم کوئی ایسا میکانیزم / تکنیکی پہلو نہیں بتاتے جو کہ اس پیچیدگی کے ظہور کی وضاحت کیلئے کافی ہو"۔

قدرتی قوانین [Natural Laws] ایک کھیل جیسا کہ فٹ بال کے قوانین کی طرح ہوتے ہیں۔ قوانین اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ کھیل میں کن چیزوں کی اجازت ہے لیکن وہ کسی چیز کے واقع ہونے کی وجہ نہیں بنتے (جیسا کہ گول ہو جانے کی۔ اس کے لیے ذہن اور شعوری حرکت کی ضرورت ہے)۔ ڈیمبسکی (Dembski) نے بہت آسان اور سادہ زبان میں یہ بات سمجھائی ہے۔ قدرتی قوانین جیسا کہ حرارتی مرکبات کے تینوں قوانین کسی چیز کے پیدا ہونے کی وجہ نہیں بنتے یا کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے، بلکہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ کیا ممکن ہے بالکل ویسے ہی جیسے شطرنج کے اصول بتاتے ہیں کہ کون کون سی چالیں چلی جاسکتی ہیں۔ یہ نکتہ مین ہیٹن پروجیکٹ کے سابقہ ماہر فزکس اور نامور انفارمیشن سائنٹسٹ ہبرٹ یوکی

) Hubert Yockey)نے اپنی کتاب بعنوان " Information theory, Evolution and origin of life"میں اٹھایا ہے:

"طبیعیات اور کیمیا کے قوانین بالکل فٹ بال کے اصولوں کی طرح ہیں۔ ریفری اس چیز کو دیکھتے ہیں کہ ان اصولوں پر عمل کیا جارہا ہے لیکن یہ اصول جیتنے والے کے متعلق کچھ نہیں بتاتے۔ کھیل کے اصولوں میں اتنی معلومات نہیں ہوتیں کہ وہ اس بات کی پیشن گوئی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کھیل کھیلتے ہیں۔ ماہر ریاضی کائٹن(Chaitin)فزکس کے قوانین کی پروگرامنگ کرکے اس کو چیک کیا،اسے یہ نظر آیا کہ ان کا معلوماتی مواد حیران کن حد تک کم ہے"۔

قصہ مختصر کاؤفمین (Kaufman)کا حرارتی مرکبات کا چوتھا فرضی قانون اس اصل اصول سے خصوصی استثناء چاہتا ہے کہ فطری قوانین اپنے سے کچھ تخلیق نہیں کرتے بلکہ صرف یہ بیان کرتے ہیں کہ کیا ممکن ہے۔ یہ فرض کرنا کہ کوئی قدرتی قانون کسی چیز کے بننے کا سبب بن سکتا ہے(وہ چیز کسی زبان یا کوڈ کی تخلیق سے بھی کم تر ہو) یہ واقعی ایک خاص قسم کی رعایت اور چھوٹ ہے۔ یہ مفروضہ کہ حرارتی مرکبات کا چوتھا فرضی قانون یا کوئی اور قانون بے جان سے جاندار پیدا کر سکتا ہے اتنا ہی احمقانہ ہے جتنا کہ یہ خیال کہ ریاضی کے قوانین رقوم کے بینک اکاؤنٹ میں نظر آنے کا بھی سبب بن سکتے ہیں۔ ویونہ رائڈر (Wiona Ryder)کی چوری کے جواز کے طور پر پیش کی جانے والی دلیل بھی کسی قدر مناسب معلوم ہوتی ہے جب اس کا تقابل کاؤفمین (Kaufmann)کی اس دلیل کو درکار خاص رعایت سے کیا جائے۔

ڈین کینیون(Dean Kenyon) دنیا میں کیمیائی ارتقاء کے مایہ ناز سکالروں میں سے ایک اور زندگی کی ابتداء کو بیان کرنے کے لیے کیمیائی ارتقا پر مشتمل زیادہ فروخت ہونے والے متن کے مصنف بھی ہیں۔ ان واضح ثبوتوں کی بڑی تعداد نے آخر کار کینیون کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس نیچری نظریہ کو ترک کر دیں اور خدا کی موجودگی کو تسلیم کر لیں۔ ویڈیو دیکھیے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی(Oxford University) کے فلسفی اینٹنی فلو(Antony Flew) جنہیں فلسفیانہ سطح پر الحاد کے نظریاتی محاذ کا ہر اول سپاہی قرار دیا جا سکتا تھا، انکا پیپر Theology and Falsification اپنے وقت میں دنیا میں فلسفے کا سب سے زیادہ بار بار پرنٹ ہونے والا کتابچہ تھا۔ لیکن جیسا کہ اس وڈیو میں دیکھا جا سکتا ہے، علمِ حیاتیات کے حقائق نے فلو(Flew) کو 2004ء میں اپنے ذہن کو بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس بارے میں مزید جاننے کے لیے دیکھیے فلو(Flew) کی کتاب "There is a God: How the World's Most Notorius Atheist Changed His Mind"۔

تحریر سکاٹ ینگرین، ترجمہ عمار صابر چیمہ

Robert پرائز یافتہ Heinemann کے شعبے میں mathematical physics Griffiths کہتے ہیں: ''جب بھی ہم کسی ملحد اور دہریے سے بحث میں مشغول ہوتے ہیں، ہمیں فلسفے کے شعبے میں جانا پڑتا ہے۔ اس کُشتی کے لیے ابھی تک فزکس کے اکھاڑے کو موثر انداز سے استعمال نہیں کیا گیا۔'' (ٹی۔ ایچ۔ کی کا ایک قول جس کا اردو ترجمہ ہر گز لطف نہ دے گا، درج ذیل ہے) "What ! is mind? Never matter. What is matter? Never mind" (T.H. Key)

بظاہر ہم سب ہی اس پہیلی سے واقف ہیں کہ ''انڈہ پہلے تھا یا مرغی؟''۔ لیکن بہت کم لوگ اس بات سے آگاہ ہیں کہ خدا کے وجود کا سوال ایک حقیقی مسئلہ ہے جو مرغی اور انڈے کی اس پہیلی کو ایک سنجیدہ علمی مشاکلے میں ڈھال دیتا ہے۔ شعور (Mind) پہلے تھا یا مادہ (Matter)؟ بالفاظِ دیگر شعور مادے کی پیداوار ہے یا مادے نے شعور سے جنم لیا ہے۔ ہماری یہ کائنات اپنی حقیقت میں مادی ہے یا غیر مادی اور شعوری ہے۔ یہ بات بہت سے لوگوں کے لیے حیرت کا باعث ہو گی کہ جدید فزکس نے بھی اس بات کا جواب دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جدید فزکس اس سوال کا جو جواب دیتی ہے وہ عوام کی اکثریت کو اس بات پر مجبور کر دے گی کہ وہ کائنات کے بارے میں اپنے ادراک کی نفی کریں اور اسے از سرِ نو تشکیل

دیں۔ سٹیفن سی میئر (اس نے کیمبرج یونیورسٹی سے History اور Philosophy Of Science میں ڈاکٹریٹ کرر کھی ہے)اپنی کتاب" Signature in the Cell " میں لکھتے ہیں: "قدیم یونانیوں کے دور سے ہی مغربی مفکرین کے ذہن میں "حقیقتِ کلی" کی دو تصاویر ہیں۔اس (حقیقت)کو جرمن میں" Weltanschauung"یا"کلی نظریہ" (Worldview) بھی کہتے ہیں۔ایک ورلڈ ویو کے مطابق شعور ہی حقیقتِ کلی ہے.اس نظریے کے مطابق یاتو مادے کا صدور پہلے سے موجود شعور(Mind) سے ہوا ہے یا پیشگی قائم "عقلِ کلی" (Intellect) نے اس کی تشکیل کی ہے۔حقیقت کا یہ تصور "مثالیت" (Idealism) کہلاتا ہے یعنی عالمِ امثال پہلے ہے اور مادہ (Matter) بعد میں ہے۔ نظریہ مثالیت مذہب اور خدا پرستی کی نظریاتی اساس ہے کہ خدا اس عالمِ امثال کا خالق یا اس کی علت (source) ہے، جس سے باقی تمام عوالم اور مادی کائنات کی تشکیل ہوئی ہے۔ دوسرے ورلڈ ویو کی پوزیشن یہ ہے کہ مادی کائنات اور ظاہری فطرت "ہی حقیقتِ کلی ہے۔اس نظریے کے مطابق ہر شے کا صدور مادے(Matter) یا توانائی(Energy) سے ہوا ہے۔یہ ازلی ہے اور اس کا خود سے موجود ہونا وجوب کی حیثیت رکھتا ہے۔اسے نہ کسی علت(Source) کی حاجت ہے اور نہ کسی ایسے مصدر کی، جس نے اس کی تشکیل کی ہو۔اس ورلڈ ویو کی رُو سے مادہ شعور پر وجودی و مکانی تقدم رکھتا ہے اور شعور مادی تعاملات اور اس کے بالواسطہ ارتقائی تغیرات کی پیداوار ہے۔یہ ورلڈ ویو فطرت پرستی(Naturalism) یا مادیت پرستی(Materialism) کہلاتا ہے۔

ان دو نظریاتِ کلی کے علاوہ اور کوئی تیسرا موقف موجود نہیں۔ہم میں سے ہر ایک کو اس مبحث میں شامل ہونے کیلئے ان میں سے کسی ایک پوزیشن کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔"میکس پلانک (Max Planck :

نوبل انعام یافتہ ماہرِ فزکس جس نے کوانٹم فزکس کی بنیاد رکھی) کہتے ہیں: "ایک ایسے شخص کے طور پر کہ جس نے سائنسی اصولوں کی روشنی میں بیدار مغزی اور روشن دماغی سے مادے (matter) کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے میں اپنی پوری زندگی وقف کر دی، میں ایٹمز (Atoms) سے متعلق اپنی تحقیق کا نچوڑ ان جملوں میں بیان کر سکتا ہوں کہ دراصل مادہ (Matter) اپنا کوئی ذاتی وجود نہیں رکھتا (مادہ وجود بالذات ہر گز نہیں)۔ یہ دراصل اس قوت (force) سے جنم لیتا ہے اور تشکیل پاتا ہے، جو ایک ایٹم کے ذرات (Particles of Atom) کو تحرک بخشتی ہے اور اس ننھے ترین نظامِ شمسی یعنی ایٹم کی بقا کا سامان کرتی ہے۔ اس قوت (force) کے پیچھے ہم ایک اعلیٰ ترین شعور یا عقلِ کلی کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ یہ شعور (Mind) ہی دراصل اس مایا جال کا رحمِ مادر (Matrix of all matter) ہے۔

"البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein : بیسویں صدی کا سب سے بڑا ماہرِ فزکس جسے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا سائنسدان کہا جائے تو غلط نہ ہو گا) یوں رقم طراز ہوتے ہیں: "ہر وہ انسان جو سائنس کے میدان کا باقاعدہ اور ماہر کھلاڑی ہے، اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس کائنات کے تمام قوانینِ فطرت میں ایک اعلیٰ ترین قوت کارفرما ہے۔ ایک ایسی برتر طاقت جو انسان پر اپنا مکمل تسلط رکھتی ہے اور جس کے سامنے انسان اور اس کی تمام معمولی قوتیں ہیچ ہیں۔

"نوبل انعام یافتہ ماہرِ فزکس Eugene Wigner کہتے ہیں: "Quantum Mechanics کی تخلیق کے بعد سے، جب Physical Theory کی حدود Microscopic Phenomena تک وسیع ہو گئیں، شعور Consciousness کا تصور دوبارہ سے وجود کی بحثوں میں در آیا ہے۔ شعور (Consciousness) کے حوالے کے بغیر Quantum

Mechanics کے اصول و قوانین کو متواتر اور بلا تضاد انداز میں وضع کرنا بالکل ناممکن ہے ...... اور شعورِ کلی اپنی تمام تفصیلات اور پھیلاؤ میں ایک بدیہی حقیقت ہے۔"

سر آرتھر ایڈنگٹن(Sir Arthur Eddington : جو ایک عظیم ماہرِ فزکس ہیں) یوں رقم طراز ہیں: "میری رائے میں ایک اعلی ترین شعور(Universal Mind or Logos) کا تصور سائنسی نظریے(Scientific Theory) سے ایک قرینِ قیاس استنباط ہے۔"(Logos) کی" کلمۃ اللہ یا اسم اللہ " کے طور پر تعریف کی جاتی ہے۔ اسے حکمِ الٰہی اور تخلیقی ترتیب و تسلسل کا بنیادی اصول مانا جاتا ہے۔

)سر جیمز جینز(Sir James Jeans : ایک عظیم ریاضی دان، ماہرِ فزکس و ماہرِ فلکیات) اپنی کتاب " The Mysterious Universe " میں لکھتے ہیں: "طبیعاتی سائنس کے ماہرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ سائنسی علوم کا دھارا اب غیر میکانکی حقائق کی جانب بہہ رہا ہے۔ یہ کائنات اب کسی "عظیم مشین" کی بجائے کسی اعلیٰ ترین شعور کا ایک "بڑا خیال" محسوس ہوتی ہے۔ "مادے" کی سلطنت میں "شعور" کو اب ایک حادثاتی درانداز کے طور پر نہیں دیکھا جاتا۔ ہم اب اس جانب دھیان دے رہے ہیں کہ ہمیں مادے کی علت و حاکم کے طور پر "شعور" کو خوش آمدید کہنا چاہیے۔" اب اس بات میں شک کا کوئی امکان نہیں ہے کہ "مادے" یا "شعور" کی حاکمیت کی بحث میں جدید فزکس کس گروہ کی حامی ہے۔

جدید فزکس اب مادیت پرستی کو مکمل طور پر مسترد کر چکی ہے۔

Johns Hopkins University کے ماہرِ فزکس Conn Henry Richard اپنی تحریر" Mental Universe " میں لکھتے ہیں: "آئزک نیوٹن یہ بات وثوق سے کہتے ہیں کہ اجسام اپنی ایک مکمل, مطلق اور آزاد حقیقت رکھتے ہیں جو ان کے اندر ہی موجود ہے۔" مادی اشیاء اپنے اندر اپنی کوئی مکمل، مطلق اور آزاد حقیقت نہیں رکھتے کیونکہ جدید فزکس کے مطابق مادہ "شعور" کے وجودی تسلط سے دستبردار ہو کر اپنی کوئی شناخت نہیں رکھتا۔ ایسی کوئی حقیقت وجود نہیں رکھتی جو اعلیٰ ترین شعور کی دست نگر نہ ہو۔

University of California سے تعلق رکھنے والے Berkeley physicist ھنری سٹیپ اپنی کتاب" Mindful Universe " میں لکھتے ہیں: "عصرِ حاضر کا مروجہ اور بنیادی طبیعاتی نظریہ (Physical Theory) شعور کے فلسفے (Philosophy Of Mind) میں پائے جانے والے دعاوی کے برعکس ان نتائج تک پہنچتا ہے کہ کہ طبیعاتی سائنس کی بڑھوتری کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے۔ لہذا شعور و عقل جیسے موضوعات پر طبیعاتی ڈسکورسز کی تمام تر تحقیق ان موضوعات کا مکمل احاطہ نہیں کرتی اور نہ ہی عقل و شعور کی تمام حرکیات کو سمجھنے اور بیان کرنے کی ذمہ داری اٹھاتی ہے۔" مختصراً یہ کہ کلاسیکل Quantum Mechanics کے برخلاف مروجہ Quantum Physics . کسی ایسی مادی دنیا کا تصور بھی نہیں کرتی جو انسانی تجربات اور شعور سے الگ تھلگ رہ کر اپنی کوئی ذاتی شناخت رکھتی ہو

Princeton University کے quantum physics کے ایک ماہر Freeman Dyson ھنری سٹیپ کے ان دلائل کی کچھ یوں وضاحت کرتے ہیں: "ایٹمز (Atoms) اپنی

فطرت میں عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ یہ ایک جامد مواد (Inert Substance) کی بجائے ایک فعال کارگزار (active agent) کی طرح کام کرتے ہیں۔ Quantum Mechanics کے قوانین کے مطابق یہ متبادل ممکنات میں غیر متوقع انتخاب کرتے ہیں۔ یہ بھی شعور کی مانند خِلقی طور پر انتخاب کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ کائنات (Universe) بھی ایک معمہ ہے۔ اس کے قوانینِ فطرت (Laws Of Nature) شعور کے پودے کی بڑھوتری کے لیے زمین زرخیز کرتے ہیں۔ مجھے خدا اور ایک اعلیٰ ترین شعور کی حامل علیم و خبیر ہستی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ جب شعور کا تصور ہمارے فہم و ادراک کی سرحد سے باہر نکل جائے تو ایک خدائی حقیقت میں ڈھل جاتا ہے۔"

ماہرِ فزکس George Stanciu اور فلسفی Robert Augros اپنی کتاب "The New Story Of Science" میں اس بات کی جامع وضاحت کرتے ہیں کہ مادیت پرستوں اور فطرت پرستوں کا ورلڈ ویو کیوں اب سائنسی اور فلسفیانہ حمایت و توثیق سے محروم ہے۔ ان کی یہ وضاحت مندرجہ بالا نکات کا ابہام دور کر کے انہیں قابلِ فہم بنا دیتی ہے۔ یہ لکھتے ہیں: "سائنس کی نئی کہانی میں یہ پوری کائنات بشمول مادہ (Matter)، توانائی (Energy)، زمان و مکان (Time and Space) محض ایک زمانی واقعہ (One-Time Event) ہے اور اس کا ایک معین آغاز ہے جب یہ پیدا ہوئی۔ کوئی وجود تو ایسا ہے جسے ازلی و ابدی (واجب الوجود) ہونا چاہیے، کیونکہ اگر کوئی وجودِ مطلق نہ ہوتا تو کسی بھی وجود کا موجود ہونا بعید از قیاس تھا، یعنی یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ ظواہر اور مظاہر بغیر کسی علت کے وجود میں آجائیں۔ یہ مادی کائنات ازلی نہیں کیونکہ مادے کی تخلیق و ظہور کی بھی ایک زمانی و مکانی شروعات ہے۔ مادہ زیادہ سے زیادہ 12 ارب سے 20 ارب سال پرانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے جو

ہستی ازلی ہے وہ ہرگز مادی نہیں اور مادہ اس عظیم علت کا معلول ہے۔ وہ غیر مادی ہستی اعلیٰ ترین درجے کے شعور کی حامل ہے اور اعلی ترین شعور رکھنے والی ہستی ہی مادے کی خالق ہے۔ یہ تمام تحقیق ایک العلیم الخبیر اور الحیی والقیوم ہستی کے وجود کی جانب اشارہ کرتی ہے اور یہی وہ قادرِ مطلق ہستی ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں۔ "

ان تمام آراء کے باوجود مادیت پرستی ابھی بھی چند علمی ڈسکورس کا ایک جزوِلا نیفک ہے، اس کی کچھ نظریاتی وجوہات ہیں:

مادیت پرستی کو جدید فزکس نے رد کر دیا ہے، جبکہ بائیولوجی کے اصول و مبادی ابھی بھی مادیت پرستی و فطرت پرستی کو ایک meta-narrative یا meta rationale کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فزکس سائنس کی وہ شاخ ہے جو سائنس کو فلسفہ اور مذہب سے جدا کرنے والی سرحد سے قریب ترین ہے۔ یہ بائیولوجی کے مقابلے میں ڈسکورسز کے اس بارڈر کے زیادہ نزدیک ہے۔ باالفاظِ دیگر فزکس سائنس کی وہ شاخ ہے جو کائنات کی حقیقت اور وحدت کی ایک بڑی اور بنیادی ترین تصویر پیش کرتی ہے۔ Yale University کے Harold J. Morowitz نامی biophysicist اپنے ایک مقالے " Rediscovering the Mind " اس موضوع پر جدید فزکس اور mainstream بائیولوجی کے بنیادی اختلافات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امرِ واقع یہ ہے کہ وہ بائیولوجسٹ جو کبھی فطرت کے تنظیمی ڈھانچے میں شعور کا ایک استحقاقی کردار تسلیم کرتے تھے، اب کٹھورپن کے ساتھ تیزی سے اس انداز سے مادیت پرستی کے دلدادہ ہوتے ہیں جارہے ہیں جو کبھی انیسویں صدی عیسوی کے ماہرینِ فزکس کی روش تھی۔ اسی اثنا میں، موجودہ ماہرینِ فزکس تجرباتی ثبوتوں (Experimental Evidence) کی روشنی میں یہ بات تسلیم کرنے کی جانب تیزی سے مائل ہیں کہ کائنات کو بیان کرنے والے mechanical models کی بنسبت مادی و طبیعی وقوعات میں ایک ''اعلیٰ ترین شعور'' کا ہونا زیادہ اہم اور کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فزکس اور بائیولوجی دو ایسی برق رفتار ریل گاڑیاں بن چکی ہیں جو تیزی سے ایک دوسرے کی مخالف سمت میں دوڑ رہی ہیں اور انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ ان کی اپنی پٹری کے آر پار کیا چل رہا ہے۔'' ملحد ماہرینِ حیاتیات (Atheist Biologists) مادیت پرستی/فطرت پرستی کے نظریات سے چمٹے ہوئے ہیں جبکہ جدید فزکس بھرپور انداز سے اس کارد کرتی ہے۔

ماہرِ فزکس Richard Conn Henry اس بات کی کچھ یوں وضاحت کرتے ہیں: ''لوگ اس کائنات کی حقیقت کے کسی ایسے تصور پر کیوں جمے ہوئے ہیں جو کسی برتر اعلیٰ ترین شعور سے بے نیاز ہے؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اگر حقیقت کا ایسا تصور موجود نہیں ہوگا تو لازماً کسی اعلیٰ ترین شعور کا ہونا لازم آئے گا۔ اگر شعور (mind) مادے (matter) کی تخلیق نہیں ہے، بلکہ مادی حقیقت کے فریبِ نظر کا خالق ہے (جیسا کہ امرِ واقع یہی ہے اور 1925 میں کوانٹم فزکس کی دریافت کے بعد سے مادیت پرستوں پر یہ بات آشکارا ہے) تو خدا پرستی (Theism) ہی وہ شارحِ واحد sole definer بن

جائے گا جو اس دنیا میں ہمارے وجود کی عقلی تاویل کرے اور نظریہ انا پرستی(solipsism : یہ تصور کہ وجود بس وہی ہے جو حسی طور پر معلوم ہے) یتیم ہو جائے گا۔

"فطرت پرستی/مادیت پرستی محض ایک ملحدانہ ورلڈ ویو کی تشکیل ہی کر سکتا ہے۔ الحاد کے قیام و دوام کے لیے اس بات کا اثبات ضروری ہے کہ شعور ایک بے شعور مادے کی تخلیق ہے۔ اس لیے ایک ملحد کو جدید فزکس سے پیدا ہونے والی اس بصیرت (مادہ شعور کا معلول ہے اور شعور مادے کی علت ہے) کو نظرانداز کرنا چاہیے اور اس سے انجان بنے رہنا چاہیے تاکہ وہ اپنے ایمانی و ایقانی نظام یعنی الحاد و دہریت کو دلائل کے میدان میں شکست و ریخت کے عمل سے بچا سکے۔ اور چونکہ مادیت پرستی/ظواہر پرستی بائیولوجی اور دیگر ڈسکورسز سے تعلق رکھنے والے ملحدوں کی جزیراتی دنیا میں ایک غالب سماجی سیاق و سباق ہے، چنانچہ اس کے بچاؤ کے لیے جدید فزکس سے اجتماعی طور پر تجاہلِ عارفانہ برتا گیا ہے۔ جیسا کہ Oxford University اور University of Massachusetts کے بائیولوجی کے پروفیسر Lynn Margulis (انہیں سائنس کے شعبے میں امریکہ کا صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا) اپنی کتاب" The Altenburg 16: An Expose of the Evolution Industry " میں لکھتے ہیں: "لوگ اور بالخصوص سائنسدان (اگر وہ بے روزگار نہ ہوں) تو کسی سچ یا حقیقت کے خیالی تصور کی بجائے اپنے نظریاتی قبیلے سے زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔ یہ ایک پیشہ ورانہ خودکشی ہو گی کہ لوگ اپنے اساتذہ اور سماجی رہنماؤں سے (meta principles میں) مستقل طور پر اختلاف کا تعلق رکھیں۔"

یہ کہنا سادہ لوحی ہے کہ ماہرینِ حیاتیات کی صفوں میں الحاد کی روایتی اور سماجی برتری ہی وہ بنیادی عنصر ہے جو بائیولوجی کے مرکزی دھارے کو فطرت پرستی پر ایمان لانے کے لیے آمادہ رکھتا ہے۔ ماہرینِ حیاتیات حیات کے مختلف مظاہر کی وضاحت کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ چنانچہ اگر ماہرینِ حیاتیات خدا کے وجود کا اثبات کریں گے تو انہیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مظاہرِ حیات کے کئی ایسے پہلو بھی ہیں جو سائنس کی اقلیم سے ماوراہیں۔ اس بات پر کسی کو حیرت زدہ نہیں ہونا چاہیے کہ ماہرینِ حیاتیات ایسے کسی بھی اثبات کو اپنے لیے ذلت ورسوائی سمجھتے ہیں۔ قارئین کے لیے یہ بات جاننا ناگزیر ہے کہ جو مندرجات ملحد ماہرینِ حیاتیات (atheist biologists) الحاد کے حق میں سائنسی دلائل ونتائج کے طور پر پیش کرتے ہیں، وہ دراصل الحاد کے وہ بُودے مفروضے ہیں جو فلسفیانہ بنیادوں پر تعمیر کیے گئے ہیں اور جو سائنسی تحقیقات (Scientific Inquiry) کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ کر، اسے اپنی چھلنی کے باون چھیدوں سے گزار کر اس کی صفائی کرتی ہے اور پھر توڑ مروڑ کر انہیں پیش کرتی ہے۔

Harvard University کے ماہرِ جینیات Richard C. Lewontin نے 1997ء نے سرِعام اس بات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا: ''سائنسی ادارے یا scientific methods ہمیں اس بات پر ہرگز مجبور نہیں کرتے کہ ہم مظاہرِ کائنات کی مادی تشریحات و توضیحات (Material Explanations) کو مِن وعن قبول کرلیں، لیکن ہم مادی علتوں کی ایک قیاسی و بنفسہ وابستگی کے ہاتھوں مجبورِ محض ہیں اور تحقیقات و تفتیشات اور تصورات و قوانین کا ایک ایسا نظام تشکیل دینے پر ہمہ وقت راضی ہیں جو مظاہرِ حیات کی مادی تشریحات کرے، چاہے یہ تشریحات انسانی بدیہات سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں اور ان کی پراسراریت کتنی ہی ہولناک کیوں نہ ہو۔ مادیت پرستی ہی اب حقیقت مطلق

ہے، کیونکہ ہم خدانامی کسی ہستی کو کائنات کے دروازے میں اپنا پاؤں پھنسانے کی اجازت نہیں دے سکتے.

مزید تفصیل

”(Werner Heisenberg جسے quantum mechanics کی تخلیق پر فزکس کے نوبل انعام سے نوازا گیا) نے خدا کے وجود پر فزکس اور بائیولوجی کی دو لختی کی بہترین انداز سے وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”نیچرل سائنسز کے گلاس کے مشروب کا پہلا گھونٹ تمہیں ملحد اور دہریہ بنادے گا۔ لیکن جب تم (یہ جام پیتے پیتے) اس گلاس کے پیندے تک پہنچو گے، تو خدا وہاں تمہارا منتظر ہو گا۔“ اس اصطلاح ”گلاس کے پیندے“ کو استعمال کرتے ہوئے Heisenberg حقیقتِ کائنات کے ان بنیادی ترین عناصر کی جانب اشارہ کر رہے ہیں جن پر فزکس تحقیق کرتی ہے۔

Kings College, London کے فلسفے کے ریٹائرڈ پروفیسر اور Council of the Royal Institute of Philosophy کے ممبر Keith Ward اپنی کتاب ”Is Religion Irrational ?“ میں لکھتے ہیں: ”مادیت پرست فلسفی کہتے ہیں کہ شعورِ کُلی مادے کی تخلیق ہے۔ لیکن افلاطون (Plato) اور مشرق و مغرب کے تمام عظیم کلاسیکل فلسفیوں کی رائے اس سے مختلف ہے۔ (ان کے مطابق) مادہ اپنے تمام تر ظواہر و مظاہر کے ساتھ ایک اعلیٰ ترین شعور کی تخلیق ہے۔ شعورِ کلی ایک حقیقت ہے اور اس میں تخلیقی قوت موجود ہے۔ یہ ہماری معلوم کائنات کی ضمنی پیداوار (by-product) نہیں ہے۔ اس کے بغیر ہماری پوری معلوم کائنات کا وجود ناممکن تھا۔

Quantum Physics کے ایک ماہر John von Neumann کہتے ہیں: ''تمام حقیقی اشیاء دراصل اجزائے شعور ہیں۔'' یہ بات مادیت پرستی کی روش سے کوسوں دور ہے اور یہ جدید فزکس کے موقف کی ترجمانی کرتی ہے، نہ کہ مذہب سے متاثر کوئی نظریہ پیش کرتی ہے۔''

ڈاکٹر عبدالسلام (جنہیں 1979ء میں electroweak theory پر ان کی تحقیق کے صلے میں فزکس کے شعبے میں نوبل انعام سے نوازا گیا) اپنی ایک مقالے '' Science and Religion '' میں لکھتے ہیں: '' احساسِ تحیر اور جستجو سائنسدانوں کی ایک بزرگ و برتر ہستی (Superior Being & der Alte) کی جانب رہنمائی کرتی ہے، جسے آئن سٹائن بڑی محبت سے '' خدا '' (Deity) کہتا ہے: ایک قادرِ مطلق، العلیم والخبیر اور تمام مخلوقات اور قوانینِ فطرت کا خالق ومالک۔'' مشہور ماہرِ فزکس اور ریاضی دان (James Clerk Maxwel جنہوں نے classical electromagnetic theory پیش کی اور جن کی سائنس کے لیے خدمات آئن سٹائن اور نیوٹن سے کسی طور کم نہیں) کہتے ہیں: ''میں نے تقریباً تمام فلسفیانہ نظاموں کو اچھی طرح کھنگالا ہے اور میں اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ خدا کے بغیر کسی شے وجود اور اس کی فعالیت ناممکن ہے۔'' ایک اور جگہ Maxwel لکھتے ہیں: ''مادے کے ازلی اور واجب الوجود ہونے کے دلائل فراہم کرنے میں ناکام ہے۔ ہم اپنی سائنسی فہم وذکاء کی آخری سرحد پر پہنچ کر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ مادہ مخلوق ہے کیونکہ اس کا ازلی و ابدی ہونا ناممکن ہے۔

'' Compton Effect کو دریافت کرنے والے نوبل انعام یافتہ ماہرِ فزکس Arthur Compton کہتے ہیں: ''میرے نزدیک ایمان اس ایقان وادراک سے جنم لیتا ہے کہ عظیم ترین خالق

نے اس کائنات کی تخلیق کی اور انسان کو پیدا کیا۔ میرے لیے اس بات پر ایمان لانا کوئی مشکل نہیں کیونکہ یہ ایک ناقابلِ تردید مسلمہ ہے کہ جہاں کوئی منصوبہ دکھائی دے گا، لازماً اس کا کوئی خالق اور منصوبہ ساز بھی ہو گا۔ خود کو آشکار کرتی یہ کائنات اس عظیم ترین کلمے کی سچائی کی شہادت دیتی ہے کہ خدا ہی ہر شے کا اول و آخر ہے۔"

نوبل انعام یافتہ ماہرِ فزکس (Max Born جنہوں نے Quantum Mechanics کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا) کہتے ہیں: "جو لوگ یہ کہتے ہیں سائنس انسان کو ملحد بناتی ہے، وہ اولین درجے کے بیوقوف ہیں۔" ایک اور جگہ پر وہ لکھتے ہیں: "جو عقیدہ بھی خدا کے بنائے ہوئے قانونِ فطرت کو رد کرتا ہے، میرے نزدیک وہ ناقابلِ قبول ہے، کیونکہ یہ خدا کا ایک ایسا شکستہ تصور قائم کرتا ہے، جو اس کے اصل مرتبے سے کم تر ہے۔ جب خدا کہتا ہے کہ سب کچھ اس کہ دستِ قدرت میں ہے اور وہ اپنے قوانین کے ذریعے اس کائنات کا نظام چلا رہا ہے تو یقیناً ایسا ہی ہے۔ لیکن خدا اپنے بنائے ہوئے نظام کے ہاتھوں مجبور نہیں۔ انسان اپنے بنائے ہوئے نظام میں مقید ہو سکتا ہے، خدا نہیں۔

" (Lord William Kelvin جن کا thermodynamics میں تحقیقی کام Absolute Zero اور the Kelvin temperature scale کی تشکیل کی بنیاد بنا) کہتے ہیں: "جتنا سائنس کو مکمل طور پر (اس کی اپنی شرائط کے مطابق) پڑھا جائے گا، اتنا ہی یہ انسان کو الحاد اور دہریت سے دور لے جائے گی۔"

نوبل انعام یافتہ ماہرِ فزکس (Max Planck جنہوں نے Quantum Mechanics کی بنیاد رکھی اور تاریخِ انسانی کے اہم ترین ماہرینِ فزکس میں سے ایک ہیں) اپنے 1937ء کے ایک لیکچر " Religion and Natural Science " میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں: "مذہب اور سائنس دونوں کو خدا پر ایمان کی ضرورت ہے۔ مذہبی آدمی کے نزدیک خدا ازلی ہے اور ہر شے کا اول ہے، جبکہ ماہرینِ فزکس کے نزدیک خدا ابدی ہے اور ہر شے کا آخر ہے۔ اول الذکر کے نزدیک خدا ہر شے کا خالق اور اس کی بنیاد ہے اور موخر الذکر کے مطابق خدا کائنات کے بارے میں ہر generalized ورلڈ ویو کی عمارت کا تاج ہے۔" ایک جگہ لکھتے ہیں: "مذہب اور سائنس کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف موجود نہیں، کیونکہ یہ اک دوجے کا تکملہ ہیں۔۔۔۔۔۔۔ایک اعلیٰ ترین شعور ہی اصل "عرض" ہے اور یہ تمام مادے کا جوہر ہے۔ ہم اسے پسِ پشت نہیں ڈال سکتے۔ ہر وہ چیز جو ہمارا موضوعِ سخن ہے یا جو موجود ہے، اس کا صدور ایک اعلیٰ ترین شعور سے ہوا ہے۔"

نوبل انعام یافتہ ماہرِ فزکس (Paul A. M. Dirac جنہوں نے quantum mechanics اور quantum electrodynamics کی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں اہم کردار ادا کیا) رقم طراز ہوتے ہیں: "خدا ایک عظیم نظام کو چلانے والا ایک عظیم ترین ریاضی دان ہے اور اس نے اس کائنات کو ایک اعلیٰ درجے کی ریاضی سے تخلیق کیا۔"

" (Werner Heisenberg جنہیں Quantum Mechanics کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے پر 1932ء میں فزکس کے شعبے میں نوبل انعام سے نوازا گیا، جدید سائنس میں ان کا کام تا حال بہت اہم اور relevant ہے) لکھتے ہیں: "جب سے گلیلیو پر چرچ کی جانب سے مقدمہ چلایا گیا اور

اسے سزا دی گئی، تب سے سائنس کی تاریخ میں یہ بات بکثرت دہرائی جاتی ہے کہ کائنات کے بارے میں مذہبی اور سائنسی تعبیریں اور توضیحات باہم متصادم ہیں اور ان کی تطبیق و مصالحت تقریباً ناممکن ہے۔ اگرچہ میں اس بات کا قائل ہو چکا ہوں کہ سائنسی سچائی اپنے دائرہ کار میں ناقابلِ تردید اور اٹل ہے، لیکن یہ مذہبی ڈسکورس کو انسانی شعور کی محض ایک متروک حالت کا خطاب دے کر اسے برطرف اور رد کرنے میں کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ یوں میں اپنی زندگی کے کئی دوراہوں پر اس بات پر مجبور ہوا کہ علم کی ان دونوں کائناتوں کے باہمی تعلق پر غور کروں، کیونکہ یہ دونوں Modes of Knowledge جس حقیقت (خدا) کی جانب اشارہ کرتے ہیں، میں اس کے وجود پر کبھی بھی شک کرنے کے قابل نہیں ہو سکا۔

"عظیم ماہرِ فزکس Sir Arthur Eddington اپنے شاہکار "The Nature of the Physical World " میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں: "ہم سب جانتے ہیں کہ انسانی روح کی کچھ ایسے گوشے ہیں جو فزکس کی دنیا سے ماورا ہیں۔ انسانی روح ہمارے ارد گرد مخلوقات کی پراسرار کیفیات، آرٹ کے اظہار اور حبِ الٰہی میں پروان چڑھتی ہے اور فطری طور اپنے اندر موجود تشنگی کی تسکین کرتی ہے۔ اس روحانی بالیدگی کی تصدیق خود ہمارے اندر ایک اندرونی جدوجہد کی صورت میں موجود ہے جو ہمارے شعور کے ساتھ جنم لیتی ہے یا وہ نورِ قلب جو کہیں زیادہ صاحبِ قدرت اور قادرِ مطلق ہستی سے ہم تک پہنچتا ہے۔ سائنس اس پر سوال نہیں اٹھا سکتی, کیونکہ سائنس کی اپنی جستجو کا چشمہ ایک ایسی کشمکش کے نتیجے میں پھوٹا ہے جو انسانی عقل کو اپنی تقلید کے سوا اور کوئی راستہ نہیں دیتی, ایک ایسی پیاس جسے بجھانے کے لیے انسانی عقل ناکافی ہے۔ یہ روشنی سائنس کی عقلی و عملی سرگرمیوں میں پنہاں ہو یا روح کے

ماورائے فہم و مشاہدہ تجربات میں جاری ہو، یہ ہمیں آگے کی جانب مائل کرتی ہے اور ہماری فطرت میں موجزن مقصدِ حیات کا یہ سفر اس روشنی میں جاری رہتا ہے۔

”Erwin Schroedinger کو atomic theory کی نئی productive forms دریافت کرنے کے صلے میں 1933ء میں فزکس کے شعبے میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ وہ اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں: ”سائنس ایک کھیل ہے ــــــ ایک ایسا کھیل جو (علم و شعور کے) تیز دھار چاقوؤں کی مدد سے اس کائنات کی حقیقت کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ اگر ایک شخص احتیاط سے ایک تصویر کو ہزار ٹکڑوں میں کاٹ دے، تو وہ ان ٹکڑوں کو باہم جوڑ کر اس تصویر کی شکل میں یہ puzzle حل کر سکتا ہے۔ یہ سب کرنے میں چاہے وہ کامیاب ہو یا ناکام، لیکن اس کی ذہانت و فطانت بہر حال اس کام میں صرف ہوتی ہے۔ کسی سائنسی مسئلے کی رونمائی کے عمل میں، دوسرا کھلاڑی اس کائنات کا خالق و مالک خدا ہے۔ اس نے نہ صرف ان مسئلوں کو انسان کے لیے مخصوص کیا ہے بلکہ اس کھیل کو کھیلنے کے کچھ اصول و ضوابط بھی وضع کیے ہیں ــــــ لیکن یہ قوانین ہم مکمل طور پر نہیں جانتے، کیونکہ ان میں سے نصف ایسے ہیں جنہیں ہمارے (انسان کے) لیے چھوڑا گیا ہے کہ ہم انہیں دریافت کریں یا اخذ کریں۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ کتنے قوانین خدا نے مستقل طور پر وضع کیے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جنہوں نے بظاہراً ہمارے دماغی جمود سے جنم لیا ہے, لیکن ان مسائل کا حل تب ہی ممکن ہے جب ہم اپنی عقل و خرد کی حدود و قیود سے آزاد ہوں گے۔ یہ بات اس کھیل میں دلچسپ ترین ہے۔“ ایک جگہ Erwin Schroedinger مزید لکھتے ہیں : ” مادی اصطلاحات میں شعور کا درست نا ممکن ہے۔ کیونکہ شعور بذاتِ خود ایک بنیادی کلِ

(Absolutely Fundamental)) ہے۔اور دیگر غیر متعلق اصطلاحات میں اس کی شرح نہیں ہو سکتی۔

"Harvard University کے نوبل انعام یافتہ ماہرِ حیاتیات George Wald نے biologists کی اس عام روش یعنی مادیت پرستی کو قبول کرنے کی نظریاتی وجوہات سے ہٹ کر اپنا موقف اپنایا ہے۔" "Life and Mind in the Universe کے عنوان پر ہونے والے ایک Quantum Biology Symposium میں خطاب کرتے ہوئے George Wald نے کہا: "مجھے بہت دیر سے اس بات کا ادراک ہوا کہ ان دونوں سوالوں (ماخذ شعور اور بے جان مادے سے زندگی کے نقطۂ آغاز) کی کسی نہ کسی درجے میں باہمی تطبیق کی جاسکتی تھی۔ یہ بات اس مفروضے سے منسلک ہے کہ شعور ارتقائے حیات کا شاخسانہ نہیں بلکہ ایک مایا جال (Matrix) کی شکل میں مادی حقیقت کے منبع اور شرطِ وجود کے طور پر پہلے سے موجود ہے۔(اس کا مطلب یہ ہے کہ) مادی حقائق اپنی ساخت میں شعوری ہیں (مادی نہیں) اور یہ شعور ہی ہے جس کے ذریعے اس روئے زمین پر حیات کی افزائش کرنے والی مادی کائنات کی تشکیل ہوئی ہے اور یوں ایک ایسی مخلوق (انسان) کا بھی ظہور ہوا جس نے سائنس، آرٹ اور ٹیکنالوجی کو تخلیق کیا ہے۔

" ماہرِ فزکس، ریاضی دان اور ماہرِ فلکیات Sir James Jeans کہتے ہیں: "زمان و مکان کی اصطلاحات میں تخلیقِ کائنات پر بحث کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کینوس کے کنارے کھڑے ہو کر مصور اور تصویر کشی کو دریافت کرنے کی کوشش رہا ہو۔ یہ بات ہمیں ان فلسفیانہ نظاموں کے قریب کرتی ہے جو اس

کائنات کو اس کے خالق کے اعلیٰ ترین شعور کا ایک خیال قرار دیتے ہیں اور یوں کائنات کی مادی تخلیق کے تمام مبحثوں کو مہمل بنادیتے ہیں۔"

Albert Einstein کہتے ہیں: "جتنا گہرائی میں سائنس کو پڑھتا گیا، اتنا میرا خدا پر ایمان بڑھتا گیا."۔ ... "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ خدا نے اس کائنات کو کیسے تخلیق کیا۔ مجھے عناصر کی روشنی میں مظاہر کی جانچ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میں (کائنات کو چلانے کے) خدا کے بنائے ہوئے قوانین جاننا چاہتا ہوں، باقی تمام تفصیلات جزوی اور ثانوی ہیں۔

"James Joule نے بقائے توانائی کے کلیے (Conservation Of Energy) کی بنیاد پر حرارتی مرکبات کا پہلا قانون (First Law Of Thermodynamics) پیش کیا۔ انہوں نے Kinetic Theory of Gasses کی تشکیل میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ کہتے ہیں: "یہ بات بالکل واضح ہے کہ قوانینِ فطرت سے واقفیت دراصل اس منشائے الہٰی اور ارادۂ خداوندی کی پہچان ہے جو ان قوانین میں جاری ہیں۔

"Srinivasa Ramanujam کو Archimedes اور Newton کے مساوی تاریخ کے عظیم ترین ریاضی دانوں میں سے ایک گردانا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے: "میرے نزدیک ایک تسویہ (equation) بے معنی ہے اگر وہ (قوانینِ فطرت میں جاری) کسی ارادۂ خداوندی کی جانب اشارہ نہ کرے۔

Kings College, London" کے فلسفے کے ریٹائرڈ پروفیسر اور Council of the Royal Institute of Philosophy کے ممبر Keith Ward اپنی کتاب " Doubting Dawkins, Why There Almost Certainly is A God" میں لکھتے ہیں: "کیا ایک اعلیٰ ترین شعور حقیقت کی ایک قطعی اور ناقابلِ تخفیف صورت ہے؟ کیا واقعی یہ حقیقت کی بنیادی خصوصیت ہے یا شعور بنیادی طور پر ارتقاء کے مادی عمل کی ایک غیر متوقع اور غیر ارادی پیداوار ہے؟"۔۔۔۔۔۔۔۔۔"اگر ہم فلسفے کی تاریخ پر نگاہ دوڑائیں تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جائے گی کہ تقریباً تمام بڑے کلاسیکل فلسفی اس بات پر قریباً ایک جیسی رائے رکھتے تھے۔ افلاطون (Plato)، ارسطو (Aristotle)، اینسلم (Anselm)، ایکوائنس (Aquinas)، ڈیکارٹ (Descartes)، لیبنیز (Leibniz)، اسپنوزا (Spinoza)، لاک (Locke)، برکلے (Berkeley)، کانٹ (Kant) اور ہیگل (Hegel) ان سب کے مطابق حقیقتِ مطلق مادی کائنات اور زمان و مکان کے ظواہر و مظاہر سے ماوراء ہے اور غیر مادی اور ورائے زمان و مکان ہے۔

"فلسفی John Locke جو تحریکِ تنویر (Enlightenment Project) کے ایک بہت اہم مفکر سمجھے جاتے ہیں، ان کا کہنا ہے: "یہ تصور کرنا ناممکن ہے کہ شعور و خیالات سے عاری مادہ ایک باشعور اور ذہین و فطین وجود کو پیدا کر سکے جیسا کہ کسی شے کا خود بخود پیدا ہو جانا بھی محال ہے۔

"Sir Isaac Newton، جنہیں تاریخ انسانی کا عظیم ترین سائنسدان مانا جاتا ہے، اپنی کتاب " Principia " (جسے اہم ترین سائنسی کام تسلیم کیا جاتا ہے) میں رقم طراز ہیں: "اندیکھی مابعد الطبیعات کی ضرورت ہمیشہ سے ہے اور ہر جگہ ہے، چاہے اس سے بہت سی علمی و عقلی موشگافیاں نہ

بھی سلجھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف مقامات پر رچے بسے فطرت کے ان تمام تنوعات کا صدور عدم سے ہوا ہو، لیکن یہ بات ایک لازمہ ہے کہ منشائے الہٰی اور ارادہِ خداوندی (اس سب کے پیچھے) اپنا وجود رکھتی ہے۔"

تحریر سکاٹ ینگرن، ترجمہ اسامہ مشتاق خان بشکریہ دانش ڈاٹ پی کے